

شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ چیئر

فیکلٹی آف آرٹس، یونیورسٹی آف سندھ، جامشورو

برگِ سبز یا قرطاسِ سیاہ

مرزا قلیچ بیگ

(سوانح حیات)

مترجم

شہناز شورو



شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ چیئر
فیکلٹی آف آرٹس، یونیورسٹی آف سندھ، جامشورو

برگِ سبز یا قرطاسِ سیاہ

مرزا قلیچ بیگ (سوانح حیات)

ترجمہ: شہباز شورو

نظرِ ثانی: محترم ڈاکٹر محمد علی صدیقی

ناشر: ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو
ڈائریکٹر، شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ چیئر،
فیکلٹی آف آرٹس، یونیورسٹی آف سندھ، جامشورو۔

مطبع: سوانی پرنٹرز، کھوکھر محلہ، ویسٹ کچہ، حیدرآباد، سندھ

سالِ اشاعت: 2009ء

قیمت: -/500 روپے

پیش لفظ

سوانح حیات، ادب میں اہم حیثیت کی حامل ہے، اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ، دنیا بھر میں سوانح حیات بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ علامہ آئی آئی قاضی نے فرمایا ہے کہ ہر شخص کو اپنی سوانح حیات لکھنی چاہیے، جس میں زندگی کے تمام زاویے، تجربات، حاصلات، پوری سچائی سے بیان کیے جائیں، جن سے پڑھنے والے نہ صرف سیکھیں گے اور رہنمائی پائیں گے بلکہ ادبی خزانے میں بھی اضافہ ہوگا۔

مرزا قلیچ بیگ، سندھی ادب میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، جنھوں نے سندھی ادب میں افسانوی ادب، مضمون نگاری، لسانیات اور تنقید و تحقیق اور تراجم کی بنیاد رکھی۔ آپ بیتی کے سلسلے میں بھی ان کا شمار بانی کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے اپنی آپ بیتی میں نہ صرف اپنی زندگی کے واقعات کو بیان کیا ہے، بلکہ انہوں نے سماج کے اہم زاویوں کی عکاسی بھی کی ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب سوانح حیات کے ساتھ ساتھ اس وقت کی سماجی تاریخ بھی ہے۔ مرزا صاحب کی سوانح حیات میں موجود واقعات بڑے دلچسپ، حیرت انگیز اور سبق آموز ہیں۔

مرزا صاحب اپنی ذاتی زندگی میں بہت مصروف تھے: ملازمت، دوستوں، عزیز و احباب اور اہلِ خانہ کو وقت دینے کے بعد مطالعہ اور لکھنا، وقت کی پابندی صحیح تقسیم ہی سے یہ سب کچھ ممکن تھا، انہوں نے اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ بڑی خوبی اور کمال مہارت سے

استعمال کیا۔ مرزا صاحب کے سوانح میں ہمارے لیے دوسرے تمام نصیحت آموز نکات کے ساتھ وقت کی پابندی نمایاں ترین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اس حیاتِ مختصر میں 457 کتابیں تصنیف اور تراجم کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

مرزا صاحب کی تمام ادبی و علمی خدمات کو سماج میں عام کرنے کے لیے، سندھ یونیورسٹی، جام شورو میں شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ چیئر، کا اہتمام کیا گیا ہے۔ جس کا مقصد مرزا صاحب کی تصانیف کی اشاعت، ادبی سیمینار اور کانفرنسیں وغیرہ منعقد کرنا، اسی مشن کو جاری و ساری رکھنا ہے۔ اس سلسلے میں یہ کتاب مرزا صاحب کے سوانحِ حیات 'سانوݨ سا کارو ہنو' کا اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے، جو ہماری گذارش کو قبول کرتے ہوئے محترمہ شہناز شورو صاحبہ نے کیا ہے، جبکہ نظرِ ثانی محترم ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے کی ہے۔

ترجمہ نگاری ایسا فن ہے جس کی وساطت سے ایک زبان کے علمی و ادبی سرمائے کو دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے۔ اگرچہ کسی خیال، تصور، جذبے یا احساس کو جوں کا توں یعنی اُسی اثر انگیزی کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل کرنا دشوار ہی نہیں ناممکن بھی ہے، تاہم اگر ترجمہ نگار کو ہر دو زبان پر عبور و دسترس حاصل ہو اور متعلقہ موضوع سے ذہنی و قلبی مناسبت بھی ہو تو ترجمے میں طبع زاد کا سا لطف پیدا ہوجاتا ہے۔ ترجمہ نگاری نے ہر زبان و ادب کے دامن کو کشادگی اور ثروت مندی عطا کی ہے۔

محترمہ شہناز شورو صاحبہ افسانہ نگاری کے حوالے سے اُردو ادبی حلقوں میں معروف ہیں۔ اُن کے نثر میں بے ساختگی اور انتخابِ الفاظ میں ندرت نمایاں ہے۔ ترجمہ نگاری کے میدان میں اگرچہ یہ اُن کا اوّلین قدم ہے مگر انھوں نے تخلیقی نثر کے تجربے کو کام میں لا کر اس پہلی کاوش ہی کو یادگار بنادیا ہے۔ یقیناً ایک صاحبِ فکر افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ آئندہ انھیں ایک صاحبِ طرز ترجمہ کار کے طور پر بھی یاد رکھا جائے گا۔

اس مرحلے پر ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا ذکر بھی لازم ہے کہ جنھوں نے وقتِ نظر سے مسودے کی نوک پلک سنوارنے کا کام انجام دیا۔ موصوف کا شمار اُردو کے اُن ترقی پسند نقادوں میں ہوتا ہے جن کے نام اور کام کا اعتراف اور احترام ہر حلقۂ ادب میں کیا جاتا ہے۔ اُن کی نظرِ ثانی سے اس ترجمے کی اہمیت و افادیت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ ہم محترمہ شورو صاحبہ اور ڈاکٹر صدیقی صاحب کے بے حد ممنون ہیں۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو
پروفیسر / ڈائریکٹر،
شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ چیئر،
سندھ یونیورسٹی، جام شورو۔

مرزا قلیچ بیگ کا انداز تحریر یکتا اور نرالا ہے۔ سندھی عوام کی تعلیم و ترقی کے لیے ان کی بے مثال خدمات سے کون واقف نہیں۔ مختلف موضوعات پر چار سو کے قریب کتابیں ان کی سندھی زبان و ثقافت اور ادب دوستی کی عظیم مثال ہیں۔

مرزا صاحب کی سوانح عمری کا ترجمہ کرنے کے دوران میری شعوری طور پر یہ کوشش رہی کہ مرزا صاحب کی سوانح سندھی ثقافت اور ماحول و معاشرت سے جڑی رہے۔ اُردو زبان چونکہ بہت سی زبانوں کا مرقع ہے لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ سندھی زبان کے رواں اور سہل الفاظ اس میں شامل ہو کر اس کی خوبصورتی نہ بڑھائیں۔

مرزا صاحب کی سندھی شاعری کو اُردو کے منظوم قالب میں ڈھالنا ایک مشکل امر تھا۔ اگر عروض کی سختی سے پابندی کی جاتی تو مفہوم و معنی اپنا رنگ کھو دیتے۔ ہو سکتا ہے کہ قارئین کو مرزا صاحب کی شاعری کے منظوم اُردو ترجمے میں ردیف، قافیہ، بحر و وزن کی خامیاں محسوس ہوں لیکن اگر نیرنگِ خیال ہمراہ ہے تو پڑھنے والے یقیناً محسوس کریں گے کہ مرزا صاحب کا لب و لہجہ اور سلاست و روانی بڑی حد تک اُردو ترجمے میں موجود ہیں۔

تنقید و تبصرے، بنانے اور سنوارنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ بس خیال رہے کہ خامیاں ڈھونڈنا آسان مگر انھیں درست کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اشجار زمین بوس کرنا بڑا سہل مگر شجر کاری اک عمر کا تقاضا ہوتی ہے۔ تخریب لمحوں میں مسمار کرتی ہے جبکہ تعمیر میں زمانے درکار ہوتے ہیں۔

مرزا قلیچ بیگ کی سوانح حیات کو اُردو زبان کے قالب میں ڈھالنا میرے لیے ایک اعزاز ہے میں ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو کی شکر گزار ہوں جنھیں نے مجھے مرزا قلیچ بیگ کی سندھی سوانح عمری کے اُردو ترجمے کے ذریعے سندھی زبان اور میری مادرِ علمی کی خدمت کا موقع دیا۔

اکبر لغاری کے تعاون اور ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی حوصلہ افزائی کے بغیر صرف دو ماہ کے مختصر عرصے میں اتنا اہم کام شاید ممکن نہ ہوتا۔ شکریہ واجب ہے حلیم باغی اور حاجی سائند کا جنھوں نے مرزا قلیچ بیگ کی سندھی شاعری کے منظوم اُردو ترجمے میں میری مدد کی۔

شہناز شورو

shahnaz_shoro@hotmail.com

کراچی

29، ستمبر 2009ء

میں نے مرزا قلیچ بیگ کی سوانح عمری کا کچھ عرصے پہلے سندھی میں مطالعہ کیا تھا۔ مرزا صاحب سندھی زبان کے کاموی ادیب ہیں۔ انھوں نے چار سو سے زائد کتابیں تصنیف کی ہیں جو یقینی طور پر ناقابلِ عبور ریکارڈ ہے۔

مرزا صاحب کی سوانح عمری کے اُردو ترجمے نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ اس ترجمے نے سندھی زبان کے مزاج اور مرزا صاحب کے اسلوب کو جس خوبصورتی کے ساتھ اُردو میں منتقل کیا ہے، قابلِ داد ہے۔ جب شہناز شورو صاحبہ نے اس ترجمے کی نظرثانی کے لیے مجھ سے درخواست کی تو مجھے حیرت ہوئی کہ شہناز شورو جیسی اُردو زبان پر کامل دسترس رکھنے والی افسانہ نگار نے نظرثانی کی ضرورت کیوں سمجھی۔ شاید وہ اپنے اس اہم کام میں مجھے کسی نہ کسی طور شامل کرنے کی اس بناء پر خواہش مند ہوں گی کہ وہ مجھے اپنے کامیاب ترجمے میں اعزازی طور پر شریک کر کے اپنی سعادت مندی کا مظاہرہ کریں۔

میں بلا تردد عرض کر رہا ہوں کہ میرا اس ترجمے میں کوئی حصہ نہیں البتہ میں نے پروف ریڈنگ ضرور کی ہے جس کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مسودہ اب بھی اغلاط سے پاک ہے۔

شہناز شورو نے مرزا صاحب کی شاعری کے ترجمے میں بحر اور وزن کی پابندی کے بجائے شاعری کے آہنگ کا کماحقہٗ خیال رکھا ہے۔ میرے خیال میں یہی ایک صورت ممکن تھی۔

شہناز شورو کا ترجمہ ہر لحاظ سے سندھی اور اُردو زبان کے لیے ایک قابلِ داد خدمت ہے جسے اُردو قارئین یقینی طور پر بہت پسند کریں گے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی
ڈین، فیکلٹی آف مینجمنٹ اینڈ سوشل سائنسز
انسٹیٹیوٹ آف بزنس اینڈ ٹیکنالوجی
کراچی

کراچی
29، ستمبر 2009ء

فہرست

تصاویر کی فہرست

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تمہید

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے تقریباً چار سال بعد، حکومتِ سندھ نے ۱۹۵۱ء میں سندھی زبان کی نشر و اشاعت اور ترقی و ترویج کے لیے سندھی ادبی بورڈ کی داغ بیل ڈالی۔ بارہ تیرہ سال کے قلیل عرصے میں سندھی ادبی بورڈ نے ایسی حیرت انگیز ترقی کی جو کہ گذشتہ سو سال کے اندر سندھ کے مختلف ادبی اداروں اور جماعتوں سے مجموعی طور پر ممکن نہیں ہو سکی۔ سندھی زبان کے پاکستانی و ہندوستانی شاعروں، ادیبوں اور باشعور طبقے نے سندھی ادبی بورڈ کی اس کارکردگی کو بار ہا سراہا ہے۔

بارہ تیرہ سال کے قلیل عرصے میں، سندھی ادبی بورڈ نے ڈیڑھ سو سے زائد منتخب اور معیاری کتب شایع کی ہیں جن کا تعلق سندھ کی تاریخ، ادب اور ثقافت سے ہے۔ یہ کتابیں مختلف زبانوں یعنی سندھی، اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں نہایت اعلیٰ اور خوبصورت طریقے سے شایع کی گئی ہیں۔

سندھی ادبی بورڈ کی شایع کردہ کتب میں سے کچھ کتابیں تو اس سے قبل کہیں بھی شایع نہیں ہوئی تھیں البتہ سندھ کے کچھ قدیم کتب خانوں میں خستہ حالت میں قلمی نسخوں کی صورت میں موجود تھیں۔ بورڈ نے پہلی بار یہ کتابیں نہایت خوش اسلوبی سے شایع کر کے عوام تک پہنچانے کا فخر و شرف حاصل کیا ہے۔

سندھی ادبی بورڈ کی شایع شدہ کتابوں کی دوسری قسم وہ قیمتی کتابیں ہیں جو بہت عرصے پہلے لیتھو یا لیٹر پریس مشین میں مرتب ہوئی تھیں اور ان کی سردست دستیابی ایک

امر محال تھا۔ اگر سندھی ادبی بورڈ اس معاملے میں اتنی سنجیدگی سے توجہ نہ کرتا تو ممکن ہے کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد سندھ کا عظیم تاریخی ادبی و ثقافتی سرمایہ جو ہمارے بزرگوں نے نہایت محنت و مشقت سے جمع کیا تھا وہ تلف و تاراج ہو جاتا۔

یوں بھی ہم سندھی اپنی قوم کے دشمن ہی ثابت ہوئے ہیں۔ دنیا کی کسی بھی محکوم یا تباہ حال قوم سے محسن کشی میں ہرگز کمتر نہیں۔ دنیا کی بیدار اور سرفراز اقوام اپنے اسلاف کے کارناموں پر ناز و فخر کرتی ہیں۔ ان کے کارناموں اور کارہائے نمایاں کو ضایع نہیں ہونے دیتیں، یہاں تک کہ ان کا یوم پیدائش و یوم وفات بھی مناتی ہیں۔ ایسا کرنے سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اپنے بزرگوں کے کارناموں کو نہ صرف اپنی قوم بلکہ پوری دنیا کے سامنے دہرائیں اور ان کی شایانِ شان طریقے سے قدر دانی کر کے اپنی قوم کے ہر فرد کو غیرت دلائیں، بیدار کریں اور ان میں نئی روح پھونکیں تاکہ قوم کا ہر فرد اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ملک و ملت کا نام و مقام بلند کرے۔ انگریزی زبان کے مشہور عالم ''لانگ فیلو'' نے کیا خوب کہا ہے!

نامور اپنا نام وہ کرگئے
ہم بھی ان کے کام کا کیوں نہ لیں اثر
ربانی راہ جب ہم چلیں کے لے
نشانی کوئی پیچھے جائیں چھوڑ
شاید کوئی اس رستے کو دیکھ کے سوچے
پار بیاباں کرکے نخلستان جا پہنچے

فارسی والوں نے دیکھئے کہ کیا لکھا ہے!

نام نیک رفتگاں ضایع مکن
تا بماند نام نیکت یادگار

دنیا کی ممتاز و بیدار اقوام نہ صرف اپنے مرحوم بزرگوں کے احسانات کا بدلہ ہر ممکن طریقے سے چکانے کی کوشش کرتی ہیں بلکہ جو شاندار ہستیاں یا محسنِ قوم ان کے درمیان زندہ ہوتے ہیں، ان کی بھی شایانِ شان طریقے سے قدر دانی اور عزت افزائی کرتی ہیں۔ ایسا کرنے سے بھی ان کے وہی دو مقاصد حاصل ہوتے ہیں جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

بیدار اور ممتاز اقوام کی مذکورہ کسوٹی پر اگر ہم خود کو پرکھیں تو سندھی قوم میں یہ صفات مفقود ہیں۔ جس کے بنیادی اسباب من حیث القوم بے پرواہی، بے علمی، غفلت اور جہالت ہیں۔

سرزمین پر سندھ میں بڑے بڑے عارف، عالم، ادیب، فاضل، شاعر، مفکر، مورخ اور مصنف وغیرہ گزرے ہیں مگر افسوس کہ ان سربرآوردہ ہستیوں کا نام و نشان فقط تاریخی کتب کی زینت ہے۔ قوم کے ان محسنوں کو ہم یوں فراموش کر بیٹھے ہیں گویا یہ شخصیات بھی اس کرۂ ارض پر پیدا ہی نہیں ہوئیں۔ اس غفلت اور بے پرواہی کے باعث ہم اپنی اور اپنی قوم کے ماضی، حال اور مستقبل پر ظلم کر رہے ہیں۔

سندھی ادبی بورڈ کے قیام کے پیش نظر بھی یہی اندیشہ یا خدشہ تھا کہ کہیں ہمارے موجودہ اور مرحوم عالموں، ادیبوں، شاعروں، مؤرخوں اور مصنفوں کی انتھک محنت رائیگاں نہ چلی جائے۔ سندھی ادبی بورڈ نے، اپنے آغاز کے بعد بہت مختصر عرصے میں سندھ کے ادبی خزانے کو سمیٹنا اور سنبھالنا شروع کر دیا۔ اگر سندھی ادبی بورڈ کو اسی جوش و جذبے، اسی خلوص و نیک نیتی، اسی اطمینان اور خاطر جمعی سے آگے بڑھنے کا موقع دیا گیا تو یقیناً سندھ کے قدیم و جدید ادب، تاریخ، ثقافت، تہذیب اور تمدن کو ہر ممکن طریقے سے بچایا جا سکے گا۔

جس طرح ریل گاڑی کے متعدد ڈبوں کو آگے کی جانب بڑھنے کے لیے مضبوط اور سیدھی لوہے کی پٹریوں اور طاقتور انجن کی اشد ضرورت ہے، بالکل اسی طرح کسی بھی ادارے کو کامیابی و کامرانی سے منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے، مالی اور نفری نظام کے ساتھ ساتھ ایک ایسے خادم کی بھی ضرورت ہے جو ایک کامیاب منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے کام میں

یکتا، محنتی اور مخلص ہو۔ اگر کسی بھی منتظم میں ان تین خوبیوں میں سے کوئی ایک خوبی بھی مفقود ہے تو وہ شخص اپنے ادارے کے لیے یقیناً باعث شرمندگی ہوگا۔

بے جا و بے محل نہیں، اگر میں اس موقع پر اپنے دلی جذبات کا اظہار کروں کہ الحمدللہ یہ تینوں خوبیاں اللہ پاک جل شانہ نے بدرجۂ اتم سندھی ادبی بورڈ کے سیکریٹری جناب محمد ابراہیم جویو کی ذات میں سموئی ہیں۔ جن کے لیے نہ صرف میرے دل کی گہرائیوں میں عزت، احترام، پیار و محبت ہے بلکہ ہر وہ سندھی، جو صحیح و سالم دل و دماغ رکھتا ہے، جس کا دل حسد، بغض، کینے اور کدورت سے پاک ہے، جو اپنی پیاری زبان اور ادب کا خیر اندیش، قدردان و قدرشناس ہے، جو اپنے محسنوں کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے جو اچھے کو اچھا کہنے کی ہمت اور منصف مزاجی کا حامل ہے تو وہ یقیناً محمد ابراہیم جویو کا ممنون و مداح ہوگا۔

محترم جویو صاحب کو جب بھی کسی نے دیکھا ہوگا، انھیں شہد کی مکھی کی طرح کسی نہ کسی قومی خدمت میں مصروف کار دیکھا ہوگا۔ صلے و ستائش کی تمنا کے بغیر، دن رات دنیا و مافیہا سے بے خبر، اپنی دھن میں محو، اپنے کام میں منہمک اور مشغول رہنا محترم جویو صاحب کا خاصہ ہے۔ جو بھی ان سے رابطے میں آیا ہوگا، اس نے انھیں ایک دردمند، پرخلوص، نہایت سادہ، منکسر المزاج، بناوٹ سے عاری، حلیم الطبع، صاف دل و صاف گو، کم گو، سلجھے خیالات والا، قدامت و جدت کے امتزاج و اعتدال کا ایک مجسمہ و مرقع محسوس کیا ہوگا۔ انھیں سندھی زبان، علم و ادب سے ایک ازلی اُنس و محبت ہے۔ محترم جویو صاحب نے جس کام کا بیڑہ اٹھایا ہے، اس کے لیے ان کا ہمیشہ یہی کہنا رہا ہے کہ:

> ''ہمیں، ہمارے کیے گئے کام کے متعلق کسی بھی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ علم و عقل، ادب و شعور کے اس بے انت و بے کنار سمندر میں، ہم پانی کی سطح سے کچھ بلند، محض اپنا سر نکالے خود کو ڈوبنے یا بہہ جانے سے بچاتے چلے آرہے ہیں... اور بس!''

محترم جویو صاحب کے دل میں، سندھی کے گذشتہ اور موجود ادیبوں، شاعروں، مصنفوں، مؤلفوں، مترجموں اور مؤرخوں کے لیے بے حد عزت واحترام ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

"جس کسی نے بھی سندھی ادب اور سندھی زبان کے لیے بے لوث ہوکر کام کیا اور اپنے علم اور تجربے کے مطابق ہر ممکن خدمت کی یا کر رہا ہے، وہ ہر طرح سے عزت واحترام کے لائق ہے۔ علم وادب کے میدان میں خصوصاً ادیبوں اور شاعروں کی دنیا میں ہر ایک دوسرے کو اپنا حریف مان کر نفرت، تعصب اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتا یا ایک دوسرے پہ ذاتی تنقید کرتا ایک دوسرے سے بدست و گریبان رہتا ہے۔ یہ سب کس قدر غلط، نامناسب، نازیبا اور قبیح افعال ہیں اور ان حرکتوں سے جلد یا بدیر ادب جیسے پاک اور لطیف فن کو بڑا نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

سندھی ادب کی نشر واشاعت کے سلسلے میں محترم ابراہیم جویو صاحب کی انتھک کوششیں، قابلِ قدر کارنامے اور خدمات جو کہ انھوں نے سندھی ادبی بورڈ کے لیے خصوصی طور پر اور سندھ کے محکمہ تعلیم کے لیے عمومی طور پر سرانجام دی ہیں، نے انھیں سندھی ادب کی تاریخ میں ایک بلند مقام عطا کر کے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ (مرحوم) کی تصانیف کی اشاعت کے متعلق چند الفاظ

معلوم رہے کہ سندھی ادبی بورڈ اب تک شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ (مرحوم ومغفور) کی تصنیف وتالیف کردہ تقریباً ساڑھے تین سو☆ کتابوں میں سے بتیس کتابیں شایع کر چکا ہے

☆ بقول مرزا قلیچ بیگ کے پوتے، مرزا اعجاز بیگ "مرزا قلیچ بیگ کی تصنیف وتالیف کردہ کتابوں کی کل تعداد ۴۵۷ ہے۔"

جن میں زیادہ تر چھوٹے بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں جن کی ضخامت کوئی تیس چالیس صفحے بنتی ہے۔ دوسری جانب، سندھی ادبی بورڈ نے سندھ کے ان مصنفین کی سو فیصد کتابیں شایع کی ہیں جن کی کل تصانیف محض دو چار کتابوں پر مشتمل ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود بڑے افسوس کا مقام ہے کہ کچھ تنگ دل و تنگ نظر افراد نے شکایتاً سندھی ادبی بورڈ کو صرف مرزا صاحب مرحوم کی کتابیں شایع کرنے کا ادارہ قرار دے کر ناانصافی، بے قدری اور احسان فراموشی کا مظاہرہ کیا ہے۔

واضح رہے کہ ۱۹۴۷ء سے قبل، مرزا صاحب مرحوم کی تصانیف و تالیف کی نشرواشاعت کا کام جس تیز رفتاری اور عمدہ طریقے سے ہندو ناشران نے انجام دیا، اس کا عشرِ عشیر بھی پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد، سندھی مسلمان ناشران حاصل نہ کر سکے۔ اس زمانے میں ایک ہندو بزرگ آنجہانی رائے بہادر دیوان دیارام گدومل نے ایک لاکھ روپے سے زائد رقم خرچ کر کے مرزا صاحب کی کوئی سو کتابیں بہترین طریقے سے شایع کروائی۔ اس کے علاوہ پوکرداس اینڈ سنز شکارپور، ہری سنگ اینڈ سنز سکھر، ویرھومل کھتومل اینڈ سنز سکھر کے علاوہ بہت سے ہندو ناشران نے مرزا صاحب مرحوم کی کتابیں شایع کروا کے اپنی علم دوستی، قدر دانی بے تعصبی اور انصاف پسندی کا ثبوت دیا تھا۔ اگر یہ ہندو ناشران بھی تعصب و بے قدری سے کام لیتے تو مسلمان مصنفوں کی تصانیف اور تالیفات طاقِ نسیان کی زینت بن کر ضایع ہو جاتیں۔ افسوس کہ جو رویہ ہندو صاحبان نے اپنے اچھے وقتوں میں روا نہ رکھا وہ متعصبانہ رویہ ہمارے کچھ کوتاہ نظر سندھی مسلمان اپنے اسلامی دور میں روا رکھے ہوئے ہیں۔

مرزا صاحب مرحوم نے اپنی بے قدری کی شکایت کرتے درست فرمایا تھا کہ:

ہوا میں حیدرآباد، سندھ، ہندوستان میں پیدا
کیا ہی تھا اچھا گر ہوتا روم یا ایران میں پیدا
وطن ہے یقیناً یہ بے شک، لگے پیارا مجھے
ہے دعا ہو سدا حب الوطنی ایمان میں پیدا

ہوں لعلِ بدخشاں، قدر میری ہوئی نہ وطن میں
نبی ﷺ بے قدر ہوئے خود، ہوئے جو عربستان میں پیدا
بے شمار لوگ یہاں خام، میری قدر کیا جانیں
جنم لیتا اُس دور میں، ہوتا روم یا یونان میں پیدا
نہ جانیں فارسی، عربی نہ سمجھیں سندھی ہی پوری
بھینس کے آگے بین بجاؤں، نور ہوا کفران میں پیدا
بنے ہیں کچھ تو شاعر بھی، پر نہ جانیں قاعدے قانون
خدا وندا! ہوں نہ نازک پھول ہرگز خارستان میں پیدا
ہوتا رومی یا یونانی، میرے شاعری کے لیے میرا
ہوتا اک بت مرمریں شہر کے میدان میں پیدا
نہ جانی قدر فردوسی کی جس طرح محمود نے اسی طرح
لکھتا اک ہجو میں بھی، کرتا فتنہ زندان میں پیدا
شکایت کب تک بے قدری کی کرو گے قلیچ آخر
ہوتے آزاد، جو ہوتے باپ کی طرح گرجستان میں پیدا

ایک اور مقام پر، اپنی بے قدری اور اس کا سبب یوں بیان کرتے ہیں۔

ہیں سب اشعار میرے موتی اور جواہر
ہوا ہے کیا خریداروں کو خداوندا!
رقم کرتا ہے قلم میرا سخنِ حق
اس کارن تو دنیا کو اچھا نہیں لگتا

مرزا صاحب مرحوم نے مہد سے لحد تک، اپنے جسم و جان کی طاقت اور آنکھوں کا نور نچوڑ کر اہلِ سندھ کے لیے علمی و ادبی خزانہ جمع کیا۔ ان کی یہ علمی و ادبی خدمات،

اپنے ذاتی و مالی منافع یا کسی طمع و لالچ کے لیے نہیں تھیں۔ اپنی پوری زندگی میں، کبھی بھی انھوں نے اپنی کسی علمی و ادبی خدمت کا صلہ کسی سندھی سے طلب نہیں کیا۔ اس بارے میں مرزا صاحب مرحوم کا کہنا تھا کہ:

''انسان اپنے مال و دولت، روپے پیسے، زر اور زیور وغیرہ
پر زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ ہمیں اللہ پاک جل شانہ نے علم عطا
کیا ہے لہٰذا اس کی زکوٰۃ فرض ہے۔''

مقام افسوس ہے کہ اہلِ سندھ مرزا قلیچ بیگ مرحوم کی اس علمی زکوٰۃ کو قبول کرنے میں تامل اور پس و پیش سے کام لے رہے ہیں۔ اگر کوئی حاجت مند یا ضرورت مند، کسی سخی کی زکوٰۃ قبول نہ کرے تو اسے اس کی فاقہ مستی کے علاوہ کیا نام دیا جائے؟

مرزا صاحب مرحوم نے ہر اس علم اور فن پر قلم فرسائی کی اور جامع کتابیں لکھیں، جن پر آج تک کسی بھی سندھی اہلِ قلم نے ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ ان کتابوں میں سے کچھ کتابیں ان کی زندگی میں شایع ہوئیں اور مقبول عام کی سند حاصل کی جبکہ بہت سی کتابیں ابھی تک غیر مطبوعہ حالت میں، ان کی اولاد سنبھالے ہوئے ہے۔

مرزا صاحب مرحوم کی غیر مطبوعہ یا کافی عرصہ قبل شایع شدہ کتابیں جو اب بالکل ہی ناپید و نایاب ہیں، اگر ملکی آزادی کے اس دور میں بھی شایع نہ ہوسکیں تو اسے ایک بڑا قومی سانحہ ہی سمجھا جائے گا۔ مجھے قوی امید ہے کہ سندھی ادبی بورڈ، سندھی علم و ادب کی بہتری و بہبود کے لیے مرزا صاحب کی نایاب مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتب کی اشاعت کے کام کی رفتار کو مزید تیز کرے گا تاکہ ایک طرف تو اس قومی امانت کے بوجھ سے مرزا صاحب کے وارث آزاد ہوسکیں اور دوسری طرف یہ امانت قوم کے افراد کے ہاتھوں میں صحیح سلامت پہنچ سکے جس سے سندھی قوم، سندھی زبان، سندھی ادب، سندھی تاریخ و سندھی ثقافت کو فائدہ پہنچے گا۔

مرزا صاحب کی سوانح عمری ''برگ سبز و قرطاس سیاہ'' کے متعلق چند الفاظ

مرزا صاحب مرحوم کی زندگی ہی میں ان کے کئی دوست ان سے اصرار کرتے تھے کہ وہ اپنی سوانح عمری خود لکھیں۔ ان کے دوستوں میں سے ایک دوست دیوان بھیرومل مہر چند ایڈوانی صاحب نے سندھی زبان میں ان کی سوانح حیات لکھ کر، اسے چھپوانے کی اجازت چاہی مگر مرزا صاحب نے انھیں یہ کہہ کر روک دیا کہ ''فی الحال اسے شائع نہ کرو اور اگر بہتر سمجھو تو میری وفات کے بعد شائع کر دینا۔''

ان کے ایک اور گہرے دوست آنجہانی دیوان دیارام گدومل نے بھی ان کی سوانح عمری انگریزی زبان میں لکھی جو کہ اب تک ان کے وارثوں کے پاس محفوظ ہے۔ اس سوانح کے بارے میں دیارام گدومل نے انگریزی میں جو خط مرزا مرحوم کو سورت (بمبئی) سے بھیجا تھا، اس کا ترجمہ ملاحظہ کیجیے۔

سورت

۱۰، دسمبر ۱۹۰۶ء

پیارے قلیچ بیگ

اللہ نے تمھیں جو صلاحیت ودیعت کی ہے اس سے تم نے جو بے مثال کام لیا ہے وہ مجھے شرمندہ کرتا ہے۔ میں بھی اپنے فرصت کے لمحات مثبت کام میں لگانا چاہتا ہوں مگر تمھارے جتنا کام کرنا ممکن نہیں۔ اس بات میں تم سب سے بازی لے گئے ہو۔ خدا کرے تم اپنے لیے اور اپنے دیس کے لیے لمبی عمر پاؤ۔ لیکن اگر تم مجھ سے پہلے چلے گئے تب بھی میں تمھاری محنت کا پھل دنیا کے سامنے ضرور رکھوں گا۔

دیارام گدومل

گو کہ دیوان دیارام گدومل مرزا صاحب مرحوم سے قبل وفات پا گئے مگر انھوں نے اپنی زندگی ہی میں مرزا مرحوم کی کتابوں کی نشر و اشاعت کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے سے زیادہ رقم صرف کی اور مرزا صاحب کی محنت کا پھل دنیا کے سامنے لا کر اپنا وعدہ وفا کیا۔

مولانا حکیم فتح محمد سیوہانی صاحب (مرحوم) بھی وقتاً فوقتاً مرزا صاحب سے ان کی زندگی کا احوال لکھنے کے لیے اجازت طلب کرتے رہے لیکن مرزا صاحب نے انھیں بھی منع کر دیا۔

یاد رہے کہ مرزا صاحب مرحوم بچپن سے لے کر وفات تک اپنی ڈائری باقاعدگی سے لکھتے رہے۔ جس کے مطالعے سے ان کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ علم ہو سکتا ہے۔ اسی نوعیت کی ایک اور ڈائری انگریزی زبان میں بھی ترتیب دی تھی اور اس کا نام "فیملی رجسٹر" رکھا تھا۔ جس میں انھوں نے اپنے خاندان کے رسوم و رواج، خوشی غمی اور شادی و مرگ کے طور طریقے مرتب کیے تھے۔ جن پر ان کا خاندان آج تک عمل پیرا ہے۔ اس کے علاوہ، مرزا صاحب مرحوم نے ایک اور کتاب "یادیں" کے نام سے لکھی۔ جس میں انھوں نے اپنے اور اپنے خاندان کا احوال مختصراً درج کیا ہے۔ یہ کتاب سندھ یونیورسٹی نے شایع کروائی ہے۔

بالآخر دوستوں کے پُر زور اصرار پر ۱۹۲۳ء میں انھوں نے اپنی سوانح عمری لکھی اور اس کا عنوان رکھا "برگ سبز یا دفتر سیاہ"۔ یہ کتاب لکھنے سے ان کی مراد اپنی اولاد اور عزیز و اقارب کو مختلف موضوعات پر ہدایت و معلومات فراہم کرنا تھی۔

یوں تو مرزا صاحب کی زندگی میں بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی بہت سے علم دوست ساتھیوں، مصنفوں، مضمون نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے، مختلف زبانوں میں، کئی رسالوں، کتابوں اور اخباروں میں وقتاً فوقتاً مرزا صاحب کی حیات پر تبصرے یا کتابچے شایع کروائے لیکن مرزا صاحب مرحوم کی مفصل سوانح حیات پہلی بار ۱۹۳۲ء میں سندھ مسلم ادبی سوسائٹی سے شایع ہو کر منظر عام پر آئی جس کا نام "قربِ قلیچ" تھا۔ یہ سوانح مرزا صاحب کے تیسرے نمبر کے فرزند مرزا ہمایوں بیگ فائق مرحوم کی تالیف کردہ تھی۔

بہت سے دوستوں نے کئی بار یہ مشورہ دیا بلکہ اصرار کیا کہ مرزا صاحب مرحوم کی خودنوشتہ سوانحِ حیات "برگ سبز یا قرطاسِ سیاہ" کسی نجی یا ذاتی تذکرے کی قطع و برید کے بغیر لفظ بہ لفظ شایع کروائی جائے۔ آخر کار سندھی ادبی بورڈ کو یہ سوانح پیش کی گئی۔ جس نے اپنی شاندار روایات قائم رکھتے ہوئے کتاب کو نہایت عمدہ طریقے سے اور بڑے اہتمام و کوشش سے شایع کیں۔

اس سوانح عمری کے عنوان "برگ سبز یا دفترِ سیاہ" کے مفہوم ہی سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ مرزا صاحب مرحوم نے اپنی زندگی کے دونوں پہلوؤں، ظاہری و باطنی، سفید وسیاہ پر قلم فرسائی کر کے ایک مخلص اور جرأت مند نقاد یا سوانح نگار کا کردار ادا کیا ہے۔

اپنی خودنوشتہ سوانح حیات کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے مرزا صاحب فرماتے ہیں:

(قطعہ)

ہرچہ دارد قلیچ آرد پیش
برگ سبز است تحفۂ درویش
سیہش گشت دفترِ اعمال،
زان سیہ روی با سفیدیٔ ریش
عجب احمق، بدستِ خود بنوشت
مدح و ذم، نیک و بد سوانحِ خویش
خواہشِ دوستان شدہ عذرش
خلق خوشدل ازاں، خودش دلریش

ترجمہ: برگ سبز درویش کا تحفہ ہے۔ قلیچ کے اعمال کا دفتر سیاہ ہو چکا ہے اسی لیے اس کا چہرہ سیاہ اور ریش سفید ہے۔ وہ ایک عجیب احمق نظر آتا ہے جس نے اپنی سوانح میں، اپنی تعریفیں، برائیاں، خوبیاں اور خامیاں اپنے ہاتھ سے تحریر کی ہیں۔ اس نے اپنی خودنوشتہ سوانح اپنے دوستوں کی خواہش پر لکھی ہے جسے پڑھ کر خلق کا دل تو خوش ہو جائے گا گو اس کا اپنا دل زخمی ہے۔

چونکہ مرزا صاحب مرحوم نے اپنی سوانح حیات ۱۹۲۳ء میں تصنیف کی اور ۳، جولائی ۱۹۲۹ء کو وفات پائی، اس لیے یہ ظاہر ہے کہ ان کی زندگی کے وہ احوال و واقعات جو ان سات سالوں میں رونما ہوئے ہوں گے، وہ اس سوانح حیات میں شامل نہیں ہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے محترم محمد ابراہیم جویو صاحب (سیکریٹری ادبی بورڈ) کے مشورے کے مطابق، کتاب کے آخر میں ضمیمے کے طور پر مرزا صاحب، مرحوم کے آخری سالوں میں لکھے ہوئے روزنامچے سے چند اوراق، اختصار کے ساتھ پیش کیے ہیں۔

کسی ملک یا قوم کے بڑے لوگوں یا سربرآوردہ ہستیوں کی سوانح حیات لکھنے، شایع کروانے یا پڑھنے سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟ یا یہ کہ دراصل بڑا آدمی کسے کہنا چاہیے؟ اس سوال کے جواب میں خود مرزا صاحب نے اپنی ایک کتاب میں یوں اظہار خیال کیا ہے۔ انھی کے الفاظ میں پڑھیے۔

"کسی ملک یا قوم کی تاریخ اس کے بادشاہوں اور مصاحبوں کی سوانح عمریوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کے پڑھنے سے لوگوں کو گزرے کل سے واقفیت اور آنے والے وقت کی ہدایت مل سکتی ہے۔ ایسے کئی لوگ ہیں جو مختلف اسباب کی بناء پر گمنامی، گوشہ نشینی یا مسکینی اور غریبی کی حالت میں رہے ہیں۔ انھوں نے کئی حوالوں سے خلق کو فیض پہنچایا اور ملک کو سنوارنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ ان میں سے کچھ تو زندگی میں ہی نامور ہوئے کچھ بعد از مرگ، جن میں سے کئی افراد کا تو لوگوں نے نام تک نہ سنا ہوگا۔ وہ لوگ، جنھوں نے دینی اور دنیاوی حوالوں سے اہم کام کیے ان میں کچھ خاص خوبیاں تھیں جن میں سے کچھ تو ذاتی یا طبعی تھیں اور کچھ انھوں نے ذاتی

محنت و کوشش سے پیدا کی تھیں۔ ایسے لوگوں کی زندگی کا حال عوام الناس کے لیے نہایت مفید ہے کہ وہ انھیں ایک مثال کی مانند دیکھیں لہٰذا ان لوگوں کی یاد کو قائم رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ سڑک پہ سنگِ میل قائم کرنا۔

نام نیک رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیکت یادگار

اس طرح عام لوگوں کو معلوم ہو سکے گا کہ اگر وہ خود بھی اللہ کے ان نیک بندوں کی مانند ہمت و جانفشانی سے کام کریں، اپنے آپ میں ایثار کا جذبہ پیدا کر کے خلق خدا کی فکر کریں اور ان کے کام آئیں تو پروردگار۔ ایسا ہی درجہ و مرتبہ انھیں بھی عنایت کرے گا۔ یہ سوانح عمریاں عام انسانوں میں ہمت و ترغیب کا باعث بنیں گی۔ ایک انگریز عالم کا کہنا ہے کہ:

''اعلیٰ اقدار کے حامل اچھے لوگوں کا تاریخی تذکرہ نہایت کارآمد ہے بلکہ مقدس کتابوں کے مثل ہے کیونکہ ان سے ترفاہ کی طرح زندگی بسر کرنے، اعلیٰ درجے کے خیالات کے ساتھ جینے، اپنی پوری زندگی دوسرے انسانوں کی خدمت کے لیے دل و جان سے وقف کرنے اور مضبوط ارادے اور خود اعتباری کے گن پیدا کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔ ایسے بڑے لوگ زیادہ تر مفلس، غریب، نادار و عام افراد تھے جنھوں نے اپنی محنت اور ذاتی جوہر سے وہ مقام پایا کہ دوسروں کے لیے قابلِ تقلید مثال بنے۔ وہ بجائے

اپنی غریبی، کمی، کمزوری یا محرومی و مفلسی پر شرمندہ ہونے کے اس پر فخر کرتے رہے۔ ایسی مثالوں بلکہ ایسی ہزاروں باتوں کا نازک، مخفی مگر گہرا اثر پڑھنے والوں کی اخلاقیات پر بھی پڑتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ لوگ اپنی نیکی، کردار اور ترقی کے خود ہی ذمے دار ہیں اور یہ عام جملہ پوری طرح سچ ثابت ہوتا ہے کہ "جب تک کوئی انسان اپنی مدد آپ نہیں کرتا، اللہ بھی اس کی مدد نہیں کرتا۔"

ہر ایک ملک میں ایسے بڑے لوگوں کی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں۔ سندھ میں بھی ایسے کئی لوگ پیدا ہوئے ہیں، جن میں سے قدیم شخصیات کا تو کچھ نہ کچھ ذکر کیا گیا ہے جبکہ موجودہ زمانے کے لوگوں کے بارے میں بالکل ہی کچھ تحریر نہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ کچھ اور لوگ بھی اس سلسلے میں کام کرنے کے لیے آگے آئیں گے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ آج کے سندھ کے باسیوں میں کوئی بھی قابلِ ذکر، قابلِ عزت و لائق انسان نہ بنا۔"

۱۔ آدمی کسے کہا جائے؟

بڑا آدمی وہ ہے جس میں زیادہ انسانیت ہو۔ جس شخص میں انسانیت نہیں اسے تو انسان کہنا بھی غلط ہے۔ انسان وہی ہے جس میں انسانیت زندہ ہو ورنہ وہ صرف سانس لینے والا ایک عام دو پایہ جانور ہے۔ یہ انسانیت دراصل ہے کیا؟ ... یہ انسان کی فضیلت اور لیاقت ہے۔ کتنی ہی اعلیٰ نسل کا شخص کیوں نہ ہو اگر اس میں انسانی فضیلت اور لیاقت نہ ہوگی تو اسے بڑا آدمی نہیں کہا جائے گا۔ شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے۔

پسر نوح، بابدان بنشست، خاندانِ نبوتش گم شد
سگِ، اصحاب کہف روزی چند، پئی نیکان گرفت ومردم شد

اس لیے انسان پر لازم ہے کہ وہ نہ تو اپنے حسب نسب پر فخر کرے اور نہ ہی دنیاوی مال و جاہ پر۔ سیانے کہتے ہیں کہ اس عالم بے ثبات میں آسائش بھری زندگی، مال و دولت یا حسن و جمال پر فخر کرنا بے سود ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں ہمہ وقت زوال آمادہ ہیں۔ فارسی کا ایک شعر ہے۔

بر مال و جمال خویش مغرور مشو
کانرا بہ شبی برند، و این را بہ تبی

یعنی مال و جمال پر غرور مت کر کیونکہ مال تو ایک رات میں یوں گم ہو جاتا ہے (گویا چور لے اڑے یا آگ میں بھسم ہوا) اور جمال (یعنی حسن و تندرستی) ایک بیماری سے کھو سکتا ہے اور نہ ہی حسب نسب پر فخر مناسب ہے کہ یہ آپ کی کمائی نہیں۔

عربی قول ہے کہ:

"شرف الانسان بالعلم و الادب، لا بالمال و النسب"

یعنی انسان کا شرف علم وادب کے باعث ہے نہ کہ مال وحسب نسب کے۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ایک حدیث ہے کہ:

"لاتاتونی بانسابکم واعتونی باعمالکم"

یعنی میرے پاس اپنے نسب کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے اعمال و افعال کے ساتھ آیا کرو۔ اپنی بیٹی کو تاکید کی کہ:

اپنے حسب نسب کو خود پر حاوی نہ کرنا اور یہ نہ سوچنا کہ میں چونکہ نبی ﷺ کی بیٹی ہوں اس لیے روزِ محشر حساب سے بالاتر ہوں گی بلکہ اپنی ذاتی فضیلت اور اعمال کا خیال رکھنا۔"

حافظ شیرازی نے بھی تو کچھ ایسا ہی کہا ہے:

تاج شاہی طلبی، گوہر ذاتی بنما
ور خود از گوہر جمشید و فریدون باشی

یعنی گر تاج شاہی کی طلب ہے تو جوہر ذاتی نکھار اگر جوہر ذاتی نہیں تو تمھارا جمشید وفریدون کی نسل سے تعلق بھی بیکار ہو جائے گا۔

جب ہمارے پیغمبر ﷺ کی پیاری اولاد کو حسب نسب پر فخر کرنا واجب نہیں تب عام رواجی لوگوں کے لیے کیسی حجت؟ دیکھیں مولا علیؑ کیا فرماتے ہیں:

ہوں شخص اپنی طرز کا، ہے نسب میرا ادب
خواہ ہوتا عجم سے میں یا ہوتا خود عرب
مرد ہے وہ جو کہے کچھ بھی نہیں میں
مرد نہیں وہ جو گائے، حسب نسب

حسب نسب پر یعنی باپ دادا پر فخر کرنا، مٹی کے ڈھیر یا ہڈیوں کے ڈھیر پر فخر کرنے کے مترادف ہے۔ دنیا میں حسب ونسب کسی کام نہیں آتا۔ اس پر تو طاقت اور دولت ہی غالب آجاتی ہے علمیت وفضیلت تو بعد کی باتیں ہیں۔

جب نادر شاہ نے دہلی فتح کیا اور اپنے بیٹے رضا قلی مرزا کی شادی بادشاہ محمد شاہ مغل کی بیٹی سے کی، تب وہاں کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ نادر شاہ کسی پر شکوہ جاہ ونسب کا وارث نہیں بلکہ ایک عام آدمی کا بیٹا ہے جو اپنی ہمت وشجاعت کے باعث مشہور و فتح مند ہوا ہے لہٰذا رضا قلی کو شرمندہ کرنے کی غرض سے کہا کہ شاہی رواج کے مطابق دولہا و دلہن دونوں کو اپنی سات پشتیں گنوانا ضروری ہے۔ دلہن کی جانب سے تو سلاطین دہلی کے پشت در پشت نام لیے گئے اور جب دولہا کی باری آئی تو اس نے بنا کسی جھجک کے اپنے باپ کی فہمائش کے مطابق۔ رضا قلی بن نادر، بن شمشیر، بن شمشیر، بن شمشیر... کہہ کر اپنی سات پشتوں کو ''تلوار کی نسل'' سے منسوب کردیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ عام غریب آدمی، اپنی ذاتی لیاقت اور محنت کی وجہ سے مشہور عالم ہوئے۔ ان کے حسب نسب کو جاننے کی کسی کو ضرورت نہیں۔ کتنے ہی نبی، اولیاء، عالم، فاضل اور شاعر وادیب غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ کوئی موچی تو کوئی بڑھئی، کوئی کچھ کوئی کچھ، مگر اپنے کام کی نسبت سے وہ لاثانی ٹھہرے۔ ان کی مثالیں کیا دوں، بے شمار ہیں۔ یہ صورت حال قدیم مشرقی ومغربی ممالک سے لے کر آج تک چلی آرہی ہے۔ بلکہ مغربی یا یوروپین ممالک یا اقوام میں تو نچلے درجے سے ترقی کر کے محنت وکاوش کے ذریعے اعلیٰ مقام حاصل کرنے پہ زیادہ فخر کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ایسی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ایک مثال مشہور مشنری پادری "ولیم کیری" کی ہے جو دراصل ایک موچی کا بیٹا تھا۔ اس کے دو مددگار تھے۔ ایک "وارڈ" جو ایک بڑھئی کا بیٹا تھا اور دوسرا "مارشام" جو کہ جولاہے کا بیٹا تھا۔ ولیم کیری نے ہندوستان کے شہر سیرامپور میں ایک بڑے کالج کی بنیاد رکھنے کے علاوہ مزید ۱۶ مقامات پر بھی تعلیم کا اعلیٰ بندوبست کیا۔ سولہ (۱۶) دیسی زبانوں میں بائبل یا انجیل کا ترجمہ کیا۔ مطلب یہ کہ وہ پورے ہندوستان کی مشہور شخصیت بن گیا اور وہ ہر جگہ ایک موچی کا بیٹا ہونے پر فخر کرتا تھا۔ ولیم کیری ایک دن گورنر جنرل کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا، محفل میں کئی اعلیٰ شخصیات موجود تھیں کہ آمنے سامنے بیٹھے ہوئے افراد میں سے ایک صاحب نے اپنے برابر والے صاحب سے آہستگی سے پوچھا کہ: "کیا یہ وہی کیری ہے جو پہلے موچی تھا؟" کسی اور کے جواب دینے سے قبل ہی کیری نے بآواز بلند کہا "نہیں جناب میں تو فقط چمڑا وغیرہ کاٹا جانتا تھا ابھی مکمل موچی کہاں بنا تھا۔"

بکر واشنگٹن، امریکی غلام بھی تعلیم کے حوالے سے کام کرنے کے باعث معروف ہوا۔ اس نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح ایک غلام ہو کر وہ اس اعلیٰ درجے تک پہنچا۔

سندھ کے قدیم مسلمان خاندان، آج حالت زوال میں ہیں۔ جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ محنت، مشقت، مزدوری، کام کاج اور ہنر وغیرہ کرنے یا سیکھنے کو عار سمجھتے ہیں اور علیت،

فضیلت اور لیاقت حاصل کرنے کے بجائے اپنی کاہلی کے سبب برباد ہو رہے ہیں۔ انھیں اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بڑے آدمی وہ ہیں جنھوں نے خود کو سخت محنت سے منوایا اور آج ان کے نام و کام سے ان کے وارث عزت و آبرو سے دیکھے جاتے ہیں۔ مگر وہ لوگ جو خود خام ہیں، بے توقیر ہیں اور اپنے بڑوں کے کارناموں کے بارے میں لمبی لمبی تقریریں کیے جاتے ہیں، ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن و حدیث کے مطابق ذاتی محنت و فضیلت پر فخر کرنا چاہیے نہ کہ اپنی نسل یا حسب نسب پر۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے واقعتاً بڑا آدمی وہ ہے جو سرمایۂ انسانیت بھی رکھتا ہے۔ اس بارے میں کچھ اشعار پڑھنے والوں کے ذوق کی نظر کرتا ہوں۔

باپ کے نام سے پہچانے جاؤ تم کیوں
اپنے جدِ امجد سے جاؤ نہ آگے کیوں

حسب نسب پہ اتنا کیوں اترائے
حسب نسب تو تیرے کام نہ آئے

نہیں ہو بھیڑیا، سگ یا چراغ تم
نہ جتاؤ حق مُردوں پہ کہ گدھ نہیں ہو تم

کیوں کرتے ہو ناز مشت بھر ہڈیوں پہ
ان کی گل چکی ہیں، گلیں گی تیری بھی ویسے

دراصل تم شاہین ہو، نام ہے شہباز
گرو نہ زمین پہ، عرش سے اونچی رکھو پرواز

اپنے عمل کو اپنا کرو رہبر
کیونکہ عمل سے ہر دم نام رہے امر

عمل ہی تیرے ساتھ چلیں گے دارالبقاء میں
دوست و احباب تو رہ جائیں گے دارالقضا میں

نفسا نفسی ہوگی ہر سو روز قیامت کے
رشتے ناتے، سارے سہارے بھول جائیں گے

"اب" اور "جد" کو کرو اپنا "ابجد" اے بھائی
علم و عمل کے دنیا میں تم بن جاؤ سودائی

اپنا شجرہ کرتا ہے تو اتنا کیوں لمبا
کاغذ کے ہیں پھول یہ، دیں گے خوشبو کیا

باپ فریدون، کیا ہوا جو دادا ہے خسرو
ایسا کچھ کرو کہ تمھارا اپنا نام تو ہو

کام نہ آئے پیغمبر کا بھی جد امجد
نوح کا بیٹا تھا وہ، دیکھو ہوگئی نہ حد

جس طرح بنائے نادر نے باپ داد شمشیر
بنو مثل اس کے، بناؤ بلند اپنی تقدیر

رہ جو تھا فقط کتا اصحاب کہف کا
ہوگیا اعلیٰ تر شرف میں اس سے کس طرح

کچھ نہ حاصل ہوگا اگر ہو نہ عمل
آل اپنی کو یہ کہہ گئے ہیں مرسلﷺ

کیا حق پہنچتا ہے ان کی امت کو
اپنے جدِ امجد پہ اتنا اترائے وہ

فخرِ نسبی چھوڑو، عاجزی اپناؤ قلیچ
رہو ہمیشہ آدمیت اور شرافت کے بیچ

والسلام

حیدرآباد

۱۲، جنوری ۱۹۶۵ء۔ اجمل بیگ۔ ق۔ مرزا

قطعۂ در وجہ تسمیۂ این کتاب

برگِ سبز و دفترِ سیاہ

از مرزا قلیچ بیگ

○

ہر چہ دارد قلیچ آرد پیش
برگ سبز است تحفۂ درویش
سیہش گشت دفترِ اعمال
زان سیہ روئی با سفیدی ریش
عجب احمق بدست خود بنوشت
مدح و ذم نیک و بد سوانح خویش
خواہشِ دوستان شدہ عذرش
خلق خوشدل ازان، خودش دلریش

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱-۸-۱۹۲۳

دیباچہ

دوست ایک عرصے سے اصرار کیے جا رہے ہیں کہ میں اپنی زندگی کی تفصیلات رقم کروں۔ میں جواباً انھیں کہتا ہوں کہ زندہ آدمی کے بارے میں لکھنا عبث ہے۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں اس کے کردار و خیالات یکسر تبدیل ہو جائیں۔ اس صورت میں یہ سوانح حیات نامکمل ہی کہلائے گی۔ اس کے باوجود بھی میرے دوست مسٹر بھیروں مل مہر چند نے نہ صرف میری سوانح عمری لکھی بلکہ اسے شایع بھی کروایا۔ حالانکہ میں نے اسے منع کرتے ہوئے مشورہ دیا تھا کہ اگر میرے مرنے کے بعد مناسب سمجھے تو شایع کروا سکتا ہے۔ اس کے بعد میرے معزز دوست دیوان دیارام گدومل نے مجھے بذریعہ خط مشورہ دیا کہ میں اپنی زندگی ہی میں اپنی سوانح عمری لکھ جاؤں اور بقول کسے کہ اس میں کوئی عیب نہیں بلکہ کئی حوالوں سے یہ مثبت عمل ہے۔ مثلاً ایک تو یہ کہ اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر مستند کہلاتی ہے دوسرا یہ کہ مختلف موضوعات و واقعات کے بارے میں انسان کو اپنے خیالات و آراء بیان کرنے کا موقع ملتا ہے اور تیسرا یہ کہ اس سوانح حیات سے اس کی آئندہ آنے والی نسلیں استفادہ کرتے ہوئے، اس کے اصولوں کی تعمیل کر سکتی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کئی نامور افراد اپنی سوانح عمریاں لکھ چکے ہیں۔ بس یہ تھیں وہ ساری باتیں جن کی بناء پر میں نے اپنی سوانح لکھنے کا قصد کیا۔

سچ تو یہ ہے کہ میں بچپن سے ہی ایک ڈائری یا روزنامچہ میں اپنے روزمرہ کی اہم باتیں لکھتا چلا آ رہا ہوں۔ مگر اس ڈائری کی حیثیت بڑی نجی ہے اور میں اسے گھر کے افراد یا اپنی اولاد تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ اسی مقصد کے تحت میں نے ایک اور کتاب "یادیں" کے

عنوان سے تحریر کی ہے، جس میں اپنے ماضی کے قصے لکھے ہیں۔ حالانکہ ماضی کی کئی باتیں، رسم و رواج حالاتِ زمانہ کے تابع ہو کر مختلف شکل و ہیئت اختیار کر گئی ہیں جن سے نوجوان تو قطعی واقفیت نہیں رکھتے مگر اب جب میں اپنی سوانح حیات لکھ رہا ہوں تو کئی باتوں کے حوالہ جات کے سلسلے میں مجھے اپنی ڈائری سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس ڈائری کی مدد سے میں نے اپنے والدین، بہن بھائیوں اور کنبے کے دیگر افراد کا احوال درج کیا ہے۔ حالانکہ ان میں کئی باتیں ایسی بھی ہیں جنھیں تحریر کرنے سے کئی لوگوں کو اعتراض ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی میں سمجھتا ہوں کہ سچائی سے سوانح عمری لکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ حقائق اپنی اصل شکل میں بیان کیے جائیں پھر خواہ لوگ اعتراض کریں یا مضحکہ اڑائیں۔ اس کے علاوہ، اس سوانح حیات میں، میں نے کچھ ایسی باتیں بھی تحریر کی ہیں جو میری تعریف کے زمرے میں آتی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ لوگ انھیں خود نمائی شمار کریں مگر کئی مقامات پر ایسا کرنا ناگریز تھا۔ ایسی صورتِ حال میں، میں نے اپنے بارے میں دیگر احباب کی آراء بھی درج کی ہیں۔

جھوٹے کو چاہئیں ہمیشہ سفارشی خطوط
کرتا ہے اپنی تعریف خود اپنے منہ سے
موتی کی تو ہوتی ہے اپنی ہی الگ پہچان
شکر سے کبھی آپ نے اس کی تعریف ہے سنی

لوگ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے اپنی آخرت کے سنورنے کی دعا مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''الٰہی عاقبت محمود گردان!'' انسان خواہ پوری زندگی خوشحال و خوش و خرم رہے لیکن اگر اس کی زندگی کے آخری ایام میں آسودگی نہیں تو اسے ہم خوش قسمت نہیں کہہ سکتے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ موت سے قبل انسان کی قلبی و ذہنی کیفیت میں کیا تبدیلی رونما ہو۔ دین دار، بے دین بن سکتا ہے، دانا، نادان ہو سکتا ہے، مظلوم ظالم بن سکتا ہے، نیک بخت بدبختوں کی صف میں آ سکتا ہے۔ اس بات کی شہادت کے لیے یونانی حکیم سولن اور بادشاہ کریسس کا مشہور قصہ کافی ہے۔

اس لیے کہتا ہوں کہ گر زندہ شخص اپنی سوانح حیات لکھتا ہے تو اسے نامکمل گردانئے۔ اس کی تحریر کو اس کا حال و ماضی سمجھئے اور اس کے مستقبل کی تفصیل دوسرے لوگوں کی تحریروں سے حاصل کیجیے۔ بس یہی کچھ سوچ کر میں نے اپنی سوانح حیات لکھی ہے اور امید کرتا ہوں کہ جس مقصد کے لیے لکھی ہے وہ پورا ہوگا۔ میری عمر اس وقت ستر برس ہے۔ باقی ماندہ زندگی کی تفصیل کچھ بہت زیادہ تو نہ ہوگی اور وہ آسانی سے میری اولادوں یا دوستوں میں سے کوئی تحریر کرلے گا۔

اس سوانح عمری میں جابجا کچھ اشعار شامل کیے گئے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ نثر کے پھیکے پن یا سادگی کو نظم کی رنگینی و دلکشی دلچسپ و دلآویز بنائے۔ ایک علیحدہ باب میں وہ اشعار شامل ہیں جن کے بارے میں میری سوانح عمری کے متعدد مقامات پر تذکرہ ہے۔ ان اشعار کے مطالعہ سے قارئین کو میری عادات، آراء و خیالات سے ہم آہنگی کے ثبوت ملیں گے۔ پڑھنے والے میری شاعری کے رنگ سے بھی لطف اندوز ہوسکیں گے نیز ایک ہی باب میں شاعری کا اچھا خاصا انتخاب شامل کرنے سے قارئین کے ذوقِ سلیم کی تسکین بھی مقصود ہے۔

جو بھی لکھتا ہوں اور کرتا ہوں گفتار
میں مثال کے طور لاؤں اپنے اشعار
یہ خلق میری شاعری کا دیکھے نمونہ
کہتے ہیں کہ "یک مشت، نمونہ خروار"

اس کے اگلے باب میں میری ذات، میری خدمات یا تصنیفات، میری ملازمت یا خدمتِ خلق کے متعلق، جو کچھ اعلیٰ عہدیداروں نے تحریر کیا ہے، اس کے کچھ اقتباسات شامل کروں گا۔ ان خطوط میں سے زیادہ تر انگریزی زبان میں تحریر کردہ ہیں، جن کا سندھی ترجمہ بھی شامل کروں گا۔ گویا کہ یہ میری کارکردگی کی بنیاد پر ملی ہوئی سندیں ہیں جو آج تو شاید میرے کسی کام کی نہیں مگر ہوسکتا ہے کہ میری اولاد کے کام آئیں یا شاید گردشِ زمانہ میں کھوجائیں۔ میرے متعلق سندھ کے شعراء نے عربی، فارسی، اُردو اور سندھی میں جو شاعری کی

ہے، وہ میں نے ایک علیحدہ فائل میں محفوظ کر لی ہے مگر وہ خطوط کے انتخاب کی مانند اس میں شامل نہیں کی جا سکتی۔ اگرچہ ان اشعار کی نزاکت پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ضمیمے میں اپنی تصنیف و تالیف کردہ کتابوں کے نام اور اپنا خاندانی شجرہ شامل کروں گا۔ اگرچہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔

جس کی ذات میں پوشیدہ دانائی ہو
جھلک دکھائے اس جوہر کی اس کا چہرہ
کیوں طول دیتے ہوئے اپنے شجرے کو
کیوں دیتے ہوئے بزرگوں کی ہڈیوں پہ پہرہ

حیدرآباد، سندھ
اگست ۱۹۲۳ء

قلیچ بیگ

یادگار تصاویر



مرزا صاحب نوجوانی میں
(ایرانی لباس میں)

بہ اوّل می تراشیدم بدستِ خویش ریشم را،
ندانستم کہ آید بر سرم چندین قفاہا۔
فیضی! ایام بے ریشی فراموشم نمی گردد،
کہ می کردند خوبان، بر دل ریشم عناہا۔



مرزا صاحب عالم شباب میں (۱۸۷۶ء)
(انگریزی لباس میں)



مرزا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ساتھ

اپنے گھر کے آنگن میں، اپنے دو بیٹوں، مرزا نادر بیگ (مرحوم) (پیچھے کھڑے ہوئے)
اور مرزا اختر بیگ (مرحوم) کے ساتھ۔

سندھ کا جامی، نظامی، انوری، سعدی ہے وہ
کم نہیں وہ میر و غالب، داغ، سودا، ذوق سے (احسن)



مرزا صاحب "قیصر ہند" کے تمغے کے ساتھ

جس طرح وہ نام اپنا چھوڑ گئے ہیں نامور
تو بھی ان جیسا ہی بن، تو بھی ایسے کام کر



مرزا صاحب مشغول تصنیف و تالیف
(مرزا صاحب اپنی بیٹھک میں کام میں مصروف)



مرزا صاحب اپنے ایک ہندو دوست کے ساتھ
(کراچی کے ایک بڑے بیوپاری سیٹھ گھمسن مل اور ان کے خاص ملازم کے ساتھ)

کتنی خالی خالی ہے خلوت یار بجن کی
کب تک کریں گے دل کو کتب خانہ



مرزا صاحب آرام کرسی پہ ایستادہ
(سوچ میں مستغرق)

غواصوں کی ریت ہے، ڈھونڈیں بحر عمیق
جائیں گہرے آب میں، لائیں زرو عقیق
کرکے تحقیق، ہیرے ہاتھ تھما دیے



مرزا صاحب اپنے کتب خانے میں
(مرزا صاحب اپنے کتب خانے میں مشغول مطالعہ)

مرزا صاحب اپنے بھائیوں کے ہمراہ (سات بھائی)



بیٹھے ہوئے (دائیں سے بائیں) ۱۔ مرزا قلیچ بیگ (مرحوم) ۲۔ مرزا غلام رضا بیگ (مرحوم) ۳۔ مرزا صادق علی بیگ (مرحوم)
کھڑے ہوئے (دائیں سے بائیں) ۱۔ مرزا نجف قلی بیگ (مرحوم) ۲۔ مرزا علی قلی بیگ (مرحوم) ۳۔ مرزا جعفر قلی بیگ (مرحوم) ۴۔ مرزا حیدر قلی بیگ (مرحوم)

مرزا صاحب انجمن امامیہ (حیدرآباد) کے ممبران کے ساتھ



ہز ہائینس میر کرم علی خان تالپور مرحوم کے مقبرہ میں، انجمن امامیہ (حیدرآباد) کی اوائلی اور بنیادی میٹنگ جس کی صدارت مرزا صاحب (مرحوم) نے کی

کھڑے ہوئے (دائیں سے بائیں)

۱۔ مٹھو مولائی
۲۔ محمد جعفر بیگ
۳۔ غلام رضا بیگ
۴۔ سید جعفر شاہ
۵۔ اللہ ڈنو یونسانی
۶۔ غلام محمد یونسانی

بیٹھے ہوئے (دائیں سے بائیں)

۱۔ قادر داد خان
۲۔ خدا بخش بیگ
۳۔ سید چھٹن شاہ (سینئر)
۴۔ مرزا قلیچ بیگ
۵۔ لطف علی شاہ
۶۔ مولوی حسن علی شاہ سبزواری

آشیانہ ہے املتاس کی ٹہنی کے اوپر میرا — بیٹھ کر وہاں پڑھتا، لکھتا اور سوچتا ہوں میں
بیٹھ کے اس پہ گزارتا ہوں سارا دن — شاعری کرتا ہوں اور درد میں ڈوبتا ہوں میں
وہاں بیٹھے پڑھوں نماز، مصحف اور وظیفے — پھر کھاؤں پیوں، آرام کروں سب وہم بھلا کے



مرزا صاحب کا املتاس کے درخت پر آشیانہ
(اپنے گاؤں والے باغ میں)

مرزا صاحب اپنے بیٹوں، دامادوں، پوتوں اور نواسوں کے ساتھ
(تصویر تاریخ ۳۰، مئی ۱۹۲۷ء)



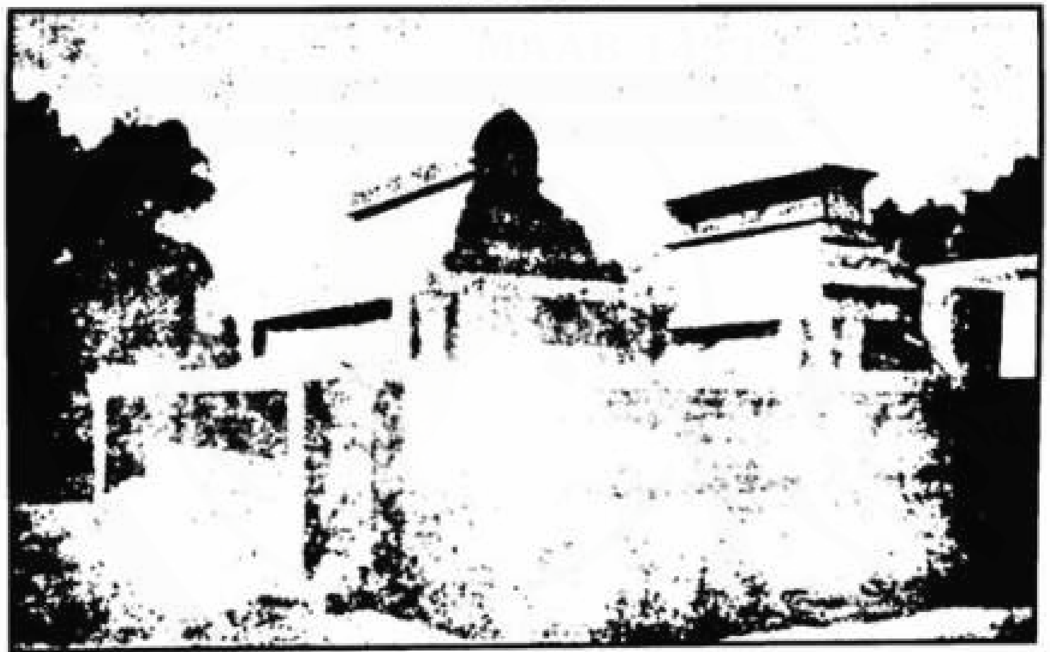
(دائیں سے بائیں) ۱۔ مرزا اسد بیگ ۲۔ مرزا ہمایوں بیگ (مرحوم) ۳۔ مرزا فرہاد بیگ ولد مرزا سلطانی بیگ (مرحوم)
۴۔ شیریں بخت مرزا نادر بیگ (مرحوم) ۵۔ مرزا فیروز بیگ (مرحوم) ولد مرزا سلطانی بیگ (مرحوم) ۶۔ مرزا شمشاد بیگ ولد مرزا سلطانی بیگ (مرحوم)
کرسی پر بیٹھے (دائیں سے بائیں) ۱۔ مرزا نادر بیگ (مرحوم) (اپنے بیٹے خاشن بیگ کے ساتھ) ۲۔ مرزا حیدر قلی بیگ (مرزا صاحب (مرحوم) کے بھتیجے اور داماد اپنی بیٹی بلقیس کے ساتھ)
۳۔ مرزا قیچ بیگ (مرحوم) (اپنے بیٹے مرزا اصغر بیگ (مرحوم) کے ساتھ) ۴۔ مرزا سلطانی بیگ (مرحوم) (مرزا صاحب (مرحوم) کا بھتیجا اور داماد
مرزا نادر بیگ کے چھوٹے بیٹے زائر بیگ کے ساتھ) ۵۔ مرزا اختر بیگ (اپنی بیٹی خیر النساء کے ساتھ)
فرش پر بیٹھے (دائیں سے بائیں) ۱۔ مرزا ادہم بیگ عرف حاجی بابا۔ ۲۔ الحاج مولانا مرزا افضل بیگ۔ ۳۔ مرزا اکمل بیگ۔ ۴۔ مرزا اجمل بیگ ۵۔ مرزا ارشد بیگ عرف جانی بابا
۶۔ مرزا زاہد بیگ ولد مرزا نادر بیگ (مرحوم)۔ ۷۔ مرزا جمشید بیگ ولد مرزا سلطانی بیگ (مرحوم) ۸۔ مرزا ذاکر بیگ ولد مرزا نادر بیگ (مرحوم)۔

مرزا صاحب کی رہائش گاہ کا بیرونی منظر



گاؤں ٹنڈو ٹھوڑو میں مرزا صاحب اور ان کے عزیز و اقارب کی رہائش گاہوں کا بیرونی منظر
(میدان میں میر صاحبان کی حویلی کی بیرونی دیوار اور خستہ حال عمارتیں بھی نظر آ رہی ہیں)

مرزا صاحب کا مدفن



اپنے گاؤں کے قبرستان (بلند شاہ کے مقام پر) مرزا صاحب کی خالی تربت
جو انھوں نے اپنی پہلی اہلیہ کی وفات کے بعد، اُن کی قبر کے بائیں جانب تیار کروائی۔

سوائے شکار موت کے اور کیا کرے ''قلیچ''
گر موت مرجائے تو بن جائے گی حیات جاوداں



مرزا صاحب کی آخری آرام گاہ

پہلا باب

احوالِ آباؤ اجداد

بڑے بزرگ دو ہوتے ہیں۔ ایک دادا اور دوسرے نانا، یعنی ایک والد کے والد اور دوسرے والدہ کے والد۔ میرے والد کا نام مرزا فریدون بیگ تھا۔ مگر میرے دادا کے بارے میں مجھے علم نہیں اور نہ ہی میرے والد اس بابت کچھ جانتے تھے۔ میرے نانا کا نام مرزا خسرو بیگ تھا۔ میرے والد کے بارے میں، میں نے ان ہی کی زبانی فارسی میں لکھا ہے۔ میرے نانا کا احوال بھی فارسی میں لکھا ہوا تھا جس کا میں نے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ احوال مختصراً میری کتاب "سندھ کی تاریخ" (انگریزی) کے علاوہ سرکاری "سندھ گزیٹیر" میں شامل ہے۔ (بارہویں باب میں دیکھیے)۔ سندھ کے بارے میں انگریزوں کی لکھی ہوئی کتاب میں بھی یہ احوال شامل ہے۔ ان کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرے نانا اور میرے والد دونوں دراصل جارجیا یا گرجستان کے دارالحکومت "طفلس" شہر کے باشندے تھے اور اسی نسبت سے "گرجی" یا "جارجین" کہلاتے تھے اور ہم یعنی ان کی اولاد، آج تک "گرجی مرزا" کہلاتے ہیں۔ دیگر مرزا جن کا تعلق ہند یا سندھ سے ہے، مغل یا پھر دوسری ذاتوں سے ہیں۔ اس زمانے میں گرجستان، روس یا رشیا کے بادشاہ کے زیرِ حکومت تھا اور ایران سے جنگ رہنے کی وجہ سے اکثر و بیشتر گرجستان پہ چڑھائی ہوتی رہتی تھی۔ ایک ایسی ہی جنگ میں ۱۷۹۷ء کے قریب، میرے نانا کے والد کے علاوہ میرے والد کے والد بھی مارے گئے اور یہ دونوں، دیگر کئی چھوٹے بڑے گرجی، مردوں اور عورتوں کی طرح ایرانیوں کی قید میں آ گئے، جنھوں نے انھیں اپنے ملک ایران پہنچا دیا جہاں دونوں نے خاصی مدت تک تعلیم حاصل کی۔ دونوں سات، آٹھ سال کی عمر میں گرفتار ہوئے تھے۔ نانا تہران میں رہے

جبکہ والد صاحب پہلے تبریز اور پھر اصفہان میں رہے۔ جن دنوں سندھ کے حکمران میر کرم علی تالپر تھے یہ دونوں سندھ پہنچے۔ پہلے نانا آئے، جو میر صاحب کے وکیل کے ذریعے ایران کے بادشاہ اور وزیر کی معرفت تحفہ بن کر میر صاحب کی خدمت میں پہنچے۔ میر صاحب نے انھیں اپنا لے پالک بنایا کیونکہ وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ نانا ۱۸۰۵ء میں حیدرآباد آئے، اُس وقت ان کی عمر پندرہ برس تھی۔ ان کے بعد والد صاحب دوسرے وکیل کے ساتھ آئے جب ان کی عمر بمشکل دس سال تھی۔ میر صاحب نے ان کو پال پوس کر بڑا کیا اور بڑی عزت دی۔ نانا نے اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ ان کے بارے میں مفصل احوال "سندھ کی تاریخ" اور ان کی سوانح عمری کے ذریعے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ نانا نے ۱۸۶۰ء میں ۸۰ برس کی عمر میں وفات پائی جبکہ والد صاحب کی وفات ۱۸۷۱ء میں ۵۷ برس کی عمر میں ہوئی۔ یہ انگریزوں کا دور تھا۔ نانا کی وفات کے وقت میں تقریباً آٹھ نو سال کا تھا۔ لیکن وہ مجھے آج بھی روزِ روشن کی طرح یاد ہیں۔

انھی دنوں، سندھ میں دو چار مزید گرجی آئے جو میر صاحبان کے پاس رہے۔ مثلاً مرزا محمد باقر بیگ جو بعد میں 'مانجھو' میں بسے، مرزا قربان علی بیگ جو 'ٹنڈو ٹھوڑو' آکر آباد ہوئے اور مرزا یوسف جو حیدرآباد میں میر صاحبان کے مقبروں کے قریب آکر رہے۔

نانا سندھ میں پہلے آئے اور والد صاحب بعد میں۔ والد صاحب ان سے عمر میں چھوٹے تھے۔ دونوں ساتھ رہتے تھے۔ ایک ہی وطن سے تعلق تھا اور ایک ہی مالک کے پاس قدرت نے ملا دیا لہٰذا دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ آخری ایام تک دونوں ساتھ رہے اور ایک دوسرے کی صحبت میں پڑھنے لکھنے کا کام کرتے رہے۔ نانا نے اپنی بیٹی والد صاحب کے عقد میں دی، جن کے بطن سے ہم بہن بھائی پیدا ہوئے۔ میروں کے دورِ حکومت میں وہ دونوں حیدرآباد کے اس قلعے میں رہتے تھے جہاں میر صاحب اور ان کے کنبے تھے۔ ان کی صاحبی کے زوال کے وقت یعنی ۱۸۴۳ء میں، ہمارے عزیزوں کو نئے سرے سے تکالیف سے دوچار ہونا پڑا۔ میر صاحبان کے ساتھ، پہلے نانا مرحوم کو بھی گرفتار کر کے کلکتہ لے جایا جارہا تھا مگر پھر انھیں میروں کی حویلیوں کی دیکھ بھال کے لیے ضروری خیال کر کے وہیں چھوڑنا

ساسب سمجھا گیا۔ جب حیدرآباد کے قلعہ پر انگریزوں نے قبضہ کیا تب ہمارے رشتے دار یعنی والد صاحب، نانا اور ان کے خاندان کے افراد ٹنڈو سائیں داد چلے گئے۔ اس افراتفری میں ہماری اور قلعے کے دیگر رہائشی افراد کی بڑی دولت ضائع ہوئی۔ کچھ سامان اندر سے باہر پھینکنے کی وجہ سے، کچھ دوسروں کے پاس امانت کے طور رکھوانے میں اور کچھ زمین میں دبانے کے سبب۔ ٹنڈو سائیں داد میں کچے گھروں میں جاکر رہنا پڑا جو ایک دن اچانک آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ یہ آگ تین دن تک نہ بجھائی جا سکی اور بڑی مشکل سے لوگ، جان بچانے میں کامیاب ہوئے۔ بہت سا قیمتی مال، کپڑے اور ہیرے جواہرات جل کر راکھ ہو گئے۔ قیمتی موتی بھی بڑی تعداد میں جل کر تباہ ہوئے جن سے ہم بچے بعد میں کھیلتے رہتے تھے۔ آگ لگنے کے واقعہ کے بعد میر کریم علی خان (ا) کے ساتھ والد صاحب اور نانا بھی ٹنڈو میر محمود پھلیلی کے کنارے، یعنی ٹنڈو آغا اور ٹنڈو یوسف کے درمیان آ کر آباد ہوئے۔ اور پھر وہاں سے ٹنڈو ٹھوڑو میں نواب محمد خان ٹھوڑو کی جاگیر چلے آ گئے جہاں ہم لوگ آج تک رہ رہے ہیں۔ وہاں ابھی تک ایک زبوں قلعہ ہے جس میں میر کرم علی خان کے تین کنبے رہتے تھے۔ نانا، والد صاحب اور ان کے دیگر احباب قلعہ کی مغربی سمت رہتے تھے اور اب تک وہیں رہ رہے ہیں۔ میرے بڑے بھائی مرزا غلام رضا بیگ، حیدرآباد کے قلعہ میں ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان سے چھوٹے بھائی مرزا صادق علی بیگ ۱۸۴۵ء میں ٹنڈو سائیں داد میں پیدا ہوئے۔ جبکہ ہم دیگر بھائی ٹنڈو ٹھوڑو میں پیدا ہوئے۔

جب تک نانا مرحوم حیات تھے، والد صاحب مرحوم زیادہ تر وقت ان کی صحبت میں گزارتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ نانا بیماری کی وجہ سے برسہا برس بستر علالت پر رہے۔ نانا کی وفات کے بعد والد صاحب بکھرے بکھرے رہتے تھے مگر ان کے دوست و واقف کار، آغا زین العابدین شاہ اور دیگر دوستوں اور ان کے بچوں کی وجہ سے ان کا دل قدرے بہل جاتا تھا۔ باغبانی کے شوقین تھے، لکھنے پڑھنے کا کام بے تحاشہ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف فنون میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے اخلاق و اوصاف کی تفصیلات کا خاصا ذکر اُس تاریخی قصیدے میں موجود ہے جو میں نے ان کی وفات پر لکھا تھا۔ اس کے علاوہ یہ قصیدہ میری

کتاب میں بھی موجود ہے۔ حالانکہ والد صاحب نوکری پیشہ نہ تھے اور نہ ہی کوئی خاص ذریعۂ آمدنی تھا اس کے باوجود ایسی حکمتِ عملی سے گھر کا نظام چلاتے تھے کہ وقت بڑی آبرومندی سے گزرتا تھا۔ ان دنوں خوشحالی تھی ہر چیز سستی میسر تھی، جمع شدہ زیورات و جواہرات وقتاً فوقتاً فروخت کیا کرتے مگر قرض لینے سے اجتناب برتتے تھے۔ اگر انگریز سرکار کی نوکری کرنا چاہتے تو یقیناً باعزت ملازمت حاصل کر لیتے کیونکہ انگریز سرکار کی طرف سے بارہا اس خواہش کا اعادہ ہوا تھا مگر نانا اور والد صاحب دونوں نے نوکری کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ جب ۱۸۷۶ء ہماری والدہ کی وفات ہوئی اس وقت ہم آپس میں سات بھائی اور دو بہنیں تھے اور سب ایک ساتھ رہتے تھے۔ بھائی مرزا غلام رضا بیگ کی شادی، والد صاحب نے اپنی زندگی میں ہی ہمارے پڑوسی میاں ابراہیم کی بیٹی سے کروائی تھی۔ اس خاتون کے انتقال کے بعد، بھائی کی دوسری شادی، امی نے مرحوم مرزا قربان علی بیگ کی بیٹی سے کروائی۔ میرے چھوٹے بھائی مرزا علی قلی بیگ کی شادی مرزا رستم (مقبرے والے) کی دختر سے امی کی زندگی میں ہی انجام پائی۔ ہم سب بقیہ بہن بھائیوں کی شادیاں بعد میں ہوئیں۔

پہلے میرے دونوں بڑے بھائی اور میں ٹنڈو ٹھوڑو میں محمد شفیع آخوند کے پاس پڑھتے تھے مگر بعد میں بڑوں کے صلاح و مشورے کے بعد، نانا کی زندگی ہی میں، میرے دونوں بڑے بھائیوں کو انگلش میڈیم اسکول میں داخل کروایا گیا۔ مسٹر وشنو گھنشام مرہٹہ اس وقت وہاں کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد دونوں نے بمبئی کے ایلفنسٹن کالج میں داخلہ لے لیا۔ ہم چھوٹے پہلے تو حیدرآباد کے سندھی میڈیم اسکول میں پڑھے پھر انگلش میڈیم اسکول میں داخلہ لیا۔ ان باتوں سے اندازہ لگائیے کہ والد صاحب کو ہماری تعلیم کی کس قدر فکر تھی اور کس درجہ کوشش کی۔ کم وسائل کے باوجود انھوں نے ان انتظامات کو خوش اسلوبی سے پورا کیا۔ اس وقت مسلمان خاندان نہ صرف انگریزی بلکہ سندھی تعلیم حاصل کرنا بھی عار سمجھتے تھے۔ لوگ حیرت کا اظہار کرتے تھے کہ زیادہ آمدنی نہ ہونے کے باوجود ہم یہ تمام تر بندوبست کس طرح کرتے تھے۔ اس وقت کے اشارات، میرے ناول "زینت" کے مطالعے سے بھی معلوم کیے جا سکتے ہیں۔

والد صاحب کی وفات سے کچھ عرصے قبل یعنی ان کی بیماری کے دوران، بھائی مرزا غلام رضا بیگ کالج چھوڑ آئے جبکہ مرزا صادق علی بیگ وہاں رہے کیونکہ وہ وہاں پرشن فیلو تھے مگر ابھی دونوں برسر روزگار نہ تھے۔ امی کی وفات کے وقت میرے دونوں بڑے بھائی گھر پہ موجود تھے جبکہ میں بمبئی کالج میں زیر تعلیم تھا۔ میں امی کے انتقال کے تیسرے دن وہاں پہنچا اور سوگ اور سوئم میں شریک ہوا۔ امی شروع میں صرف قرآن کریم پڑھنا جانتی تھیں مگر آخری ایام میں انھیں فارسی اور سندھی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا اور لکھنا بھی سیکھیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کا رسالہ خوب پڑھتی تھیں اور ہمیں اچھے خاصے خطوط لکھا کرتی تھیں۔ امی نہایت شاندار، رعب و دبدبے والی تجربہ کار اور سمجھدار خاتون تھیں۔ ان میں نانا مرحوم کی طرح ہمت و جرأت تھی۔ گھریلو امور سے لے کر رسوم و رواج کی بجا آوری کے لیے، عزیز و اقارب سے لے کر محلے پڑوس کے لوگ ہمیشہ ان سے صلاح و مشورہ کرتے۔ شاید ہی کسی ماں کو اپنی اولاد سے اتنی محبت ہو جتنی امی کو ہم سے تھی۔ والد صاحب کا بھی یہی حال تھا۔ شادی کے بعد اُن کی اولاد زندہ نہ بچ پاتی تھی لہٰذا جب بھائی غلام رضا بیگ پیدا ہوئے تو ان کے لیے خوشی کے شادیانے بجائے گئے۔ خوب رسومات ہوئیں بلکہ مقامی باشندوں کے کہنے پر ان کی ناک میں نتھلی بھی ڈالی گئی تاکہ بچہ لڑکا لگنے کے بجائے لڑکی لگے اور نظر بد سے محفوظ ہو کر کسی طرح زندگی پا جائے۔ غالباً اسی وجہ سے انھیں بچپن میں ''نتھو'' کے نام سے پکارا جاتا تھا یعنی ''نتھ والا''۔ اور جب میرے والدین کثیر الاولاد ہوئے تب بھی انھوں نے تمام بچوں سے یکساں طور پر محبت کی۔ سات بیٹوں اور دو بیٹیوں کے بعد جب اللہ نے ایک بیٹا اور عطا کیا جو پیدائش کے فوراً بعد رضائے الٰہی سے انتقال کر گیا تب بھی میرے والدین نے بڑے دکھ کا اظہار کیا اور کہتے رہے کہ کاش یہ بچہ زندہ رہتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ امی کی محبت کی ایک مثال مجھے یاد ہے۔ جب ہم اسکول پڑھنے جاتے تھے تو پہلے جمعہ نامی ایک ملازم اور پھر خمیسو نامی دوسرا ملازم ہمارے ساتھ جایا کرتے تھے۔ وہ سارا دن وہاں اسکول میں بیٹھتے اور شام کو ہمارے ساتھ واپس آیا کرتے تھے۔ ایک دن شام کو ذرا دیر ہو گئی اور ہم روزمرہ کے طے شدہ وقت پر گھر نہ پہنچ سکے۔ سورج ڈوب گیا۔ راستے میں بازیگری کے

کرتب دیکھ رہے تھے کہ کسی جیب کترے (پاکٹ مار) نے میری جیب سے چار آنے نکال لیے۔ کسی پولیس والے نے اسے یہ حرکت کرتے دیکھ لیا اور جا پکڑا۔ ہمیں پولیس تھانے جانا پڑا۔ اس وجہ سے دیر ہوگئی۔ یہ خبر شاید ہم سے پہلے ہی گھر پہنچ چکی تھی۔ امی بیچاری، ایک تو دیر کی وجہ سے، دوئم پولیس کا سن کر، اس قدر پریشان ہوئیں کہ میرے آنے کا سن کر بدحواس ہوکر باہر والے دروازے تک پہنچیں اور مجھے گلے لگالیا۔ گلے میں بازو ڈال کر، بوسے دیتیں اندر لے گئیں۔ اس وقت انھیں نوکروں کا بھی دھیان نہ رہا۔ میں اپنے ماں باپ کی محبت کی ایسی بے شمار مثالیں آپ کو دے سکتا ہوں۔

والدہ کی وفات کے وقت صرف بڑے بھائی نوکری پیشہ تھے اور حیدرآباد کے ہائی اسکول میں فارسی پڑھاتے تھے۔ ان کی تنخواہ ۸۰ روپے ماہانہ تھی۔ یہ رقم ہمارے گزارے کے لیے کافی ہوتی تھی۔ امی کو ہماری دو بہنوں کی شادی کی بڑی فکر رہتی تھی۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ جس طرح اپنی زندگی میں انھوں نے اپنے دو بیٹوں کے سر پر سہرا دیکھا اسی طرح اپنی بیٹیوں کے فرض سے بھی سبکدوش ہوں مگر قسمت میں یوں نہ لکھا تھا۔ دونوں بہنوں کی شادیاں ان کی وفات کے بعد ہوئیں۔ الحمدللہ اس کے علاوہ انھیں کوئی فکر دامن گیر نہ تھی۔ ہر وقت اللہ سے پرُامید رہتیں کہ ان کے بیٹوں میں سے کچھ اتنے ذمے دار ہو چکے ہیں کہ خود سے چھوٹوں کو سنبھال لیں گے۔

اسی طرح والد مرحوم بھی وقتِ وصال بالکل خوش و مطمئن تھے اور اللہ سے امید کرتے تھے کہ چوں کہ بڑے بیٹے قابل اور صالح ہیں لہٰذا چھوٹوں اور گھر کو خوش اسلوبی سے سنبھال لیں گے۔ والد صاحب کی وفات کے وقت میں ان کے پاس موجود تھا جبکہ دونوں بڑے بھائی بمبئی میں تھے۔ مجھے یاد ہے ان کے انتقال سے چند ثانیے قبل امی نے گہرے دکھ کے ساتھ پوچھا تھا "آپ خود تو جارہے ہیں، مجھے اور بچوں کو کس کے سپرد کررہے ہیں؟ محلے پڑوس و عزیز و اقارب کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں۔"

اس پر بولے، ''تم سب کو اللہ کے حوالے کر کے جا رہا ہوں۔ اس بات کا مجھے کامل یقین و اطمینان ہے۔''

آخر دم تک مکمل ہوش و حواس میں تھے۔ بوقتِ رخصت میرے بھائیوں کو بہت یاد کیا اور اشارے کی مدد سے بھائیوں کی تصویر جو سامنے دیوار پر آویزاں تھی، طلب کی، تصویر ہاتھ میں لے کر مسکرائے اور ایک دم لیٹ گئے۔ اسی حال میں دم سپردِ الٰہی کیا، یوں کہ لبوں پر مسکراہٹ نقش ہوگئی جو کہ بوقتِ غسل بھی ان کے چہرے پر دیکھی جا سکتی تھی۔ والد صاحب کو اولاد سے اس قدر محبت تھی کہ جب بھی میرے دونوں بھائی بمبئی آتے جاتے، تب اکثر خود ان کے ساتھ جاتے تھے۔ کوٹری سے، کراچی جانے کے لیے ریل کے سفر کا آغاز ان دنوں بس شروع ہوا ہی تھا۔ خود کبھی کوٹری تک اور کبھی کراچی تک جاتے تھے۔ اس کے علاوہ جب دونوں بھائی واپس آتے تب بھی انھیں لینے کے لیے وہاں تک جاتے تھے۔ ہمیشہ ان کے خطوط کا انتظار کرتے اور بڑی خوشی سے انھیں فارسی میں خط لکھا کرتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار بھائی مرزا صادق علی بیگ کا عربی زبان میں لکھا ہوا خط ان کے پاس پہنچا۔ میرے بھائی ان دنوں کالج میں عربی زبان پڑھ رہے تھے۔ موسم گرما کی دوپہر کا وقت تھا۔ یہ خط پڑھ کر اس قدر خوش ہوئے کہ آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ ایک دم تیار ہوکر محمد شفیع آخوند کے پاس گئے جو گاؤں کے مکتب میں استاد تھے۔ میں بھی والد صاحب کے ساتھ تھا۔ آخوند عربی جانتے تھے۔ والد صاحب نے انھیں خط دکھایا، آخوند صاحب نے خط پڑھا اور بے حد تعریف کی۔ کچھ دیر بعد ہم لوگ گھر واپس آئے اور والد صاحب نے اس خط کا جواب عربی زبان میں ہی لکھ کر بھیجا۔

بھائی مرزا غلام رضا بیگ کی پہلی شادی سے کچھ عرصہ قبل والد صاحب بمبئی گئے تھے اس وقت تک آگبوٹ (Steamers) نہیں تھے لہٰذا جہاز کے ذریعے گئے۔ نانا مرحوم ان دنوں بقید حیات تھے انھوں نے بھی بمبئی سے خاصا سامان اور کپڑا وغیرہ منگوایا تھا کیونکہ ان کے بیٹے مرزا غلام مرتضٰی کی شادی ہونا تھی۔ ایک نوکر ہمراہ تھا۔ دو چار مہینے وہاں رہنا پڑا۔ ان

کی غیر حاضری میں، نانا مرحوم اپنے بیٹے یعنی ہمارے ماموں مرزا محمد رحیم بیگ کو ہمارے گھر رات کو رکنے کے لیے بھیجتے تھے۔ ۱۸۵۸ء میں بابا کی غیر موجودگی میں بھائی جعفر قلی کی پیدائش ہوئی۔ والد صاحب کو بذریعہ خط مبارکباد بھیجی گئی تھی۔ نانا مرحوم کو ہماری والدہ سے لے کر، ان کی اولاد یعنی ہم سب سے نہایت محبت تھی جو کسی طرح بھی اس محبت سے کم نہ تھی جو انھیں اپنی سگی اولاد سے تھی۔ اشیاء وتحائف جب بھی ان کے پاس آتے، وہ ہمیں بھی اپنے بیٹوں اور پوتوں کے ساتھ بلاتے، اپنے سامنے بٹھا کر سب کو یکساں تقسیم کرتے۔ جب باغات سے پھل وغیرہ آتے تب وہ بھی ہمارے گھر بھیجے جاتے۔

ہماری نانی، نانا مرحوم کی بیماری کے دوران ان کی بہت خدمت کرتی تھیں۔ توشہ خانہ ان کے حوالے تھا۔ نانا ایک قابل حکیم تھے اور بلا معاوضہ دوائیں دیا کرتے تھے۔ بیرونِ ملک سے بھی دوائیں منگوایا کرتے اور خود بھی دوائیں بنوایا کرتے تھے۔ اس کام میں نانی ان کی بڑی مدد کیا کرتی تھیں اور ان کے بتائے گئے نسخہ جات کے مطابق طرح طرح کے معجون، حلوے، روغن موم اور عرق تیار کیا کرتی تھیں۔ اس کام میں بے پناہ دلچسپی کے سبب خود بھی طبیبن (حکیمہ) بن گئیں۔ زیادہ تر وقت نماز اور قرآن میں مشغول رہتی تھیں۔ گاؤں کی عورتیں دوادارو کے لیے ان کے پاس آتی تھیں۔ فرصت کے لمحات میں سلائی، کڑھائی کا کام بھی کرتی تھیں۔ نانا کے انتقال کے بعد نانی ہماری طرف ہی آ گئیں مگر ہمیشہ، کپڑا لتا، کھانا پینا اپنے خرچ سے کرتی تھیں کہ کہیں لوگ یہ نہ کہیں کہ داماد کے گھر آ پڑی ہے اور ان کا کھا پی رہی ہے۔

پہلے ذکر آ چکا ہے کہ والد صاحب کے پاس زیادہ دولت نہ تھی۔ والد صاحب کی وفات کے بعد امی، بڑی بہن اور ہماری دو ملازمائیں یعنی دائی گھمن (جو حبشن تھی) اور دائی زعفران (جو شیدی النسل تھی) گھر کے کام کاج میں مشغول رہتی تھیں۔ امی اور بڑی بہن سلائی اور زری دھاگے کا کام اچھا کرتی تھیں۔ اس کام سے اچھی خاصی آمدنی ہوتی تھی۔ وہ اس نوعیت کی محنت کو عیب نہیں سمجھتی تھیں۔ اپنے ہاتھ سے چرخا کاتتی تھیں، کپاس سے بنولے علیحدہ کرتیں بلکہ کبھی کبھی تو چکی بھی پیستیں تھیں اور کھانا بھی پکاتی تھیں۔ کم آمدنی کے باعث جس

قدر ممکن ہوتا ای اور والد صاحب کفایت شعاری اور قناعت سے کام لیتے تھے۔ والد صاحب اپنے ہاتھوں سے بچوں کے لیے ٹوپیاں سیتے اور بعض اوقات اپنے لیے کپڑے بھی خود ہی سیتے تھے۔ اس کفایت اور قناعت کو دیکھتے ہوئے کچھ اہل محلہ اور رشتے دار ہنستے اور طنز بھی کرتے تھے مگر ہم میں سے کوئی اس طرف توجہ نہ کرتا تھا۔ اکثریت کو تو حیرت ہوتی تھی کہ کس طرح یہ لوگ اندرونِ خانہ بلکہ گھر سے باہر بھی عزت آبرو سے رہ رہے ہیں۔ اندرونِ گھر اور باہر کے لیے ملازم بھی رکھتے ہیں، کپڑے بھی اجلے پہنتے ہیں، بچے بھی اسکول جاتے ہیں بلکہ بمبئی تک تعلیم کے حصول کے لیے جاتے ہیں، شادی مرادی میں حسبِ دستور مناسب پیسہ یا تحفہ بھی دیتے ہیں اور میل ملاپ بھی رکھتے ہیں۔

والد صاحب کی ایک بیٹھک ہوا کرتی تھی جب وہ زبوں ہوگئی تو وہ نانا مرحوم کی بیٹھک میں صبح وشام جا کر بیٹھتے، کتاب پڑھتے اور لوگوں سے میل ملاقات کرتے تھے۔ کبھی کبھی میاں عافیت حبشی ناظر کی بیٹھک میں شطرنج اور چوپان بھی کھیلا کرتے تھے۔ ان دونوں کھیلوں میں وہ ماہر تھے۔ دور دور سے ماہر استاد کھلاڑی ان کے پاس یہ دونوں کھیل کھیلنے کے لیے آتے تھے۔ جب میر حسن خان کلکتہ سے لوٹ آئے تو انھوں نے والد صاحب کو ۳۵ روپے ماہانہ دینا شروع کیا جو اس دور میں معقول رقم شمار کی جاتی تھی۔ اس کے عوض والد صاحب کبھی کبھار میر صاحب سے ملنے چلے جایا کرتے تھے اور کبھی میر صاحب کی کوئی کتاب بھی نقل کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد والد صاحب نے اپنے گھر کے مغربی حصے میں نئی بیٹھک بنوائی اور گھر کا بیرونی دروازہ بھی مشرق کے بجائے مغربی حصے میں بنوایا جہاں آج تک ہے۔ اس بیٹھک کو بھائی مرزا علی قلی بیگ نے، شادی کے بعد اپنا گھر بنالیا اور بھائی غلام رضا بیگ اور صادق علی بیگ نے اس گھر کے داہنی جانب ایک نئی بیٹھک بنوائی جو اب تک موجود ہے۔

والد صاحب صبح صادق کے وقت اٹھتے تھے۔ نماز، قرآن اور وظیفے پڑھنے کے بعد آٹھ نو بجے کے قریب تیار ہو کر گھر سے باہر نکلتے۔ گھر کے اندر ان کے لیے ایک وسیع جگہ مخصوص تھی۔ ابتدائی دنوں میں وہ میروں کی طرز پر سندھی ٹوپی لگایا کرتے تھے۔ مگر بعد میں لنگی

کی پگڑی باندھنے لگے۔ اپنے بالوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ سر کے درمیانی حصے پر بال ذرا کم تھے، کچھ بال سفید ہو گئے تھے مگر انھیں نکلواتے تھے نہ رنگواتے اور نہ ہی بال کٹواتے تھے۔ باہر نکلتے وقت عام طور پر اپنے ہمراہ کتاب لیا کرتے تھے اور جہاں بیٹھتے مطالعہ کرنے لگتے۔ باغ لگانے کے بڑے شوقین تھے۔ پرانی پھلیلی کے کنارے، گاؤں کے شمالی جانب ایک باغ لگایا جس میں روزانہ جا کر اپنے ہاتھوں سے کام کرتے اور باغبان سے بھی کام لیا کرتے تھے۔ بڑا عمدہ باغ تیار ہوا تھا جسے بعد میں فروخت کر دیا۔ اب وہاں زرعی زمین ہے جس میں ابھی تک اس باغ کے کچھ درخت بطور نشانی موجود ہیں۔ بعد میں اس باغ کے قریب بھائی مرزا صادق علی بیگ نے نیا باغیچہ لگایا جو اب تک موجود ہے۔

دوپہر سے ذرا قبل والد صاحب گھر آتے۔ گرمیوں کے دنوں میں کھانا کھانے کے بعد قیلولہ کرتے۔ نماز پڑھ کر پھر باہر جاتے اور شام کو گھر لوٹتے تھے۔ عشاء تک نماز اور وظیفہ میں مشغول رہتے۔ پھر کھانا کھا کر سو جاتے۔ سوتے وقت حقہ پیتے تھے مگر حقے کو بڑا ستھرا اور نفیس رکھتے۔ اپنے ہاتھ سے گوٹ بنا کر، اس پر انگارے سلگا کر کش لگاتے تھے۔ امی اور نانی بھی حقہ پیتی تھیں۔ نانی ناس بھی لیتی تھیں۔ والد صاحب کو کبوتر اور دیگر پرندے پالنے کا بڑا شوق تھا۔ عمدہ عمدہ کبوتر حاصل کرتے تھے۔ پنچھی، قمریاں، طوطے اور طرح طرح کے پرندے ان کے پاس تھے۔ نانا مرحوم کو بھی یہ شوق تھا۔ والد صاحب کو ہنر سیکھنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ سلائی، کڑھائی تو جانتے ہی تھے مگر بڑھئی کے کام سے بھی واقف تھے اور اس کام کے تمام اوزار ان کے پاس موجود تھے۔ جنڈی کا کام بھی سیکھا اور لکڑی سے مختلف اشیاء بھی بناتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی جنڈی کا کام بھائی مرزا غلام رضا بھی سیکھے اور پھر میں نے بھی سیکھا۔ باغ میں چھوٹے کدو بو کر ان سے ناس کے لیے چھوٹی چھوٹی ڈبیاں بناتے۔ بیلوں پہ لگے رہنے کے دوران ہی ان کدوؤں پر لوہے کے تار کے خول بنا کر چڑھا دیتے جس سے کدو دو لخت ہو جاتے۔ بعد میں انھیں بیل سے علیحدہ کر کے، ان پر نقش و نگار بنا کر، رنگ کر کے، عمدہ تحفوں کی حیثیت دے کر فروخت کرتے۔ نقاشی، پتنگ سازی اور قینچی سے کاغذ کترنے کا کام

بھی بڑی نزاکت سے کرتے۔ عمدہ پتنگ بنا کر ان پر بڑے عجیب پھول کاٹ کر لگایا کرتے۔ میر حسین علی خان کو ان کے بیٹے میر نور محمد کے لیے ایک بڑی پتنگ بنا کر دی جس پر بڑا دلکش کام کیا ہوا تھا۔ اس پتنگ کے درمیان ایک بڑے سائز کا مور کاٹ کر چپکایا گیا تھا جو اپنی دم پھیلائے کھڑا تھا۔ پوری پتنگ پر کاغذوں اور پھولوں کا نازک کام تھا۔ یہ اس قدر خوبصورت اور نفیس پتنگ تھی کہ میر صاحب نے اسے اڑانے نہ دیا بلکہ اپنے بنگلے میں آویزاں کر دیا جہاں لوگ آ کر دیکھتے اور تعریف کرتے۔ والد صاحب راگ کے بھی شوقین تھے۔ خود بھی اچھا خاصا گانا، گانا جانتے تھے۔ جوانی میں تنبورہ اور کچھ دوسرے ساز بجانے کا شوق بھی رکھتے تھے۔ فارسی اور عربی نہایت خوبصورتی سے لکھا کرتے تھے اگرچہ لکھتے سے بوجۂ رعشہ ہاتھ کانپتا تھا اس کے باوجود بڑے اچھے خوش نویس تھے۔ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآنِ حکیم کا نسخہ اور دیگر کتب ابھی تک موجود ہیں۔ طبابت کا شوق تھا۔ طب کی کتابیں پڑھتے اور دوائیں بنایا کرتے۔ علمِ رمل جانتے تھے۔ فال نکالتے اور تعویز بھی لکھا کرتے تھے۔ اشعار پڑھنے کے بڑے شوقین تھے۔ ساری عمر اسی میں گزاری۔ بہت سے شعراء کو پڑھا۔ اکثر نانا مرحوم کے ساتھ شاعری پڑھتے اور مشکل اشعار کے مفہوم پر آپس میں بحث و مباحثہ کرتے۔ ان کا اپنا فارسی کلام بھی موجود ہے۔ والد صاحب، نانا مرحوم اور کچھ دیگر گرجی مرزاؤں کے اشعار میں نے ''گرجی نامہ'' میں شامل کیے ہیں۔ نانا مرحوم کی وفات کا تاریخی قصیدہ، جو ان کے مقبرے کے کتبے پہ نقش ہے، والد صاحب کا کہا ہوا ہے۔ والد صاحب اور دیگر عزیزوں کی وفات کی تاریخیں، میری کہی ہوئی ہیں جو کہ میری کتاب ''سودائے خام'' میں موجود ہیں۔ والد صاحب خوش طبع آدمی تھے سب سے خوش خلقی سے پیش آتے۔ مہمان نواز تھے بالخصوص ترکوں اور ایرانیوں سے میل ملاقات نہایت پسند کرتے تھے۔ گولڈ سمتھ صاحب (جو اسسٹنٹ کمشنر ہونے کے ساتھ ساتھ جاگیرات کے علاوہ تعلیم کا محکمہ بھی سنبھالتے تھے) کے ساتھ ان کی خاصی دوستی تھی۔ ان سے خط و کتابت بھی کرتے تھے۔ نانا مرحوم کی زندگی میں گولڈ سمتھ صاحب، کمشنر صاحب، تروٹ صاحب، راس بورن یا فلپس کلکٹر صاحب اور دیگر افسران نانا کے پاس آتے

تھے، والد صاحب بھی ان کی صحبت میں وقت گزارتے تھے۔ ان ہی کے مشوروں سے والد صاحب نے میرے دونوں بڑے بھائیوں کو انگریزی پڑھوانا شروع کیا تھا۔ ہندو دیوان صاحبان کی اکثریت سے بہت گہرے مراسم تھے مثلاً دیوان چندی رام ٹلٹی والے، دیوان شو قیرام حیدرآباد والے اور دیوان ٹوپن مل، ٹنڈو آغا والے اور دیگر۔ (باب ۱۲ کا ۳ سے ۷ تک انتخاب ملاحظہ کیجیے) والد صاحب حالانکہ کرسچن یعنی عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور میروں کے پاس آ کر اسلام قبول کیا تھا مگر تعصب سے بالاتر رہے۔ اثناء عشری شیعہ مسلک سے تعلق تھا مگر کبھی صحابۂ کرام کی شان میں گستاخی نہ کی۔ تصوف کی طرف جھکاؤ زیادہ تھا۔ محرم کے دنوں میں ماتم کرتے اور مرثیے پڑھتے۔ پہلے ترکی زبان میں گفتگو کرتے تھے کیونکہ نانا مرحوم بھی یہی زبان بولتے تھے۔ ایران میں قیام کے دوران عربی و فارسی میں خوب مہارت حاصل کی۔ یہاں آ کر سندھی زبان سیکھی اور عمدگی سے بولتے تھے اگرچہ کچھ قدیم سندھی الفاظ اچھی طرح ادا نہ کر سکتے تھے اور تذکیر و تانیث کے صیغے کو برتنے میں بھی غلطی کر جاتے تھے۔ خادموں اور خادماؤں سے گفتگو کرتے وقت والد صاحب مکرانی زبان بھی بول اور سمجھ لیتے تھے جو مجھے بھی آج تک تھوڑی بہت آتی ہے۔ نانا اور والد کے متعلق زیادہ معلومات ان کی سوانح عمریوں کے مطالعے سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

میرے سب سے بڑے بھائی مرزا غلام رضا بیگ، حیدرآباد ہائی اسکول میں فارسی پڑھاتے تھے۔ اس کے بعد وہ میرپور خاص اور ٹنڈو محمد خان میں میر صاحبان کے بچوں کے استاد بنے اور پھر ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ اسی عہدے پہ متمکن تھے کہ اچانک کراچی میں ۱۸۹۵ء میں وفات پا گئے۔ ان کا جسد خاکی حیدرآباد میں دفن کیا گیا۔

میرے دوسرے بھائی مرزا صادق علی بیگ جو ایلفنسٹن کالج کے پہلے تحصیل یافتہ مسلمان گریجویٹ تھے، پہلے شکارپور میں ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر بنے، پھر کراچی میں ڈیپو کے کیوریٹر اور ایجوکیشنل ٹرانسلیٹر رہے۔ سرکاری اخبار "سندھ سدھار" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی ذمہ داری نبھائی، اس کے بعد ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر مقرر ہوئے۔ محکمۂ تعلیم کے لیے

سندھی ڈکشنری کے علاوہ دیگر کئی کتب سندھی زبان میں لکھیں۔ تیس سال نوکری کرنے کے بعد پنشن مقرر ہوئی اور "خان صاحب" کا لقب ملا۔ مرزا حیات کے انتقال کے بعد انھیں ایلفنسٹن کالج میں فارسی پروفیسر کے عہدے کی پیشکش ہوئی مگر بمبئی جا کر رہنا قبول نہ کیا۔ ۱۹۱۲ء میں اپنے گاؤں میں وفات پائی۔

میرے دونوں بھائیوں کے ضمن میں یہ لکھنا ضروری ہے کہ بھائی مرزا غلام رضا بیگ فارسی زبان کے ماہر تھے۔ شاعری اور راگ سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ سندھی زبان میں کافی شاعری کی۔ اس کے علاوہ زمینداری کا شوق بھی تھا، کافی زمین خریدی اور اسے آباد کرنے کے لیے بے تحاشہ محنت کرتے تھے۔ بھائی مرزا صادق علی بیگ، چھوٹی عمر سے ہی نقاشی کا شوق رکھتے تھے۔ لہٰذا کالج کی پڑھائی کے دوران بمبئی کے آرٹس اسکول میں ڈرائنگ اور نقاشی بھی سیکھے۔ ستار بجا لیتے تھے۔ پرندے پالنے کے شوق کی وجہ سے مرغ، کبوتر، قمریاں، مور، بلبل اور تیتر پالتے تھے۔ پرندوں اور جانوروں کا شکار بھی کرتے۔ خاصے اچھے نشانہ باز تھے۔

ایک بار بندوق چلاتے، ان کی ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی جو ڈاکٹروں نے جوڑی۔ محکمۂ تعلیم میں ایسی انصاف پسندی سے کام کیا کہ سب ہندو اور مسلمان اساتذہ انھیں پسند کرتے تھے۔ انسپکٹر سے لے کر ڈائریکٹر تک ان پر ہمیشہ مہربان رہے۔

میرے چوتھے بھائی، مجھ سے چھوٹے، مرزا علی قلی بیگ بھی محکمۂ تعلیم میں پہلے فارسی کے استاد تھے پھر ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر بنے۔ ۱۹۰۲ء میں ریٹائرمنٹ سے قبل ہی وفات کر گئے۔

ان سے چھوٹے مرزا جعفر قلی بیگ تھے جنھوں نے پہلے بمبئی میڈیکل کالج کا ایل۔ ایم۔ ایس کا امتحان پاس کیا۔ اپنی ذہانت کے باعث نامور ہوئے۔ پھر لندن جا کر تعلیم حاصل کی اور وہیں شادی کی۔ واپس سندھ آ کر کراچی میں ہسپتال کھولا اور شہرت حاصل کی۔ دوبارہ ولایت گئے۔ ۱۸۹۸ء میں طاعون میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔ بھائی جعفر قلی بیگ کے

بارے میں یہ ذکر ضرور کرنا چاہوں گا کہ ایک بار جب وہ اسکول میں زیر تعلیم تھے، بیمار پڑ گئے۔ گال پر پھنسی نکل آئی جو اس طرح پھٹی کہ گال کے آر پار سوراخ ہو گیا۔ بیماری کی وجہ سے کافی مہینے ڈاکٹروں کے زیر علاج رہے۔ اس بیماری کے دوران جو تکلیف انھوں نے دیکھی اور جو اخراجات آئے، اس بناء پر انھوں نے ارادہ کیا کہ وہ ڈاکٹر بن کر لوگوں کا علاج کریں گے لہٰذا آخر کار میٹرک پاس کرنے اور ''ایلس پرائیز'' جیتنے کے بعد میڈیکل کالج میں داخلہ لیا اور پھر ولایت گئے۔ ڈاکٹر مرزا اور ان کے خاندان کا کچھ ذکر مسٹر ہیرا نند کی انگریزی میں قلمبند سوانح عمری میں موجود ہے۔ ان دونوں نے ساتھ مل کر کراچی میں ہسپتال کھولا تھا اور آپس میں گہرے دوست تھے۔ یہ سوانح عمری مسٹر دیارام گدومل کی لکھی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر مرزا بھی نقاشی کا کام جانتے تھے۔ اس کے علاوہ انگریزی اور دیسی راگ کی اچھی سوجھ بوجھ کی وجہ سے دونوں قسم کے ساز اچھے بجا لیتے تھے۔

ان سے چھوٹے بھائی مرزا نجف قلی بیگ، انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ میں اوورسیئر تھے۔ وہ بہت تجربہ کار اور ذہین آدمی تھے۔ ان کی زندگی کے آخری ایام قیمر میں گزرے جہاں دوران ملازمت نمونیا کی وجہ سے بیمار ہو گئے۔ انھیں یہاں لایا گیا اور ۱۸۹۱ء میں ان کی وفات ہوئی۔ بھائی نجف قلی بڑے پر ہمت۔ جواں مرد تھے۔ بھاری بھر کم اوزان اٹھا لیتے تھے۔ بڑھئی اور لوہار کا کام بھی جانتے تھے۔ لوہے پر مینا کاری کا کام اوباڑو کے علاقے سے سیکھا۔ گاتے بھی اچھا تھے۔

ان سے چھوٹے، یعنی ساتویں بھائی مرزا حیدر علی قلی، پہلے ڈاکٹر مرزا کے اسسٹنٹ رہے اور ان کا ہسپتال چلاتے تھے۔ اس کے بعد سیہڑ میں جیلر مقرر ہوئے اور پھر پولیس میں سب انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۸۹۱ء میں وفات ہوئی۔ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں چھوٹے بھائیوں نے ایک ہفتے کے اندر، ایک ہی مرض میں وفات پائی۔ پہلے چھوٹے حیدر قلی اللہ کو پیارے ہوئے اور پھر بڑے نجف قلی۔ نجف قلی کو یہ بیماری بھائی کی تیمارداری کے دوران لگی۔ ان دونوں نے شادی نہ کی تھی اور عین جوانی میں قضا انھیں لے گئی۔

میری بڑی بہن فارسی اور سندھی اچھی طرح جانتی تھیں۔ سلائی کڑھائی کے کام میں ماہر تھیں ان کی شادی مرزا علی محمد بیگ کے بیٹے مرزا کلب علی بیگ سے ہوئی جو ڈپٹی کلکٹر تھے۔ دوران ملازمت ۱۹۱۹ء میں انھوں نے وفات پائی۔ بہن کا نام زیب النساء تھا۔ وہ شعر بھی کہتی تھیں:۔ زیب النساء شاہزادی شاعرہ، تخلص "مخفی" کی غزل کے جواب میں انھوں نے ایک اچھی خاصی فارسی غزل کہی تھی۔ (گیارھواں باب دیکھیے)

میری دوسری بہن کی شادی ماموں مرزا ولی محمد بیگ کے بیٹے مرزا حسین قلی بیگ کے ہمراہ ہوئی جو افسر محصولات کے عہدے پر فائز رہتے ہوئے بیمار پڑے، چھٹی لی اور ۱۹۱۱ء میں وفات پا گئے۔

نانا مرحوم کے بیٹوں میں سے بڑے بیٹے خان بہادر مرزا علی محمد بیگ، ڈپٹی کلکٹر ریٹائرمنٹ سے قبل ہی ۱۹۰۴ء میں وفات پا گئے۔ ان کے دوسرے بیٹے مرزا محمد رحیم بیگ مختیار کار تھے، بعد میں جاگیرداری کی اور ۱۹۰۵ء میں انتقال کر گئے۔ ان کا ایک بیٹا مرزا علی نواز بیگ ڈپٹی کلکٹر ہے۔ نانا کے مزید دو چھوٹے بیٹے بھی تھے۔ نانا اور والد صاحب کی اولاد کا شجرہ ضمیمے میں موجود ہے۔

میرا بچپن اور ابتدائی تعلیم

میں، ٹنڈو ٹھوڑو میں اپنے والد صاحب کے پرانے گھر میں ۱۲۷۰ ہجری ۱۸۵۳ء، محرم کی چار تاریخ کو پیدا ہوا۔ نانا نے میرا نام ''قلیچ خان'' رکھا جو بڑے ہوتے ہوتے ''قلیچ بیگ'' بنا۔ ایلفنسٹن کالج کی تعلیم کے دوران پروفیسر مرزا حیرت مجھے ''قلیچ بیگ'' کہنے لگے اس کے بعد ''خان'' کے بجائے ''بیگ'' میرے نام کا مستقل لاحقہ بن گیا۔

امی بتاتی تھیں کہ جب میں پیدا ہوا تو میری آنکھیں اس قدر سفید تھیں کہ آنکھوں کے سیاہ تارے بالکل ہی نظر نہیں آتے تھے۔ اس لیے انھیں شک ہوا کہ شاید میں نابینا ہوں۔ نانا مرحوم ان دنوں بیمار تھے انھیں یہ بات بتائی گئی تو انھوں نے تجویز کیا کہ بچے کا چہرہ سورج کی طرف کر کے دیکھیں کہ آیا آنکھیں پٹپٹاتا ہے یا نہیں۔ اس ترکیب پہ عمل کرنے کے بعد انھیں اندازہ ہوا کہ میں بینائی رکھتا ہوں۔ بچپن میں، بتاتے ہیں کہ میں بہت موٹا تھا، اسی لیے بادل فراش جو طنز و مزاح کے حوالے سے مشہور تھا، مجھے ''گھوباٹو☆'' کہہ کر پکارتا تھا۔ دس بارہ سال کا ہوا تو میری جسامت بھی دوسرے بھائیوں کی طرح دبلی ہونے لگی۔ قدیم دستور کے مطابق نومولود بچے کو دودھ پلانے کے لیے کوئی آیا رکھی جاتی تھی۔ مجھے بھی ایک ''بھاگل'' نامی آیا نے دودھ پلایا جو ماشکن تھی۔ میرے چھوٹے بھائی مرزا علی قلی کو ''شریفاں حجامن'' نے دودھ پلایا تھا۔ بچپن میں جب بھی میں کوئی عجیب حرکت کرتا تو عورتیں کہتیں کہ: ''اس نے ماشکن کا دودھ پیا ہے اسی لیے ایسا کرتا ہے۔ یہ ماشکی مچھیرے ہوتے ہیں۔'' جب میں اور بھائی علی قلی کھیل کے دوران، آپس میں الجھتے تب وہ مجھے

☆ گھوباٹو سندھی زبان میں موٹی تازی لکڑی کے تقریباً ایک سے ڈیڑھ فٹ کے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔

''بھاگل'' یا ''مچھیری'' کہہ کر چڑاتا تھا اور میں جواباً اسے ''شریفاں'' یا ''مجامن'' کہہ کر ستایا کرتا۔ میری دائی مریم (حیدرآباد والی) بہت بوڑھی عورت تھی۔ وہ ایک طرح سے ہمارے کنبے کی دائی تھی۔ بچپن میں، جب میں اپنی دائی کو چڑاتا، اس کی چال ڈھال اور بولنے کے انداز کی نقل کرتا تھا تب وہ غصے سے کہتی تھی ''چپ کر، ورنہ جہاں سے لائی ہوں، وہیں واپس پہنچادوں گی۔'' وہ کُرتا جو میں نے اپنی چھٹی پر پہنا تھا ابھی تک موجود ہے اور جب اللہ تعالیٰ مجھے اولاد عطا کرتا ہے، دعا کے لیے یہ کرتا اسے پہناتے ہیں۔

اماں کہتی تھیں کہ بچپن میں، میں بہت ضدی تھا۔ ہر وقت ضد اور بحث... حالانکہ معاملات بالکل بے مقصد و بے معنی ہوتے تھے مگر چوں کہ دو بہنوں کے بعد پیدا ہوا تھا اس لیے والدین کو مجھ سے بہت پیار تھا۔ وہ میرے ناز نخرے اٹھاتے تھے اور کسی بھی طرح مجھے ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ بعض اوقات میں آدھی رات کو اٹھ کر کوئی مسئلہ کھڑا کر کے اُدھم مچاتا تھا۔ اس شور شرابے کو سن کر نانا مرحوم اپنے گھر سے کسی کو بھیجتے اور کہلواتے ''بچے کو کیوں رُلا رہے ہو، جیسا کہتا ہے ویسا کر، یا جو مانگتا ہے دو مگر رونے مت دو'' کبھی کبھی رات کو خواب دیکھ کر اُٹھ بیٹھتا تھا اور جو کچھ بھی خواب میں دیکھا ہوتا مثلاً کوئی کھلونا یا پیسے، وہ طلب کرتا۔ لا کر دیتے تو کہتا یہ نہیں، دوسرا۔ اس طرح کتنی ہی اشیاء کا ڈھیر میرے سامنے لگ جاتا تھا، پھر کہیں جا کر چپ ہوتا تھا۔ میرے بڑے ہونے کے بعد بھی والدین کبھی کبھار ''یہ نہیں، دوسرا'' کہہ کر تنگ کرتے تھے۔

والدین اور اولاد کی مثال کے طور پر میرے درج ذیل اشعار دیکھیں۔

کہا میوے سے اس کے ایک درخت نے یوں
کہ کھلیں تیرے لیے کلیاں اور گُل کیوں
پھل کے نکھرے مجھ سے تم اے دلبر
آزردہ رہتا ہوں میں، ہے حال میرا ابتر
یہی ماں باپ اور اولاد کا ہے حال
رہیں خوشحال سدا یہ اور وہ بدحال

بسا اوقات سردی کی راتوں میں جب رفعِ حاجت کے لیے اٹھا کرتا تو امی سے ضد کرتا تھا کہ میرے کپڑے اتار کر مجھے باہر میدان میں لے کر جائیں۔ بہت سمجھانے کے باوجود نہیں مانتا تھا۔ آخر لاچار ہو کر، مجھے خوش رکھنے کی خاطر امی یہ بھی کرتی تھیں۔ ابھی میں دودھ پیتا بچہ تھا کہ بھائی علی قلی پیدا ہوا۔ اسے بھی ماں کا دودھ پینے کا پورا حق تھا مگر میں اس قدر ضدی تھا کہ اسے ماں کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیتا تھا بلکہ اگر اسے امی کے قریب دیکھتا بھی تو جھگڑا کر کے نکلواتا تھا۔ امی چھپ چھپا کر اسے دودھ پلایا کرتی تھیں حالانکہ اسے دودھ پلانے کے لیے ایک دائی بھی موجود تھی۔ بس پھر جلد ہی مجھ سے بھی دودھ چھڑوایا گیا۔

بچپن کی حرکتوں کی ایک مثال دیتا چلوں۔ ایک بار، جاڑے میں، ہم سب آتشدان کے قریب بیٹھے تھے۔ میں، پتلی پتلی لکڑیاں یا تیلیاں، آگ سے جلا کر ہاتھ میں پکڑے کبھی گھماتا، کبھی آس پاس بیٹھے بہن بھائیوں کو مارتا۔ آگ کے قریب کوئی بڑا موجود نہ تھا۔ اچانک بھائی مرزا غلام رضا بیگ کے کپڑوں کو آگ لگ گئی اور چیخ و پکار پر جب تک کوئی بڑا پہنچتا، تب تک اسے آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بڑی مشکل سے آگ پر قابو پایا گیا مگر بھائی مرحوم کی پشت کی کھال جل گئی اور وہ کئی مہینے زیرِ علاج رہے۔ صحت یابی کے بعد بھی ان کی پشت کی کھال جلی ہوئی نظر آتی تھی بلکہ آخری عمر تک، کرتا اتارنے پر جلنے کے داغ نمایاں رہے۔

امی بتاتی تھیں کہ نانا اور والد صاحب مجھے بہت دعائیں دیتے تھے اور کہتے تھے کہ اس پر بادشاہ کا نام ہے یہ بڑا ذہین اور خوش بخت ہوگا۔ ابھی چھوٹا ہی تھا کہ مجھے لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ باقی سب بچے کھیل کود کے لیے جاتے تھے مگر میں کاغذ، قلم و دوات لیے لکیریں کھینچا کرتا۔ لوگ حیران ہوتے تھے کہ اس بچے کو دوسرے بچوں کی طرح کسی اور کھیل سے دلچسپی کیوں نہیں ہے؟ اس شوق کو پروان چڑھانے کے لیے امی نے مجھے رنگ برنگے صفحات، قلمدان اور تختی لے کر دیں۔ ایک کاغذ لکھتا تو دوسرا پھاڑتا۔ جب تھوڑا بڑا ہوا تو، یاد آتا ہے کہ بھائی مرزا علی قلی اور دیگر بچوں کے ساتھ چھپن چھپائی کھیلتا تھا۔ کپڑے کی گیند اور کنچوں وغیرہ کے ساتھ بھی کھیلا کرتا تھا مگر وہ بھی اکثر گھر کے اندر، باہر بہت کم کھیلتا تھا۔ تاش کھیلنا یاد ہے۔

بڑے ہوکر تھوڑی بہت شطرنج سیکھی، بس، اور کوئی کھیل نہیں کھیلا بلکہ بڑے ہوکر بھی کسی کھیل یا شکار کا شوق پیدا نہیں ہوا جو میری دیگر بھائیوں کو خوب تھا۔ البتہ پڑھنا، شعر کہنا، کتابیں لکھنا وغیرہ بچپن میں بھی مرغوب تھا اور یہ دلچسپی اب تک برقرار ہے۔

جب پڑھنے کی عمر کو پہنچا تب ابتداء میں تو گاؤں کے خانگی مکتب میں محمد شفیع آخوند کے پاس تعلیم حاصل کی جہاں میرے بڑے دونوں بھائی اور دیگر ماموں زاد بھائی بھی پڑھا کرتے تھے۔ جب میرے بڑے بھائیوں کو انگلش میڈیم اسکول میں داخل کروایا گیا اور میں نے بھی قرآن ختم کرلیا تب مجھے اور بھائی مرزا علی قلی کو حیدرآباد کے سندھی میڈیم اسکول میں داخل کیا گیا۔ ہم سب بھائی، جوڑی دار بن کر، ساتھ چلے اور پڑھے۔ اسی وجہ سے ہم بھائیوں کی جوڑی جوڑی کی سنگت، آخر تک چلی۔ بھائی مرزا غلام رضا اور بھائی مرزا صادق علی ساتھ پڑھے۔ میں نے اور بھائی علی قلی نے ساتھ تعلیم حاصل کی۔ بھائی مرزا جعفر قلی اور نجف قلی ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ فقط بھائی حیدر قلی تنہا پڑھے مگر جلد ہی وہ اور بھائی نجف قلی ساتھ رہنے لگے اور گہرے دوست بن گئے۔

ہم سب نے باری باری حیدرآباد کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ ہمارا گاؤں شہر سے ڈھائی میل کے فاصلے پر تھا۔ بچپن ہی میں یہ فاصلہ عبور کرنا سیکھ لیا۔ صبح سویرے ایک روٹی کھا کر، دوسری دوپہر کے لیے مزدوروں کی طرح اپنے ساتھ باندھ کر، گھر سے نکلتے تھے۔ ایک عمر رسیدہ ملازم ہمارے ساتھ ہوتا تھا۔ پہلے ہمارے استاد ولی محمد آخوند تھے۔ صبح سویرے ہم ان کی بیٹھک میں پہنچتے اور وہاں پڑھتے تھے۔ پھر دس بجے کے قریب، آخوند صاحب کے ہمراہ اسکول جاتے تھے۔ دوپہر کا کھانا وہیں کھاتے تھے۔ کبھی کبھی نان بائی سے سالن، روجی کوفتائی یا چھپڑ رال والے سے کوفتے یا دال لے کر اپنی روٹی کے ساتھ کھاتے تھے۔ سارا دن پڑھائی کرکے، شام کو پھر ملازم کے ساتھ نکلتے اور سورج غروب، ہوتے سے گاؤں پہنچتے تھے۔ آنے جانے کا سفر اس عمر میں بھی گرما کے تپتے دنوں، جاڑے کی شدید شدت اور ساون کے دنوں میں اسی طرح طے کرتے تھے۔

کئی بار، برسات میں بھیگ کر گھر پہنچے لیکن چونکہ ملازم ساتھ ہوتا تھا اس لیے والدین فکر مند نہیں ہوتے تھے۔ ان دنوں اسکول میں فارسی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ گلستان، بوستان، انوار سہیلی، سکندر نامہ اور دیگر فارسی کتب ہم نے وہیں پڑھیں بلکہ قاضی حاجی احمد کے پاس تو میں نے عربی بھی پڑھی۔ آخوند صاحب، قاضی صاحب یا کسی اور استاد نے ہمیں کبھی نہیں مارا بلکہ بڑی عزت و محبت سے پڑھاتے تھے نتیجتاً ہم بھی شوق اور محنت سے پڑھتے تھے۔ ہاں مگر ولی محمد آخوند کا ایک طمانچہ اور ران میں بھری ہوئی چٹکی مجھے اب تک یاد ہے۔ قاضی صاحب تاکید سے نماز پڑھواتے اور روزے رکھواتے تھے۔ ختم قرآن پر حاضر رہنے کی تاکید کرتے تھے۔ اسی وجہ سے بچپن ہی سے قرآن، نماز اور روزے کی عادت ہوگئی۔ اس سلسلے میں والدین کی کوششیں بھی رہیں کیونکہ وہ خود بھی عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ یوں بچپن ہی سے ہی ہمیں نماز پڑھنے کی عادت ہوگئی اور پیدل چلنے میں طاق ہوگئے۔ اسکول میں فارسی اور سندھی کے مضامین میں، میں کافی ذہین تھا۔ خوب انعامات حاصل کیے۔ یہ انعامات گولڈ سمتھ صاحب، مور صاحب اور پھر جگن ناتھ صاحب نے اپنے دستِ مبارک سے دیے۔ والد صاحب بھی موقع پر موجود ہوتے تھے۔

اسکول میں پڑھتے ہوئے راگ سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ سرندا بجانے والوں سے سرندا بجانا سیکھا اور بعد میں گانا بھی۔ پھر ستار بجانا سیکھا جو کالج کی تعلیم تک بجاتا رہا۔ محرم کے دنوں میں مرثیے پڑھتا تھا جو کہ لوگ شوق سے سنتے تھے۔

پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ بچپن میں مجھے کھیلوں کا زیادہ شوق نہ تھا مگر پڑھنے لکھنے اور کاغذ کالے کرنے کا بڑا شوقین تھا۔ مجھے یاد ہے کہ سات، آٹھ سال کی عمر میں جھوٹے سچے شعر گھڑ کر نا . . ہم کے پاس لے جاتا تھا۔ نانا بیماری کی حالت میں چارپائی پر لیٹے لیٹے مجھے بلا کر کہتے ’’ . ں مجھے اپنے شعر سناؤ‘‘ اور میں سناتا جاتا تھا۔ اس پر وہ ہنستے ہوئے خوشی کا اظہار کرتے۔ اور دائی قدم، (جو ان کی خدمت پر مامور تھی) اسے کہتے تو وہ پستے، کشمش، بادام یا کوئی اور میوہ لاتی تھی نانا مجھے یہ میوے اور شاباشی دے کر رخصت کرتے۔ جیسے جیسے بڑا ہوتا

گیا، ویسے ویسے بہتر سندھی اشعار کہنے لگا۔ کبھی کبھار فارسی شعر بھی کہتا تھا۔ زیادہ تر مزاحیہ اور دلچسپ شاعری کرتا۔ اکثر گھر کی باتیں منظوم کرتا تھا جن میں امی اور بھائیوں کی جانب اشارہ کرنے سے بھی باز نہ آتا تھا۔ دن کو موزوں کرتا، رات کو جب سب کھانے سے فارغ ہوتے، تب میں سنانے بیٹھ جاتا۔ امی، ابو اور دیگر بیٹھ کر سنتے اور قہقہے لگاتے تھے۔ اُن دنوں کے چند اشعار اب بھی میرے پاس موجود ہیں اور بظاہر بحر اور وزن کے حساب سے مناسب ہیں۔ کچھ غزلیں، اور مرثیے بھی لڑکپن میں لکھے جنھیں والد صاحب نہ صرف پسند کرتے بلکہ اصلاح و درستگی بھی کرتے تھے۔ جب مرحوم میر حسین علی خان، ورآغا زین العابدین شاہ یا کوئی اور معزز شخص بہر ملاقات یا بحیثیت مہمان آتا تب والد صاحب مجھے وہ مرثیے پڑھنے کے لیے کہتے۔ وہ لوگ سنتے، تعریف کرتے اور مجھے شاباش دیتے۔ بابا کو تعویز لکھتے اور فال نکالتے دیکھ کر، مجھے بھی ایسی کتابیں پڑھنے کا شوق جاگا۔ مجھے یاد ہے، میں نے کئی لوگوں کو تعویز لکھ کر دیے اور انھیں بھی یہ یقین ہوگیا کہ یہ تعویز اثر دکھاتے ہیں کیونکہ ان کے عوض وہ پانچ پیسے یا پائی پیسہ نذرانہ ضرور دیتے تھے جو میرا جیب خرچ بن جاتے تھے۔ کئی افراد تو میرے اس پرانے شوق کی وجہ سے فال نکلوانے یا تعویز وغیرہ لکھوانے پر اب بھی مصر رہتے ہیں۔ والد صاحب مجھ سے فارسی کتابیں نقل کروانے کا کام بھی لیتے تھے کیونکہ وہ خود بھی یہ کام کرتے تھے۔ اس کام میں انھیں اچھی خاصی مدد فراہم کرتا۔ اس کام کی وجہ سے میری تحریر خوبصورت ہونے لگی۔ مطلب یہ کہ گھریلو منشی گیری بچپن ہی سے میرے حوالے تھی۔ بلکہ محلے پڑوس میں بھی اگر کسی کو خط، پتہ، مرثیہ، منقبت یا مدح لکھوانی ہوتی تو مجھ سے ہی آ کر لکھواتے تھے۔ اس وجہ سے میرے علم میں وسعت اور خوش خطی میں خوبصورتی آتی گئی۔

والد صاحب کو مجھ سے اتنی محبت تھی اور مجھے بھی ان کی صحبت اس قدر اچھی لگتی تھی کہ ہم اکثر ساتھ رہتے تھے۔ دن کو بھی، دوران فرصت گھر بیٹھا ان کی کتابیں لکھا کرتا اور شام کو جب وہ باہر جاتے اور دوسرے بچے کھیلنے لگ جاتے تھے تب بھی میں ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ اگر وہ میاں عافیت کی بیٹھک میں شطرنج کھیلنے جاتے تھے تو میں بھی ان کے ساتھ جاتا۔

اور بیٹھا ان کا کھیل دیکھتا رہتا اور جو پیادے مرجاتے تھے، ان کے ساتھ کھیلا کرتا۔ رات کو ان کے ساتھ ایک ہی چارپائی پہ سوتا تھا۔ ان کے انتقال تک یہی میرا وطیرہ رہا۔ رات کو جب والد صاحب آ کر لیٹتے، تب میں بیٹھ کر ان کا جسم دبایا کرتا۔ جب سوتے، تب میں بھی ان کے ساتھ سوجاتا تھا۔ گرمیوں کے دنوں میں جب وہ آرام کرتے تھے تب میں انھیں ہاتھ سے پنکھا جھلا کرتا کبھی جھلی کھینچتا یا ان کی ٹانگیں دباتا رہتا تھا۔ انہی وجوہات کی بناء پر والد صاحب مجھے بہت پسند کرتے، دعائیں دیتے اور کئی کتابوں کے تذکرے یا بیت سناتے یا اپنے وطن کا حال اور بچپن کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ اس تعلق کا عکاس میرا یہ شعر ہے:

جو بھی ملا ہے فیض مجھ کو باپ اپنے سے ملا
رات کو سوتا تھا جس کے ساتھ میں، ساتھ دن کو بیٹھتا

بچپن میں مجھے خوش طبعی، شوخی اور مسخرے پن کی عادت تھی۔ نقلیں اس قدر عمدہ اتارتا تھا کہ والد صاحب و دیگر افرادِ خانہ سے لے کر ملاقاتی تک بہت محظوظ ہوتے تھے۔ یاد آتا ہے کہ والد صاحب اس قدر ہنستے تھے کہ ہنستے ہنستے ان کی آنکھوں میں پانی بھر آتا تھا۔ پھر کہتے تھے کہ جب یہ لڑکا بڑا ہو کر شادی کرے گا تب اپنے بیوی بچوں سے بھی مذاق کرنے سے باز نہیں آئے گا۔ میری ایک کتاب کا نام "ہزلیات" ہے۔ جس میں میرے سب ظریفانہ اشعار شامل ہیں۔ یہ شیخ سعدی کے رسالے "مضحکات" کی طرز پر ہے۔ میں نہ صرف زبانی طنز و مزاح کرتا بلکہ لوگوں کی نقلیں اتارنے سے لے کر نائٹ بازی کرتے ہوئے، کپڑے بدل کر سوانگ تک رچاتا تھا۔ ایک بار میں نے کسی بھکارن کو خیرات دی، اس نے امی، ابو کے سامنے خوش ہو کر مجھے دعا دی اور کہا، "بابا اللہ کرے تمہیں بہت پھول پھل لگیں"۔

اس کے جانے کے بعد، چھپ کر درخت کی ٹہنیاں اپنے پورے بدن پر بڑی تکنیک سے انکائیں اچانک چھلانگ لگا کر امی، ابو کے سامنے آ کھڑا ہوا کہ "دیکھیے مجھے بھکارن کی دعا کتنی جلدی لگ گئی۔ ایسے مذاق اور لطائف کی وجہ سے میں گاؤں میں مشہور ہوگیا۔ بڑے ہونے پر بھی جب عزیزوں یا دوستوں کی مجلس میں پہنچتا تھا تب سب کہتے، "اب

ہنسیں گے'' یا کہتے کہ ''ہمیں ہنساؤ''۔ سندھی میڈیم اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ایک ہندوستانی لڑکے رستم خان سے میری دوستی ہوئی وہ میرا ہم عمر اور ہم جماعت تھا۔ اس کے والد کا نام حسن خان تھا۔ اس کا تعلق سورت شہر سے تھا اور محمد فاضل مصنف حیدرآباد کا عزیز تھا۔ اکثر اتوار کے دن وہ میرے گھر آتا کبھی کبھی میں اس کے گھر چلا جاتا۔ جس طرح اس کی والدہ مجھے بہت پیار کرتی تھیں اسی طرح میری والدہ اسے بہت چاہتی تھیں۔ ان دنوں کرسیوں، میزوں کا رواج نہ تھا۔ کرسیوں کی جگہ پر اکثر اونچی پشت والی پیڑھیاں کام آتی تھیں۔ نوار پٹی کے تانے بانے سے بنی لکڑی کی کرسی کو ''گادیل'' کہتے تھے۔ ایسی ایک کرسی ہمارے، میروں کی صاحبی والے، گھر میں ہوتی تھی۔ چوں کہ اسکول میں کرسیاں اور میزیں دیکھتے تھے اس لیے جب رستم خان میرے پاس آتا تب میں چاہتا تھا کہ گھر میں بھی کوئی میز کرسی رکھ کر بیٹھیں اور اس پر لکھیں پڑھیں تو کیا ہی اچھا ہو۔ ہم دونوں ایک چھوٹے کمرے میں علیحدہ بیٹھتے تھے اور اس ''گادیل'' کے ساتھ کوئی صندوق رکھ کر، کرسی کی طرح استعمال کرتے تھے۔ اور میز کے لیے گھڑے کی چوکی درمیان میں رکھ کر، اس پر دروازے کا طاق یا کوئی دوسرا تختہ رکھ کر، تختہ رکھ کر اس تختہ کے اوپر کپڑا ڈال کر، اسے میز بنا کر کام کیا کرتے۔

آٹھ، نو برس کی عمر میں، اسکول میں پڑھنے کے دوران ایک چوری کی جو مجھے ابھی تک یاد ہے۔ نوکر کے ساتھ ''فقیر کا پڑ'' سے گزر کر اسکول کی طرف جا رہے تھے، ایک چھوٹی سی دکان سے نوکر نے کوئی چیز خریدی۔ اخروٹوں کا بھرا ہوا تھال دکان کے بالکل کنارے رکھا ہوا تھا۔ بنیا ملازم کے ساتھ مشغول تھا۔ مجھے لالچ پیدا ہوا۔ بنیا کہیں اور دیکھ رہا تھا۔ میں نے دو اخروٹ اٹھا کر جیب میں ڈال لیے۔ پھر نوکر کے ساتھ بازار کے راستے اسکول کی طرف چلے۔ جب شہر کے درمیاں سرور کے مقبرے کے قریب پہنچے تو پیچھے پیچھے وہ بنیا بھی پہنچ گیا۔ شاید کسی اور نے مجھے اخروٹ اٹھاتے دیکھ لیا تھا اور اسے بتا دیا۔ مجھے کہنے لگا ''جو اخروٹ اٹھائے ہیں واپس کرو۔'' میں نے خاموشی سے، جیب سے دونوں اخروٹ نکال کر واپس کیے تو وہ چلا گیا۔ میں بہت شرمندہ ہوا اور آج تک اس چوری کو یاد کر کے

پشیمان ہوتا ہوں۔ جب کہیں اخروٹ دیکھتا ہوں، تب وہ بات یاد آتی ہے شاید اسی وجہ سے اخروٹ قطعی نہیں کھاتا نہ ہی پسند کرتا ہوں۔ شکر ادا کرتا ہوں کہ وہ اخروٹ نہیں کھائے، چوری پکڑی گئی اور اصل مالک کو اس کا حق ملا۔

جب میں اور بھائی علی قلی اسکول کے درجہ اول یا اس سے اگلی کلاس میں آئے، تب بھائی مرزا صادق علی بیگ، جو ان دنوں ہائی اسکول میں پڑھا کرتے تھے، ہمیں گھر میں انگریزی پڑھانے لگے۔ جلد ہی پھر ہم بھی اینگلو ورنیکولر اسکول میں داخل ہو گئے۔ ہم پہلے ہی انگریزی کی کچھ کتابیں پڑھ چکے تھے۔ لہٰذا ہمیں کلاس دوم میں داخلہ دیا گیا۔

مسٹر لکشمن وشنو مرہٹہ ہیڈ ماسٹر تھے۔ اس اسکول میں بھی ہم نے اتنی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا کہ اساتذہ ہماری تعریف کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں ہمیشہ سب سے آگے بیٹھتا تھا اور پوری کلاس بلکہ پورے اسکول میں سب سے زیادہ ذہین گردانا جاتا تھا۔ اس اینگلو ورنیکولر اسکول کی عمارت وہ ہے جہاں اب ہائی اسکول قائم ہے۔ وہاں سے تعلیم ختم کی تو پھر ہائی اسکول پہنچے جو اس وقت گھڑیال والی عمارت میں تھا، جہاں اب ٹریننگ کالج واقع ہے۔ مسٹر وہامن اباجی موڈک وہاں ہیڈ ماسٹر تھے۔ پھر مسٹر کیشو رام ہیڈ ماسٹر بنے اور مسٹر راما کنٹھ اسسٹنٹ۔ چوں کہ بڑا سفر طے کر کے آتے تھے اور شام کو دیر گئے گھر لوٹتے تھے لہٰذا سبق یاد کرنے کے لیے زیادہ وقت نہیں ملتا تھا اور ہماری یہ کوشش ہوتی تھی کہ ہمیشہ سبق یاد کریں تاکہ اگلی کلاسوں میں جائیں اور جس طرح انگلش میڈیم اسکول میں نام روشن کیا اسی طرح ہائی اسکول میں بھی نام کمائیں۔ اس لیے شام کو چار پانچ بجے چھٹی ملنے اور اسکول بند ہونے کے بعد اسکول کی دہلیز پر بیٹھ کر دوسرے دن پڑھنے والے سبق کے معنی و مفہوم پڑھ کر، کافی حد تک کام ختم کر لیا کرتے تھے۔ جھٹپٹے کے سمے ہم چلنا شروع کرتے اور دیے جلنے کے وقت گھر پہنچتے۔ کھانا کھا کر، آرام کر کے، پھر رات کو پڑھنے بیٹھ جاتے۔ چٹائی بچھا کر درمیان میں گھڑا الٹا کر کے اس پر دیا یا شمع دان رکھ کر، پڑھتے تھے۔ ان دنوں مٹی کا تیل نہیں تھا، کڑوا تیل جلتا تھا۔ بتیاں اور چمنیاں بھی عام نہ

تھیں۔ ہماری بہنیں بھی وہاں بیٹھ کر پڑھتی تھیں، بلکہ محلے کی کچھ عزیز لڑکیاں بھی وہاں آ کر پڑھا کرتیں۔ امی انھیں قرآن یا سندھی پڑھایا کرتیں تھیں۔ سردیوں کے دنوں میں، صبح کے وقت، دھوپ میں چٹائی بچھا کر پڑھتے تھے اور جب اسکول جانے کا وقت ہوتا تب تیار ہو کر چلے جاتے تھے۔ گھڑیاں یا گھڑیال اتنے عام نہ تھے۔ ایک بجنے والا بڑا کلاک (الارم) نانا مرحوم کے پاس ہوا کرتا تھا جسے آٹھویں دن چابی دی جاتی تھی۔ ابتدائی دنوں میں، مجھے یاد ہے کہ استاد وشنو گھنشام اتوار کے دن آ کر، اس الارم کلاک کی چابی بھرا کرتے۔ والد صاحب کے پاس ایک سونے کی گھڑی تھی جو وہ بمبئی سے لائے تھے۔ اکثر رات کو اسے اپنے سرہانے رکھ کر سوتے تھے۔ ہم بچوں کے لیے، وقت معلوم کرنے کے لیے، دیوار پر ڈنڈیاں ٹھونک کر، عکسی نشانات بنا دیے گئے تھے، اور ہم اس پر گھنٹے گنا کرتے تھے۔ ہفتہ والے دن نہایت جلدی جانا ہوتا تھا اور گرمیوں میں وقت تبدیل ہونے کے باعث، ہر روز صبح سویرے اٹھنا پڑتا تھا۔ بیچاری دائی گل چمن آدھی رات کو اٹھ کر، آٹا پیس کر، روٹی بناتی تھی جو آم، مربے یا کسی اور چیز کے ساتھ کھا کر اسکول روانہ ہوتے تھے۔ چائے کا رواج عام نہ تھا نانا اور والد صاحب کبھی کبھار چائے پیتے تھے جو بمبئی سے تحفتاً آتی تھی۔ چائے میں ان دنوں دودھ نہیں ڈالا جاتا تھا لیکن دودھ کے بغیر بھی بڑی لذیذ بنتی تھی۔ ایسی لذت آج کل کی چائے میں نہیں پائی جاتی۔

گھر میں ہم سب مل کر کھانا کھاتے تھے۔ کھانا زمین پر غالیچہ یا چٹائی بچھا کر کھایا جاتا تھا۔ ابو، امی اور بھائی، بہن سب ساتھ مل کر بیٹھتے تھے۔ والد صاحب سالن کے بڑے شوقین تھے اور کھانے کے ساتھ لیموں یا کوئی اور کھٹی چیز پسند کرتے تھے۔ گوبھی اور سلاد عام نہ تھے مگر والد صاحب سرکاری باغات سے منگوا کر شکنجبین کے ساتھ کھاتے تھے۔ والد صاحب اچار اور مربے بہت اچھے بنایا کرتے تھے بلکہ سرکہ بھی اپنے ہاتھوں سے بناتے تھے۔ بیر کے کونڈے میں ڈال کر، زمین میں دبا دیتے اور چالیس روز کے بعد نکال کر، اچار یا کھانے میں استعمال کرتے تھے۔

میں اسکول میں انگریزی پڑھتا تھا اور والد صاحب گھر میں مجھے فارسی اور عربی پڑھایا کرتے تھے۔ شاعری کی کتب، بالخصوص حافظ، صائب، بیدل اور شاہنامہ وغیرہ پڑھتے اور میں بیٹھا سنا کرتا۔ کہیں کہیں مجھے سمجھاتے بھی تھے۔ اس لیے گھر میں فارسی لکھنے پڑھنے کی اچھی خاصی مشق رہتی تھی۔ میں پھر اپنی بڑی بہن کو فارسی پڑھایا کرتا۔ وہ گلستان اور بوستان دیگر کتب اور سندھی اچھی طرح لکھ پڑھ جاتی تھیں۔ جس طرح بھائی مرزا صادق علی بیگ گھر میں ہمیں انگریزی پڑھایا کرتے تھے، اسی طرح پھر میں بھائی جعفر قلی اور نجف قلی کو گھر میں انگریزی پڑھایا کرتا۔ جب میں اور بھائی علی قلی سندھی میڈیم اسکول سے نکل کر انگلش میڈیم اسکول گئے تب بھائی جعفر قلی اور نجف قلی جوڑی بنا کر سندھی میڈیم اسکول میں پڑھنے لگے، جن کے ساتھ خیسو، یوسف یا کوئی دوسرا ملازم آتا جاتا تھا۔

انگریزی ہائی اسکول میں جیسے بھائی مرزا صادق علی بیگ نے اپنے شائستہ رویے اور تعلیمی کارکردگی کی بنیاد پر نام کمایا اور بمبئی کالج گئے، اسی طرح میں نے اپنے دور میں یہ اعزاز قائم رکھا اور امتحانات میں امتیازی حیثیت حاصل کر کے انعامات حاصل کیے۔ ہیڈ ماسٹر، ماسٹر کیشورام مجھے بہت چاہتے تھے۔ ہم دونوں بھائی صبح سویرے ماسٹر صاحب کے گھر پہنچتے وہاں وہ ہمیں پہلے گھر پر پڑھاتے پھر ہم دس بجے کے قریب ان کے ساتھ اسکول پہنچتے تھے۔ میں چونکہ ہر کلاس میں نمایاں نمبر لیتا اور اکثر اول آتا تھا لہٰذا جب کوئی اعلیٰ عہدیدار یا کوئی بڑا آدمی اسکول کا دورہ کرنے آتا تو استاد ان سے میرے متعلق ذکر کرتے اور میرے انگریزی میں تحریر کردہ مضامین انھیں دکھایا کرتے۔ دورانِ اسکول پادری مسٹر شرٹ کی بیگم سے انگریزی موسیقی یا راگ سیکھا کرتا۔ مسٹر اور مسز شرٹ مجھ پر بڑے مہربان تھے اور ہمیشہ یونہی مہربان رہے۔

آخری دنوں میں، یعنی ۱۸۸۷ء کے قریب، بھائی مرزا غلام رضا بیگ ہائی اسکول میں فارسی کے استاد بنے اور فارسی پڑھانا شروع کی۔ انھیں اسی روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ میں چونکہ فارسی پہلے سے جانتا تھا لہٰذا میٹرک میں عربی مضمون لینے کا ارادہ کیا۔

بیٹھا پڑھا کرتا اور مشکل چیزیں حاجی قاضی احمد سندھی میڈیم اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے پوچھ لیتا۔ جلد ہی بھائی مرزا غلام رضا بیگ، میر پور خاص میں میروں کے استاد مقرر ہوئے اور ان کی جگہ، آدھی یعنی چالیس روپے تنخواہ کے ساتھ ایجوکیشنل انسپکٹر مسٹر فلٹن نے مجھے فارسی استاد کی حیثیت سے پڑھانے کے لیے کہا۔ میں خود سے سینئر جماعتوں کو فارسی پڑھانے لگا۔ ان دنوں ''ایلس پرائز'' جو ساٹھ روپے مالیت کا انعام تھا، اسے میٹرک کے امتحان میں سندھی زبان کے لیے مختص کیا گیا۔ اس لالچ میں، عربی یا فارسی کے بجائے سندھی سبجیکٹ کا چناؤ کیا اور ایلس پرائز جیتا جو کہ مجھے بمبئی یونیورسٹی میں دیا گیا۔ اس انعام کی کتابیں اب تک میرے پاس موجود ہیں اور کام آرہی ہیں۔

میں ابھی میٹرک کے امتحانات کی غرض سے بمبئی نہیں گیا تھا (یہ امتحان ان دنوں وہاں ہوتا تھا) کہ والد صاحب کا انتقال ۱۲۸۸ھ ہجری یعنی ۱۸۷۱ء میں ہوگیا۔ بابا کو پیچش کی بیماری تھی۔ جسے ''ڈیسنٹری'' کہتے ہیں۔ دادا بھائی ساسن اور ڈاکٹر رحمٰن خان، والد صاحب کا علاج کر رہے تھے۔ میں خود بلا ناغہ، ہسپتال سے دوا لاتا تھا مگر نصیب میں شفا نہ تھی۔ بیماری اور وفات پر خرچ کے لیے، ان کی سونے کی گھڑی فروخت کرنا پڑی جو کہ ڈاکٹر ساسن نے خود خریدی۔ مجھے یاد ہے کہ میں گھڑی دینے ان کے گھر گیا اور انھوں نے مجھے تین سو روپے دیے۔ گھڑی بہت عمدہ تھی، میکیب کارخانے کی گھڑی ہونے کی وجہ سے قیمتی اور کمیاب شمار ہوتی تھی۔

تیسرا باب

سن بلوغت اور اعلیٰ تعلیم

والد صاحب کے انتقال کے اگلے سال میں بمبئی گیا اور ایلفنسٹن کالج میں داخلہ لیا۔ بمبئی آتے جاتے، پہلے میں کراچی میں قاضی محمد اشرف کے پاس ٹھہرتا تھا، پھر ہائی اسکول کے استاد مسٹر تاپیداس کے گھر کے قریب اور آخر میں مسٹر حسن علی کے پاس کیونکہ ان کے بیٹے مسٹر محمد علی نے بھی کالج میں داخلہ لیا تھا۔ بھائی مرزا صادق علی بیگ اسی کالج میں فارسی فیلو تھے۔ کچھ عرصے ہم دونوں ساتھ رہے اور ایک دوسرے کی صحبت میں بہت خوش رہتے تھے۔ ان دنوں مسٹر چیٹفیلڈ پرنسپل تھے۔ اور مولوی عبدالفتاح عربی و فارسی کے پروفیسر تھے۔ بھائی صادق علی بیگ نے عربی میں بی۔اے کیا جبکہ میں نے فارسی میں۔ پھر جلد ہی بھائی صادق علی بیگ حیدرآباد آئے اور میں تنہا رہنے لگا۔ مولوی عبدالفتاح کی جگہ پروفیسر مرزا حیرت آئے اور پروفیسر ورڈز ورتھ پرنسپل بنے۔ اُن کے بعد پروفیسر اگز نہام اور پھر مسٹر جالکس پرنسپل بنے۔ مسٹر جالکس بعد میں سندھ میں ڈائریکٹر بھی رہے۔ ٹو اور پروفیسر ہاتھارن تھویت بھی وہاں بحیثیت پروفیسر پڑھاتے تھے۔

کالج میں داخلے کے وقت، مجھے سندھ سے ۲۰ روپے کی ایک اسکالرشپ ملی جو میرے بڑے بھائی کو بھی ملتی تھی بلکہ بھائی کو تو ملازم کے لیے بھی سرکار سے ۱۸ روپے ملا کرتے تھے۔ ان دنوں مسٹر فلٹن سندھ میں ایجوکیشنل انسپکٹر تھے جو مجھ پر اور بھائی پر بہت زیادہ مہربان تھے۔ انھوں نے ہمیں ہر طرح کی مدد و سہولت میسر کی۔ تبادلے کے بعد جب وہ بمبئی ہائی کورٹ کے رجسٹرار بن کر آئے، تب بھی وقتاً فوقتاً بمبئی آکر مجھ سے ملتے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ مسٹر فلٹن کے کچھ خطوط بارہویں باب میں دیکھیے۔

تمام پروفیسر یا فیلو مجھ سے خوش رہتے تھے اور بہت مہربان تھے۔ خاص طور پر مرزا حیرت، جو مجھے شاگرد کی بجائے اولاد کی مانند سمجھتے اور محبت کرتے تھے۔ میرے کالج فیلوز میں مسٹر سودی، مسٹر واڈیا اور مسٹر بابا تھے۔ مسٹر واڈیا کو شاعری پر عبور حاصل تھا۔ وہ مجھے شاعری کے عروض سکھاتے اور میری انگریزی شاعری کی اصلاح بھی کرتے۔ روزانہ شام کو میں مرزا حیرت کے پاس جاتا اور رات کو دیر تک ان کی صحبت سے استفادہ کرتا۔ کبھی کبھار صبح کو بھی جانا ہوتا تھا۔ ان کی گھریلو یا سرکاری خط و کتابت کرتا۔ آراء کے لیے جو کتابیں ان کے پاس آتی تھیں، وہ بھی مجھے دیکھنے اور رائے دینے کے لیے دیتے۔ امتحانات کے دنوں میں بھی سوال بنانے اور جوابات دیکھنے میں، میں ان کی مدد کرتا تھا۔ پہلے سال ہی انھیں اندازہ ہوگیا کہ میں ان سے زیادہ عربی اور فارسی جانتا ہوں۔ وقتاً فوقتاً ہونے والے امتحانات میں وہ مجھے ہمیشہ سو میں سے سو نمبر دیتے۔ جس پر دوسرے پروفیسر چڑتے اور مرزا حیرت کے رویے پر حیرت کا اظہار کرتے تھے۔ وہ مجھ سے ہزاروں مضامین پر گفتگو کرتے اور مختلف شعراء کے شعر سناتے تھے۔ ٹرم کے آخر میں وہ مضامین جن پر انعامات بھی رکھے جاتے تھے، ان میں، فارسی کے مضمون میں ہمیشہ مجھے ہی انعام ملتا تھا۔ میں اپنی فارسی شاعری انھیں دکھاتا اور وہ اس کی اصلاح کرکے علم عروض کے قاعدے سمجھاتے۔ خود کئی زبانوں کے ماہر تھے اور چونکہ ترکی زبان بھی جانتے تھے اس لیے مجھے بھی ترکی سیکھنے کا شوق ہوا جو انھوں نے مجھے اس طرح سکھائی کہ میں، باقاعدہ ترکی زبان میں اشعار کہنے لگا۔ انھی کی معرفت میں بڑے آغا خان اور ان کے خاندان سے واقف ہوا اور اکثر وہاں دن گزارتا اور کھانا وغیرہ کھاتا۔ آغا خان کا چھوٹا بیٹا آغا اکبر شاہ ہم عصر ہونے کی وجہ سے میرا اچھا دوست بنا۔ وہ بھی مرزا حیرت کے پاس ان سے انگریزی سیکھنے آیا کرتا۔ مرزا حیرت نے بمبئی والے ترک قونصل سے بھی میری ملاقات کروائی اور یوں میں ترکی زیادہ اچھی بولنے اور پڑھنے لگا۔ مرزا حیرت کے کافی خطوط میں سے چار خط (نمبر ۸ سے ۱۱ تک) بارھویں باب میں شامل ہیں۔

کالج میں پارسی طلباء یعنی مرہٹوں اور گجراتیوں سے زیادہ تعلق رہا۔ لہٰذا ان سے دوستی بھی ہوگئی۔ پروفیسر بھنڈارکر، جو سنسکرت کے پروفیسر تھے اور حیدرآباد کے ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر بھی رہے تھے، میرے دو بڑے بھائیوں کے استاد ہونے کی بناء پر مجھ پر بھی بہت مہربان رہے۔ مسٹر تنگ، ان کے اسسٹنٹ تھے۔ ان سے دوستی کی وجہ سے سنسکرت سیکھنے کا شوق ہوا۔ دو چار ابتدائی کتابیں بھی پڑھیں۔ گجراتی زبان بھی سیکھی اور اچھی طرح پڑھ لکھ لیتا تھا۔ اسی طرح مرہٹی زبان بھی تھوڑی بہت سیکھی اور ابھی تک ان زبانوں میں لکھنا پڑھنا جاری رکھے ہوئے ہوں۔ اس شوق اور صحبتوں کی وجہ سے ہندوؤں اور پارسیوں کی مذہبی کتب پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ان مذاہب سے تعلق رکھنے والے طلباء سے بھی مباحثے کا اچھا خاصا موقع ملا کرتا تھا جس سے تعصب ختم ہونے کا موقع ملتا تھا۔ دوسرے مذاہب کے اصول بھی مکمل طور پر سمجھ میں آنے اور پسند آنے لگے۔ مرزا حیرت تصوف سے شغف رکھتے تھے اور پکے صوفی تھے۔ انھی کی بدولت مجھے بھی صوفیت کو سمجھنے کا موقع ملا۔ مطلب یہ کہ جس طرح بچپن میں، میں نے اپنے والد کی صحبت سے علم سیکھا اور خوب سیکھا، اسی طرح بمبئی میں مرزا حیرت کی صحبت سے بھی بہت کچھ حاصل ہوا۔ اس کے لیے میں ان کا بہت شکرگزار ہوں اور زندگی کی آخری گھڑی تک احسان مند رہوں گا۔

ایک تو فارسی میں مہارت دوسرے طلباء کی زیادہ تعداد کی وجہ سے، مرزا حیرت کی تحریری سفارش پر مجھے کالج میں فیلو مقرر کیا گیا۔ چھوٹی کلاسوں، بلکہ کبھی کبھار تو بڑی کلاسوں کو بھی فارسی پڑھایا کرتا تھا بالکل اسی طرح جیسے ہائی اسکول میں پڑھنے کے دوران بڑی کلاسوں کو فارسی پڑھایا کرتا تھا۔ کالج کے دو پرنسپلو کے خطوط (میری ترقی کی بابت) بارھویں باب (نمبر ۵ اور ۶) میں موجود ہیں۔ سندھ کے طلباء میں سے، میری دوستی مسٹر ہاسارام منگھر ملانی، مسٹر ٹیکچند واسوانی، مسٹر لیلارام لالوانی، مسٹر سھیانومل ملکانی اور مسٹر دولت رام سے تھی۔ ان میں سے صرف مسٹر لیلارام بقید حیات ہیں۔ مسٹر چندورکر، مسٹر آدرجی ولال، مسٹر کاؤجی جیجی بھائی، مسٹر رستم جی پٹیل وغیرہ بھی میرے ہم سبق تھے۔ ان میں سے اکثریت نے کافی نام

کمایا۔ اس دور کی ایک بات یاد آتی ہے جس سے مجھے اپنی نالائقی اور کم عقلی کا احساس ہوتا ہے۔ سندھی طلباء میں سے ایک طالب علم پر مرزا حیرت کی مہربانیاں دیکھ کر مجھے حسد ہوا۔ اس طالب علم نے اخبار ''ٹائمز آف انڈیا'' میں کچھ خطوط لکھے جن میں مرزا حیرت کی شکایت کے ساتھ ساتھ میرے فیلو بننے پر بھی اعتراض اٹھایا۔ وہ گمنام خط تھے۔ یہ دیکھ کر مرزا حیرت کو بہت غصہ آیا۔ آخرکار دیگر طلباء جو میرے دوست اور خیر خواہ تھے، انھیں علم ہوگیا کہ یہ گمنام خط کس کی شرارت ہیں۔ بلکہ اس طالب علم نے مزید ایک خط لکھ کر جب اپنے نوکر کو سپردِ ڈاک کرنے کے لیے دیا تب میرے دوستوں نے کسی ترکیب سے وہ خط نوکر سے لے کر میرے حوالے کردیا۔ مجھے بھی بہت افسوس ہوا۔ اپنے دوستوں کے کہنے پر میں نے وہ خط جا مرزا حیرت کو دکھایا۔ انھوں نے بہت غم و غصہ کا اظہار کیا کیونکہ وہ سب شاگردوں پر مہربان تھے اور وہ شاگرد تو ان کے پاس کچھ زیادہ ہی آتا جاتا تھا۔ مرزا حیرت نے وہ خط غصے سے پھاڑ دیا۔ اس شاگرد کو خوب ڈانٹا اور دوبارہ اسے اپنے پاس نہ آنے دیا۔ اس صورت حال کی وجہ سے میں اس وقت بہت پشیمان ہوا اور اب تک ہوں کہ خط نہ دکھاتا تو اچھا تھا۔

کالج میں، میں نے ''لاء'' یعنی قانون بھی پڑھا۔ اس خیال سے کہ بی اے کرنے کے بعد ایل ایل بی کرسکوں۔ قانون کا پہلا امتحان جورس پروڈنس (Jurisprudence) بھی دیا اور کامیاب ہوا۔

کالج میں ۲۰ روپے ماہوار سندھ سے اسکالرشپ تو ملتی ہی تھی، کالج کے امتحانات میں کامیابی کی بناء پر ایک اور ۲۰ روپے ماہوار کی اسکالرشپ بھی شروع ہوئی۔ اس کے علاوہ گھر میں پانچ فارسی شاگرد جن کا تعلق متمول گھرانوں سے تھا، پانچ، دس روپے میں مجھ سے فارسی پڑھا کرتے۔ ان پیسوں سے میرا گزر سفر اچھی طرح ہوجاتا تھا۔ سندھ سے آیا ہوا ملازم بھی میرے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے علاوہ، بڑے بھائی مرزا صادق علی بیگ اور دیگر بھائی بھی وقتاً فوقتاً پیسے بھجواتے رہتے تھے۔ ٹرم مکمل ہونے پر، مہینہ ڈیڑھ مہینہ چھٹی ملتی تھی۔ میں ان چھٹیوں میں زیادہ تر گاؤں جاتا تھا۔ ایف اے پاس کرنے کے بعد جب چھٹیوں میں گاؤں

آیا تب بھائی غلام رضا بیگ میر پور خاص میں میروں کے استاد تھے اور بھائی صادق علی بیگ کراچی میں ڈیپو کے کیوریٹر تھے۔ میں نے ان کے پاس کافی دن گزارے۔ جب میں دوسری بار چھٹیوں میں آیا تب بھائی مرزا غلام رضا بیگ ٹنڈو محمد خان میں میروں کے پاس تھے اور مرزا صادق علی بیگ شکار پور ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ پہلے کی طرح اس دفعہ بھی ان کے پاس کئی دن گزارے۔ ان کی صحبت میں میرا وقت بہت اچھا گزرتا تھا اور میری وجہ سے وہ بھی بہت خوش رہتے تھے۔

میری غیر موجودگی میں، امی ۱۲۹۳ھ، ۱۸۷۶ء میں انتقال کر گئیں۔ میں ان دنوں بمبئی میں قیام پذیر تھا۔ جلد ہی میں بھی چھٹیوں میں گھر آیا۔ مجھے امی کے انتقال کا علم نہ تھا۔ گاؤں پہنچا تو دیکھا کہ سوئم کا کھانا بیٹھک میں کھلایا جا رہا ہے اور کثیر تعداد میں لوگ جمع ہیں۔ امی کی وفات کا مجھے بہت صدمہ ہوا اور پوری چھٹیاں ماتم کرتے گزریں۔ بحالتِ مجبوری واپس بمبئی پہنچا حالانکہ جانے کی خواہش نہ تھی۔ بمبئی میں بھی میرا حال خراب رہنے لگا نتیجتاً بی اے میں فیل ہوگیا۔ اس لیے زیادہ ہی دل شکستہ ہوا مگر لاچار پھر محنت کرنے میں لگ گیا۔ میرے فیل ہونے کا سن کر میرے عزیزوں، پروفیسروں اور دوستوں کو حیرانگی بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ جس قدر عزت اسکول اور کالج میں کمائی تھی، اتنی ہی شرمندگی اور ملال کا سامنا تھا۔ پھر تو جلد ہی بیمار پڑ گیا اور ڈسینٹری یا پیچش میں مبتلا ہوگیا۔ کالج میں میری کارکردگی اور ترقی کے حوالے سے دو پرنسپلوں کی رپورٹیں بارھویں باب میں شامل ہیں۔

یہ بیماری مہینوں چلی اور اس قدر بیمار ہوا کہ ڈاکٹروں نے ہسپتال میں داخل ہونے کا مشورہ دیا تاکہ مستقلاً ڈاکٹرز کی نگرانی میں رہوں۔ مجبوراً، کالج چھوڑ کر مسٹر خورشید جی کنٹراکٹر اور مسٹر رستم جی گمی کے گھر جا کر رہنے لگا۔ مسٹر رستم جی کے بھائی ڈاکٹر رتن جی گمی میری دوا وغیرہ کا خیال رکھتے تھے۔ بڑے ڈاکٹر صاحب بھی کبھی کبھار مجھے دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ ایک بار تو میڈیکل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر کک بھی مجھے دیکھنے آئے مگر بیماری نے جان نہ چھوڑی۔ آخر کار صلاح و مشورے سے کہا گیا کہ بمبئی کی مرطوب ہوا سے نکل کر اپنے وطن کی

خشک ہوا میں جاؤں۔ یہ بھی مشورہ دیا گیا کہ سمندری راستے سے جانے میں مرض کی شدت بڑھنے کا خطرہ ہے۔ بادل نخواستہ براستہ ریلوے روانہ ہوا۔ یہ ۱۸۷۶ء کا واقعہ ہے۔ ہندوستان کے مشہور شہر دیکھتا، گھومتا، ملتان تک پہنچا اور وہاں سے پھر دریا کے راستے بذریعہ آگبوٹ کوٹری پہنچا کیونکہ ان دنوں ملتان اور کوٹری تک ریل کی پٹری نہیں تھی۔ اس سفر کا بیان یا ڈائری میں نے علیحدہ سے لکھی ہے جو ابھی تک موجود ہے۔ راستے میں البتہ پیچش کی تکلیف بدستور رہی۔ گاڑں پہنچ کر میں ٹھیک ہوگیا۔ کچھ آرام کے بعد پھر بمبئی گیا تاکہ بی اے کرسکوں۔ عجیب اتفاق ہے کہ بمبئی پہنچتے ہی پھر بیمار پڑ گیا۔ اس کے باوجود کوشش کرکے امتحان دیا۔ دوبارہ فیل ہوا۔ اس دوران اسکالرشپس بھی بند ہوگئیں۔ کالج کے بورڈنگ میں رہنے کا حق بھی چھن گیا۔ ہوا ناموافق ہوئی اور میں بار بار بیمار پڑنے لگا۔ اس صورت حال کی وجہ سے زیادہ دل شکستہ رہنے لگا۔ بحالت مجبوری بمبئی اور کالج کا پیچھا چھوڑ کر واپس آگیا اور بھائی مرزا صادق علی بیگ کے پاس کراچی رہنے لگا۔ اپنے ان آلام کا ذکر ایک انگریزی شعر میں کیا جو ''لیئر آورس'' نامی کتاب میں موجود ہے۔

انھی دنوں مرزا صادق علی بیگ نے بہنوں اور دائیوں کے ہمراہ کراچی رہنا شروع کیا۔ اس سے پہلے ہمارے خاندان کے لوگ اپنے آبائی گاؤں یا گھر چھوڑ کر کبھی باہر نہیں گئے تھے۔ ہمیشہ سخت پردہ رہا۔ پہلی بار کسی نے ایسا کیا تھا۔ لہٰذا محلے پڑوس والے ملنے جلنے سے گریز کرنے لگے۔ مگر ہم نے دھیان نہیں دیا۔ ماموں، مرزا علی محمد بیگ، ڈپٹی، بھی ان دنوں کراچی رہتے تھے اس لیے ہم سب ساتھ رہنے لگے۔ ماموں عجیب آدمی تھے۔ بہت اچھے مزاج والے، خدا پرست انسان۔ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور میں بھی ان کی صحبت میں بہت خوش ہوا۔ انھیں شاعری کے علاوہ نثری کتابوں کے مطالعہ کا شوق تھا اور اس شوق میں، میں بھی ان کے ساتھ شامل رہتا تھا۔ جلد ہی ۱۸۷۷ء میں بھائی مرزا صادق علی بیگ کی شادی ماموں مرزا علی محمد بیگ کی بیٹی سے انجام پائی پھر ہماری بڑی بہن کی شادی ماموں مرحوم کے بیٹے مرزا کلب علی بیگ کے ساتھ ہوئی، جو بعد میں ڈپٹی کلکٹر بنے۔ ہماری چھوٹی بہن... کی شادی

ماموں مرزا ولی محمد بیگ کے بیٹے مرزا حسین علی قلی بیگ کے ساتھ ہوئی جو مجالکار تھے۔ دونوں کا انتقال ان عہدوں پہ فائز رہتے ہوئے ہوا۔ بھائی مرزا صادق علی بیگ اپنے بال بچوں کے ہمراہ کراچی رہنے لگے۔ یہیں سے بغرضِ ملازمت بیوی بچوں کے ساتھ قیام پذیر ہونے کی رسم ہمارے پاس شروع ہوئی جو کہ اس سے قبل سخت پردے کی وجہ سے ممکن نہ تھی۔ گھر سے ڈولی میں بال بچوں کو لے جا کر، ٹرین اسٹیشن پر قنات لگا کر انھیں گاڑی میں بٹھایا جاتا تھا۔ اور پھر اسی طرح اہلِ خانہ کو گاڑی سے اتارا جاتا تھا۔ پیسہ بہت خرچ ہوتا تھا اور تکلیف بھی ہوتی تھی مگر عزت و آبرو کے خیال سے مجبور تھے۔ جبکہ تمام افراد کے ساتھ رہنے کی وجہ سے کھانے پینے کا خرچہ گھٹ جاتا تھا اور غیر حاضری کی وجہ سے بال بچوں کو انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ یوں کراچی میں مجھے دو سال گزارنے پڑے۔ کچھ اور کام کاج تو تھا نہیں۔ بیماری بہت کاٹی تھی اس لیے ہوا کی تبدیلی، آرام کرنے اور تندرست ہونے کا اچھا موقع میسر آیا۔ بیٹھا مطالعہ کرتا رہتا۔ فریئر ہال لائبریری اور گاڑی کھاتہ ہائی اسکول کے قریب واقع جنرل لائبریری جاتا تھا۔ ان دنوں فریئر ہال لائبریری کے لائبریرین مسٹر مُرے تھے جبکہ جنرل لائبریری کے لائبریرین مسٹر دیارام گدومل تھے جو ان دنوں صدر کورٹ کے رجسٹرار بھی تھے۔ ان کے بعد مسٹر موتی رام شوقی رام لائبریرین بنے۔ ان دنوں میں انگریزی میں شاعری کرتا تھا جو انگریزی اخبار "سندھ نیوز" میں چھپتے تھے جبکہ فارسی اشعار "مفرح القلوب" میں شایع ہوتے تھے جن میں دیگر ہم عصر شعراء کا کلام بھی شایع ہوتا تھا۔ انگریزی اخبار کے ایڈیٹر مسٹر جیفریز تھے، جو یوں تو بہت ذہین تھے مگر بلا کے شراب نوش تھے۔ ان سے اور ان کے افرادِ خانہ سے میری بہت دوستی تھی۔ جب وہ زیادہ پی لیتے تھے تب انھیں اخبار کا ہوش نہ رہتا تھا اس وجہ سے ان کی بیگم اور بیٹیوں کے کہنے پر میں اخبار نکالا کرتا اور لیڈنگ آرٹیکل یا دوسرے مضامین دیتا۔ مسٹر جیفریز کا انتقال بھی دورانِ مے نوشی ہوا۔ اخبار "مفرح القلوب" کے مہتمم ابتداء میں تو مرزا مخلص علی تھے، پھر ان کے بیٹے مرزا محمد شفیع بنے، جن کے چھوٹے بھائی مرزا محمد جعفر بعد میں سندھ کالج کے پروفیسر بنے۔ اس کے علاوہ کراچی کے کئی ہندو و مسلمان معزز افراد سے میری دوستی ہوئی۔

خاص طور پر مسٹر حسن علی، مسٹر دیا رام اور ادھا رام، مسٹر بنیر جی، آغا پولیس انسپکٹر اور دیگر کئی۔
مسٹر دیا رام جیٹھ مل ان دنوں سندھ کالج کا آغاز کر رہے تھے، وہ مجھے فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے کالج میں دیکھنا چاہتے تھے مگر میرا ارادہ محکمہ ریونیو میں ملازمت کرنے کا تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ مسٹر حسن علی مدرسہ قائم کر رہے تھے لہٰذا میں اس کام میں ان کی مدد کر رہا تھا۔ جس کا مفصل ذکر میں نے ان کی سوانح عمری میں لکھا ہے۔

ان دنوں، ماموں مرزا علی محمد بیگ، مراد خاں پٹھان کی اسٹیٹ سنبھال رہے تھے۔ وہ حب ندی پہ رہتے تھے۔ ان کے تعلقات پٹھان برادری کے لوگوں سے زیادہ تھے۔ میں بھی کئی کئی دن ان کے پاس جا کر رہتا تھا۔ پٹھانوں کی صحبت میں مجھے پشتو سیکھنے کا شوق ہوا۔ گرامر اور ڈکشنری خریدی اور پٹھانوں کی مدد سے پشتو سیکھنا شروع کی۔ کئی پشتو اشعار بھی از بر کئے۔ کچھ ہی دنوں بعد سردار شیر علی خان، والئی قندھار سردار محمد حسن خان، سردار حیدر خان اور دیگر کئی سردار بھی نظر بندی کی وجہ سے کراچی آ کر رہنے لگے۔ ان سے بھی بہت میل ملاقات رہی۔ یوں فارسی اور پشتو کا استعمال خوب رہا۔ آغا خان کے بڑے بیٹے آغا علی شاہ بھی ان دنوں کراچی میں رہتے تھے۔ مسٹر حسن علی بھی ان سے ملنے جاتے تھے میری بھی یاد اللہ تھی کیونکہ میں ان کے والد بڑے آغا خان، ان کے بھائیوں اور دیگر عزیزوں سے قریب رہا تھا۔ آغا خان اور ان کے مرید خواجوں کے مذہب کا ذکر میں نے "تحفۂ اسماعیلیہ" میں کیا ہے۔ جو ان لوگوں نے خود شایع کروایا ہے۔

بھائی مرزا جعفر قلی بیگ بھی ولایت سے ڈاکٹر بن کر پہنچے اور کراچی میں ہسپتال کھولا۔ مسٹر ہیرا نند ان کے دوست تھے اور اسپتال کے کاموں میں بہت مدد کرتے تھے بلکہ کمپاؤنڈر بن کر کام کرتے تھے۔ مسٹر گپتا اور مسٹر بادشاہ پروفیسر بھی ان دنوں کراچی میں ہوتے تھے، اس لیے ان سے بھی رابطہ رہتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ہم سب مل کر، آدھی رات کو بھیس بدل کر، کراچی میں بغدادی اور دیگر علاقوں کے لوگوں کی خبر گیری کے لیے جایا کرتے تھے۔ واقعات کی حقیقت اور پھر صورت

حال سنوارنے کے بارے میں مسٹر گپتا اور مسٹر ہیرا نند اخبار ''فینکس'' میں لکھتے تھے۔ چنڈو خانوں، قہوہ خانوں، جوا خانوں، چکلوں اور رنڈیوں کے پاس بھی جاتے تھے اور ان کی باتیں، راگ اور وہ احوال سنتے تھے جن کا کسی اور ذریعے سے سننے کا امکان نہ تھا۔

ایک بار تو یار دوستوں نے مجھے پٹھان بنا کر، بغدادی کے ایک دلال کو کہا کہ ''اس خان کے لیے کسی معزز گھرانے کی لڑکی چاہیے کوئی بازاری عورت نہیں''

اس نے ہمیں اچھے گاہک سمجھ کر، تین چار معززین کے نام بتائے، جہاں سے وہ لڑکیاں لا سکتا تھا ہم نے کسی ایک کو لانے کے لیے کہا۔ جیسے ہی وہ گیا، پیچھے سے ہم سب بھاگ آئے۔ بیچارہ واپس آ کر پچھتایا ہوگا شاید بیچاری لڑکی کو بھی رلایا ہوگا اور ہمیں بھی خوب گالیاں دی ہوں گی۔

ان دنوں میں جوان تھا۔ یوروپی افراد کے گھروں میں زیادہ جانے کی وجہ سے نوجوان لڑکیوں سے بات چیت کرنے کا موقع ملتا تھا اس لیے انگریزی لباس، کالر اور ٹائی وغیرہ کی عادت پڑ گئی۔ کلین شیو رہتا تھا۔ بلکہ ان دنوں یہ خیال بھی رہا کہ کسی یوروپین یا یوریشین لڑکی سے شادی کی جائے مگر چونکہ بر سر روزگار نہ تھا اور کسی اور ذریعہ آمدنی کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ خیال مہمل رہ گیا۔ بہر حال انگریزی بولنے، انگریزی راگ سیکھنے اور گانے بلکہ ناچ سیکھنے کا بھی موقع ملا۔ کالج کے زمانے کی میری انگریزی شاعری یا تو اخبار میں شایع ہوئی یا ایک چھوٹی کتاب کی صورت میرے ایک پارسی دوست نے شایع کی۔ کتاب کا نام ''لیزر آورس'' ہے اس کتاب کا انتساب میں نے اپنے استاد پرنسپل ورڈز ورتھ کی اجازت سے ان کے نام کیا ہے۔ اس کتاب میں، میرے کالج کے ایام کے بارے میں، امتحان میں فیل ہونے، کالج کی ڈرامیٹک سوسائٹی میں شمولیت اور کراچی کے کئی تجربات اور مشاہدات کے متعلق بھی کچھ اشعار ہیں۔

اس دور میں کراچی میں مسٹر مچھی بہت مشہور فوٹو گرافر تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے اہل خانہ کے ساتھ بھی میری دوستی ہوگئی۔ اکثر ان کے پاس آتا رہتا تھا۔ میں نے اور

میرے بھائی مرزا صادق علی بیگ نے اس سے فوٹو گرافی سیکھی۔ فوٹو گرافی کے ضروری لوازمات خریدے اور تصاویر بنائیں۔ امی، دونوں بہنوں اور دونوں دایوں کی تصویریں ہمارے پاس اب بھی موجود ہیں۔ اس سے قبل ہمارے خاندان میں کسی عورت کی تصویر نہیں بنی تھی۔ بلکہ والد صاحب اور نانا کی تصویر بھی ہمارے پاس نہیں۔ جس کا ہمیں بہت افسوس ہے کہ یہ فن پہلے سیکھتے تو بہتر ہوتا۔

ملازمت کے دنوں کا احوال

ابتدائی ابواب میں، جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے کہ کالج چھوڑ کر آنے کے بعد دو تین سال، کراچی میں بغیر کسی کام کاج کے، گھومنے پھرنے، دل بہلانے، اور معزز افراد و ہم خیال دوستوں کی صحبت میں گزارے۔ پھر بھائی، ماموں اور چند دوسرے احباب نے مشورہ دیا کہ روینیو ڈپارٹمنٹ میں سرکاری نوکری حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ان کے مشورے پر میں نے قانون کی کتب کا مطالعہ شروع کیا اور دفتروں میں جا کر کام کی نوعیت سمجھنے لگا۔ اُن دنوں پہلے کرنل لامبرٹ اور پھر کرنل والس، کراچی کے کلکٹر تھے میں نے ان سے تحریری طور پر اجازت لی تاکہ مختیار کار یا کلکٹر کے دفتر جا کر کام دیکھوں اور سیکھوں۔ سہون والے لالہ گیان چندان دنوں کراچی کے مختیار کار تھے۔ اور مسٹر فرامروز چھکی (پارسی) تعلقہ کے ہیڈ منشی تھے۔ ان سے بڑی اچھی دوستی ہو گئی اور وہ مجھے کام سکھانے لگے۔ دن کا بڑا حصہ ان دفتروں میں گزرنے لگا۔ یوں خزانے، فوجداری اور روینیو کے کام سے واقفیت ہونے لگی۔ قانون کی کتب کا مطالعہ بھی جاری تھا۔ پھر مجسٹریسی کا امتحان دیا جو اس سال کچھ زیادہ ہی مشکل آیا، بہرحال تمام امیدواروں میں سے میں واحد کامیاب امیدوار تھا۔

انھی دنوں، میرے دوست مسٹر دولت رام جیٹھمل جو کراچی ہائی اسکول میں ساٹھ روپے ماہوار پر فارسی کے استاد تھے، محکمۂ جوڈیشری میں سرشتہ دار مقرر ہو کر شکار پور گئے اور یوں فارسی استاد کی جگہ خالی ہو گئی۔ میری فارسی دانی کے باعث تمام افراد نے مجھے ان کی جگہ کام کرنے کے لیے اصرار کیا۔ مسٹر ملائی وہاں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کے ساتھ کچھ مہینے بحیثیت

فارسی کے استاد کام کیا۔ اسسٹنٹ کمشنر مسٹر آلیونٹ، کچھ عرصے بعد پھر کمشنر بن کر آئے، ان کی خاص مہربانی اور صلاح ومشورے سے، میں مختیار کار کی ذمہ داریاں سمجھنے کے لیے ضلع شکار پور کے تعلقہ "ککڑ" میں ہیڈ منشی بن گیا۔ یہ تعلقہ ان دنوں میہڑ ڈویژن میں تھا مسٹر نارول سیوانی ڈپٹی کلکٹر اور مسٹر قیمت سنگھ لاڑکانائی ان کے ہیڈ منشی تھے۔ کرنل واسی شکار پور کے کلکٹر تھے اور دیوان لالہ گیان چند، دیوان چانڈومل کے بعد، وہاں کے دفتر دار ہوئے۔ دو تین مہینے ککڑ میں بحیثیت ہیڈ منشی کام سیکھا۔ پھر مجھے میہڑ ڈویژن کے تعلقہ تھرڑی محبت کا مختیار کار بنا دیا گیا جہاں میں نے دو تین سال گزارے۔ میرے کردار و کارگزاری کے باعث بالا افسران سے لے کر مقامی زمیندار تک مجھ سے بے حد خوش رہے۔ دیوان پارومل تو ایسے مہربان دوست بنے جنھوں نے آخر تک ساتھ نبھایا۔ (میرے بارے میں اس دور کے بالا افسران کے خطوط کی نقل بارہویں باب میں موجود ہے)

تھرڑی محبت کے قریب رادھن اسٹیشن، ان دنوں بڑا اسٹیشن شمار ہوتا تھا، لہٰذا وہاں انجن شیڈ ہوتا تھا۔ یہاں اکثریت یوروپین افراد کی تھی۔ اسٹیشن ماسٹر، فورمین، ڈاکٹرز، انجینئرز اور دیگر کئی یوروپین وہاں رہتے تھے۔ ان سب سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ میرے پاس بیوی بچوں سمیت آتے اور ہم ایک ساتھ کھانا وغیرہ کھاتے تھے۔ میں بھی ان کے پاس ملاقات کی غرض سے اکثر رادھن جایا کرتا جو کہ تھرڑی سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے۔ نیا نیا کراچی سے آیا تھا جہاں نوجوان خواتین کی صحبت میسر تھی۔ عالم جوانی تھا، پچیس برس کی عمر میں نوکری شروع کی تھی، شادی کا خیال بھی ذہن میں موجود تھا اس لیے رادھن کے اسٹیشن ماسٹر مسٹر مرے کی بڑی بیٹی سے مجھے بہت محبت ہوگئی جس کا نام "ایلس" تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹی تھی۔ اس سے شادی کرنے کی خاطر اس کے ماں باپ تک بات پہنچائی۔ وہ میرے کردار و اطوار سے بخوبی واقف تھے۔ یہ مسٹر مرے، کراچی فریئر ہال لائبریری کے لائبریرین مسٹر مرے کے چھوٹے بھائی تھے جنھیں میں اچھی طرح جانتا تھا۔ لڑکی کے والدین نے حیدرآباد کے پادری مسٹر شرٹ سے بھی میرے بارے میں رائے لی جس نے نہ صرف میری بہت تعریف کی بلکہ

انھیں مشورہ دیا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی یہاں کر دیں۔ مسٹر مرے کے بھائی نے بھی انھیں اجازت دی۔ وہ ہما ے بارے میں سوچتے تھے کہ یہ دراصل اہل سندھ نہیں ہیں، والد بھی عیسائی تھے لڑکا اچھا برسر روزگار ہے لہٰذا کیا قباحت ہے؟ اور انھی دنوں میر عبدالحسین خان نے بھی ٹنڈو اللہ یار والے ڈاکٹر رامیٹ کی بیٹی سے شادی کی تھی لہٰذا مسٹر اور مسز مرے، دونوں نے خوشی خوشی مجھے شادی کی اجازت دے دی۔ میرے بھائیوں کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ میں شادی کی تیاری کرنے لگ گیا۔ نکاح کے طریقہ کار پر البتہ تحریری طور پر معاہدہ ہوا مگر بالآخر یہی طے کیا گیا کہ دو جگہ پر دو طریقوں سے نکاح پڑھا جائے یعنی عیسائی رسم کے مطابق بھی اور مسلمانوں کی رسم کی طرح بھی۔ اجازت کے لیے لاہور کے بشپ کے پاس درخواست بھیجی گئی۔ مگر بشپ کا اصرار رہا کہ یہ شادی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ دولہا خود کو عیسائی نہ ظاہر کرے۔ دونوں طرف سے بہت کوشش ہوئی کہ کسی طرح پادری اپنا فیصلہ بدل لے، اس ضمن میں میر عبدالحسین کی شادی کی مثال بھی دی گئی مگر اس نے اپنا فیصلہ تبدیل نہ کیا۔ میں خود کو عیسائی ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ ہم دونوں بہت کرب سے گزرے۔ آخر کار خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ جلد ہی مسٹر مرے کا تبادلہ سکھر کی طرف ہو گیا اور میرا بھی تبادلہ ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے شادی کی نیت سے مسٹر مالکس جو منوڑہ میں رہتے تھے، کی بیٹی سے خط و کتابت کی۔ کراچی میں قیام کے دوران میری اس سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ اس بات پر بھی کئی اعتراضات ہوئے۔ ناامید تو ہوا مگر اسے اللہ کی خاص مہربانی سے تعبیر کیا کہ کسی غیر اسلامی، یوروپین گھر میں شادی نہ ہوئی۔ اور اس کرم کے لیے ہمیشہ اللہ کا شکر گزار رہا ہوں۔

مندرجہ بالا ذکر کی تصدیق کے لیے بارھویں باب میں پادریوں اور دیگر افراد کے خطوط بھی شامل ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ پسند کی شادی نہ ہونے کے باعث مجھے بہت صدمہ ہوا کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ کئی افراد تو ایسے حساس معاملات میں خود کو کرسچن بھی ظاہر کر سکتے تھے مگر مجھے فخر ہے کہ ایسے نازک معاملے میں بھی میں اپنے نفس پر غالب آیا۔ ان تمام سوچوں کے باوجود مجھے عیسائیوں پر شدید غصہ آیا۔ میرا

بدلہ اس قوم سے میرے بھائی ڈاکٹر مرزا نے لیا جس نے اس قوم سے دو شادیاں کیں۔ بلکہ دیگر کئی افراد آج تک میرا بدلہ لے رہے ہیں۔

مندرجہ بالا باتوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ میں سندھی دیسی شادی کے حق میں نہیں تھا ورنہ میرے گھر والے میری شادی میرے چھوٹے بھائی مرزا علی قلی بیگ سے قبل کرتے۔۔ دراصل بمبئی اور کراچی میں زیادہ وقت گزارنے کے باعث اس طرح کے خیالات پیدا ہوئے تھے اور جوانی کی مستی نے ان جذبات کو ہوا دی۔ بمبئی میں مرزا حیرت مرحوم کی صحبت میں مجرد رہنا زیادہ بھایا۔ کراچی اور رادھن میں انگریز خواتین کی قربت سے شادی کا خیال بیدار ہوا تھا اور وہ بھی فقط یوروپین سے۔ مگر چوں کہ اللہ کی مرضی نہ تھی اس لیے یہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ خیال غلط اور برا تھا کیونکہ دو مذاہب و دو اقوام کی صحبت زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوتی اور ان کے رہن سہن کے مطابق میری تنخواہ بھی ناکافی ہوتی۔۔ اس کے علاوہ، غالباً اس زمانے کے یوروپین افسران کو بھی یہ بات پسند نہ آتی اور مجھے جان بوجھ کر تکلیف پہنچاتے، مجھ سے بدظن رہتے اور میرے کردار کے متعلق غلط آراء رکھتے۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ اس میں اللہ کی رضا اور میرا فائدہ تھا۔ تھرڑی محبت کے بعد کچھ دن تعلقہ میہڑ تبادلہ ہوا، مگر پھر جلد ہی پہلے جوہی پھر تعلقہ وارہ یا نصیر آباد میں میری پوسٹنگ ہوگئی۔ وہاں میں کوئی تین سال رہا۔ راگ کا شوق بڑھ گیا۔ لہٰذا دو گلوکار جو کافیاں گانے میں مہارت رکھتے تھے انھیں میں نے اپنے پاس رکھا اور جہاں جاتا انھیں ساتھ لے جاتا۔

ان سے کافیاں سنتے، مجھے کافی لکھنے کا خیال آیا اور کئی کافیاں لکھیں جنھیں وہ دونوں گلوکار گاتے تھے۔ ان گلوکاروں کے ذریعے میری لکھی ہوئی کافیاں اور غزلیں ضلع شکارپور میں مشہور ہونے لگیں۔ دیگر استاد گلوکار بھی میرے پاس آتے اور اپنے فن سے محظوظ کرتے۔ یہ تمام کلام میری کتاب ''سودائے خام'' میں موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جوانی کی مستی میں بڑے عجیب خیالات نے جنم لیا تھا اور شادی کی خواہش بھی بڑھ چکی تھی۔ اللہ کی مہربانی اور بچپن کی اعلیٰ تعلیم کا فائدہ یہ ہوا کہ بدکرداری سے محفوظ رہا اور حیا و شرم کے ساتھ

ساتھ خاندان کی عزت کا بھی خاص خیال رہا۔ اپنے کردار کی باعث لوگوں میں سراہا جاتا تھا۔ اپنی تعریف کرنا بے توفی اور دکھاوا گرداتنا ہوں لیکن اس کے باوجود بھی ایسے وقت و حالات میں اپنے نفس پر قابو رکھنے اور عزت و حیا کا پاس کرنے کی مثال دینا، اپنی اولاد کی ہدایت و فائدے کی خاطر مناسب سمجھتا ہوں۔

عین عالمِ جوانی اور موج مستی کی حالت میں، سرکاری ملازمت، اچھی تنخواہ اور ہر طرح کی سہولت ہوتے ہوئے بھی پرہیزگار اور پاک دامن رہنے کی سخت کوشش کی۔ شاید آج کل کے افراد کو اتنی آسانی سے اس بات کا یقین نہ آسکے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان دنوں کتنی ہی خوبصورت اور معزز لڑکیوں کے پیغام، مجھے نوکروں کی معرفت ملا کرتے تھے جنھیں میں نہ صرف رد کرتا تھا بلکہ ملازمین کو بھی ڈانٹ ڈپٹ کر آئندہ کے لیے تنبیہ کیا کرتا تھا۔

ایک بار تو، ایک دیہات میں (جس کا نام نہیں لکھوں گا) مجھے رکنا تھا، میں شامیانے میں سو رہا تھا کہ آدھی رات کے وقت کسی چیز کے پیروں سے ٹکرانے سے جاگ گیا۔ دیکھا تو میری چارپائی پر میرے پیروں کے قریب ایک جوان عورت بیٹھی ہے۔ شدید سردی کا موسم تھا۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ وہاں کے کسی زمیندار کی بیٹی تھی۔ میری تعریف سن کر مجھ سے ملنے کی خواہش مند تھی اور میرے بارے میں علم ہوا کہ یہاں ہوں تو اچھا موقع جان کے نکل آئی۔ شاید اس کے ساتھ کوئی اور مددگار نہیں تھا اس لیے تنہا ہی آگئی کیونکہ شامیانہ بہت قریب تھا۔ اس زمیندار سے میرے اچھے تعلقات تھے لہٰذا اس کی بیٹی کو وہاں دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ حالانکہ بھرپور جوانی کے باعث طبیعت ان دنوں دو آتشہ رہتی تھی اس کے باوجود مجھے بہت شرم اور تکلیف ہوئی۔ میں نے لڑکی کو سمجھایا، بہت نصیحت کی اور اس کے باپ کی عزت و مقام کا احساس دلایا۔ وہ خاموش بیٹھی سنتی رہی، کوئی لفظ منہ سے نہ بولی۔

سخت سردیوں کے دن تھے، میں نے اس پر اپنا اوور کوٹ ڈالا، شامیانے کے دروازے پر میرا ملازم سوتا تھا، اسے جگایا اور کہا کہ اس خاتون کو اس کے گھر کے دروازے تک

چھوڑ کر آئے۔ کسی اور سے یہ بات نہ کرنے کی سخت تاکید کی۔ روزمرہ کے معمولات کی طرح وہ زمیندار اگلے روز پھر میرے پاس آیا۔ اسے دیکھ کر میرے دکھ میں مزید اضافہ ہوا اور یقین ہوگیا کہ لڑکی کے دماغ میں فتور تھا یا پھر شاید بدکردار ہو۔ اس لیے پہلے تو خیال آیا کہ گذشتہ رات کے واقعہ کے بارے میں اسے بتاؤں یا اشارے کنائے سے آگاہ کروں تاکہ وہ آئندہ کے لیے محتاط رہے اور آنے والی کسی ذلت سے بچ جائے۔ مگر یوں کرنا بھی مجھے مناسب نہ لگا لہٰذا کچھ نہ کہہ سکا۔ لیکن میرے دل میں بڑی تکلیف اور خوف تھا اور یہ احساس بھی ہوا کہ شاید ایسی بات سن کر وہ بے چارہ شرمندہ ہو اور یہ یقین نہ کرپائے کہ اس کی بیٹی یہاں سے پاک باز گئی ہے۔ لہٰذا خاموش رہا۔ وہاں سے تبادلہ ہونے کے تقریباً دو سال بعد سنا کہ اس لڑکی نے قریبی گاؤں کے کسی زمیندار سے بھاگ کر شادی کرلی ہے۔ لڑکی کے باپ نے زمیندار پر مقدمہ کیا اور لڑکی کے پچھلے نکاح کی بابت جعلی نکاح نامہ پیش کیا، جس طرح برادریوں وغیرہ میں ہوتا ہے۔ مگر جعلی نکاح ثابت نہ ہوا اور وہ لڑکی اسی زمیندار کے پاس رہتے ہوئے بچوں کی ماں بنی۔

تھرڑی، میہڑ اور وارہ تعلقوں میں ملازمت کے دوران میہڑ کے ڈاکٹر نجمن سے میری خاصی واقفیت بلکہ دوستی ہوگئی۔ وہ ہر جگہ مجھ سے ملنے آتے۔ جب انھیں پتہ چلا کہ میں شادی کے بارے میں سوچ رہا ہوں تو مشورہ دیا کہ میجر صوبیدار پنشنر، سردار بہادر شیخ اسماعیل کی بیٹی کے لیے رشتہ بھیجوں جوکہ خوبصورت اور پڑھی لکھی ہے۔ اس میجر صوبیدار کا تعلق بھی اسرائیلی یا یہودی قوم سے تھا۔ جس نے بعد میں اسلام قبول کرکے دہلی کے ایک مغل خاندان سے شادی کی اور صاحب اولاد ہوا۔ اس کے بڑے بیٹے کا نام محمد یعقوب تھا جو بعد میں سردار بنا اور اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ ڈاکٹر نجمن خود بھی یہودی تھے اور شاید میجر صوبیدار سے کوئی رشتہ داری بھی بنتی تھی اس لیے ان سے اچھی طرح واقف تھے اور گھریلو مراسم بھی تھے۔ ان کی دوستی محمد یعقوب سے تھی جو ان دنوں مختیارکار ٹھٹھہ تھے اور اس سے قبل کوٹڑی میں تعینات تھے۔ میں نے اس لڑکی کی تعریف کراچی والے مولوی محمود سے بھی سنی جو اس لڑکی کو پڑھاتے تھے۔ میری آمادگی پر ڈاکٹر نجمن نے میجر صوبیدار اور ان کے بیٹے سے اس بات کا ذکر کیا۔ ان کی رضا

مندی مجھ تک پہنچائی۔ لہٰذا میں نے اس سلسلے میں اپنے بھائی صادق علی بیگ کو لکھا۔ جنھوں نے یہ گزارش صوبیدار میجر کے گوش گزار کی۔ ضروری بات چیت کے بعد انھوں نے رشتہ دینا قبول کیا۔ میجر صوبیدار بہت عمر رسیدہ آدمی تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اپنی زندگی میں ہی بیٹی کے ہاتھ پیلے کر جائیں مگر قسمت میں ایسا نہ تھا۔ وہ اس شادی سے قبل ہی وفات پا گئے۔ میاں محمد یعقوب بھی مجھے جاننے لگے تھے اور ڈاکٹر بنجمن کے ساتھ وہ بھی ملاقات کے لیے آیا کرتے۔ میں ان دنوں تعلقہ جوہی میں تھا اور محمد یعقوب ضلع کراچی کے ایکٹنگ دفتر دار تھے۔ ہم تینوں منچھر پہ شکار کے لیے جایا کرتے تھے یوں واقفیت اور زیادہ بڑھی۔ گفت وشنید کرتے شادی کا پروگرام طے کیا۔ میں چوں کہ کچھ بیمار تھا اس لیے تین ماہ کی رخصت پر ہوا کی تبدیلی کے لیے بمبئی چلا گیا۔ میرے ماموں زاد مرزا قلب علی بیگ جو اس وقت تعلقہ لب دریا میں مختیار کار تھے اور مسٹر دولت رام جیٹھ مل، جو خود بھی رخصت پر تھے، میرے ساتھ چلے۔ آگبوٹ کے ذریعے گئے اور آئے۔ آتے ہی میں شادی کی تیاریوں میں لگ گیا۔ محمد یعقوب بھی کراچی میں رہتے تھے۔ ڈاکٹر مرزا اپنی بیگم کے ساتھ وہیں تھے۔ میری بہنیں اور بھائی مرزا صادق علی کے بال بچے اور دیگر کچھ قریبی عزیز کراچی پہنچے۔ وہاں ۲۵، دسمبر ۱۸۸۸ء کو میری شادی ہوئی۔ میری خواہش پر دونوں طرف سے کسی قسم کے گانے بجانے اور شہنائی وغیرہ کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ صرف کھانا ہوا اور نکاح پڑھا گیا۔ کراچی کے مولوی تاج محمد نے نکاح پڑھایا۔ شادی کے بعد کچھ دن تو وہیں ایک کرایے کے گھر میں رہے۔ پھر چھٹیاں ختم ہونے پر میرا تبادلہ گھوٹکی ہوا تو بیوی کو اس کے میکے چھوڑ کر نوکری پہ چلا گیا۔ میری بیگم کے بارے میں میجر ہیول کا خط اور اس کا جواب، جس میں، میں نے اپنی بیگم کے متعلق رائے دی ہے، بارھویں باب میں شامل ہے۔

حالانکہ ہم دونوں کی یہ پہلی شادی تھی اور بڑی خوشی اور ارمانوں سے کی گئی تھی مگر اس میں ایک بدشگونی ہوئی۔ عین شادی والے دن ڈاکٹر مرزا کی بیگم کی ڈلیوری ہوئی اور وہ بچہ جنم دیتے ہی چل بسی۔ شادی کا رنگ غمی میں بدل گیا۔ یوں لگا، گویا تمام رشتہ دار حیدرآباد سے

میری شادی میں شرکت کے لیے نہیں بلکہ بھائی کی بیگم کے انتقال پر آئے تھے۔ ڈاکٹر مرزا کا اس بیگم سے ایک ہی بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ''سڈنی'' رکھا گیا۔ یعنی ہمارے والد کے اصل نام پر۔ وہ پڑھ لکھ کر بڑا ہوا۔ بی اے، ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ آج کل ڈپٹی کلکٹر کے گریڈ میں انکم ٹیکس آفیسر ہے۔

اپنی شادی کے دن سے لے کر میں نے اپنی ذاتی ڈائری لکھنا شروع کی جس میں قابلِ ذکر باتیں درج کرتا ہوں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ جب میں نے گھوٹکی میں گھر لے لیا تب میری بیگم بھی وہاں آ گئیں۔ وہاں سے میرا تبادلہ روہڑی ہوا تب بھی ہم دونوں وہاں گئے۔ اس دوران، کراچی میں ۱۸۸۹ء میں ہماری بیٹی پیدا ہوئی جسے میری بیگم اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ اسی سال میں نے ڈپارٹمنٹل امتحان دیا اور کامیابی حاصل کی۔ کرنل میھو اس زمانے میں کلکٹر شکار پور تھے جبکہ مسٹر میولس اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ دونوں مجھ پر خاص مہربان تھے۔ میں نے تین ماہ تک ایکٹنگ ڈپٹی کلکٹر ہوتے ہوئے شکار پور میں سٹی مجسٹریٹ کی حیثیت سے کام کیا۔ بیوی بچے بھی میرے ساتھ رہتے تھے۔ وہاں سے ہم روہڑی آئے۔ اسی سال میرے دو بھائی نجف قلی اور حیدر قلی وفات پا گئے۔ ان کے انتقال کا مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ وہ ابھی جوان تھے، غیر شادی شدہ تھے۔ حیات کے پھل کا سواد پورا نہ چکھ سکے تھے۔ ان کی یاد میں، میں نے ایک کافی کہی جو گیارہویں باب میں شامل ہے۔

شادی کے بعد ہم میاں بیوی کا آپس میں کیسا سلوک تھا، اس ضمن میں دو چار الفاظ لکھنا ضروری ہیں۔ خاص طور پر اپنی اولاد کی ہدایت و واقفیت کے لیے۔ شادی کے اول دن سے لے کر ہم میاں بیوی دوست بن کر رہنے لگے گو وہ عمر میں مجھ سے چھوٹی تھی۔ کتابی علم نے ہمیں جو شعور بخشا، اس سے بہتر مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے کا سوچتے تھے جس کی ابتدا تو میں نے اپنی شادی سے کی کہ جو بے مقصد، بے معنی رسم و رواج اور رسومات پیسہ برباد کرنے کے لیے کی جاتی تھیں ان سے کنارہ کشی اختیار کی۔ چوں کہ ہم دونوں اکیلے رہتے تھے۔ لہٰذا لکھنے پڑھنے اور مختلف مضامین پر تبادلۂ خیال کا خوب موقع ملا۔ وہ ہندوستانی

زبان بولتی تھی اس لیے میں نے اسے بہت سی اُردو کتب اور اخبارات منگوا کر دیے اور انگریزی اور فارسی بھی سکھانے لگا۔ اس وقت سے لے کر آج تک ہمارے گھر میں ہندوستانی زبان ہی مروج ہے بال بچے بھی وہی زبان بولتے ہیں اور زنانہ لباس بھی وہی یعنی ساڑھی اور گاؤن نہ کہ قمیض شلوار اور چادر وغیرہ۔ کشیدہ کاری بھی عمدہ جانتی تھی اور کبھی کبھار کوئی خاص ڈش بھی شوقیہ بناتی تھی۔ ایک دوسرے کو خطوط لکھا کرتے تھے۔ شادی کے بعد، پہلا خط میں نے اسے گھوٹکی سے لکھا تھا، جو ابھی تک موجود ہے۔ میانہ روی سے زندگی گزارنے کے باعث پیسے کی بچت بھی کرنے لگے۔

میری نوکری شروع ہوتے ہی بھائی جعفر قلی پڑھائی کی وجہ سے ولایت گئے۔ میں اور بھائی صادق علی بیگ ان کی تعلیم ختم ہونے تک ماہانہ خرچہ بھیجتے رہے۔ جب میں نے شادی کا ارادہ کیا تب پیسہ بچانا شروع کیا جس سے زیور، کپڑے لتے وغیرہ خریدے اور شادی کا ضروری خرچہ کیا۔ شادی کے بعد حالانکہ اخراجات زیادہ ہوتے رہے پھر بھی بچت کی کوشش کی۔ روہڑی میں قیام کے دوران میں نے اور میری بیگم نے سندھی زبان میں دو کتابیں لکھیں۔ ایک "زینت" جس میں گھریلو زندگی کی بہتری کے متعلق خیالات درج ہیں اور کچھ خاندانی روابط کی تمثیلات بھی شامل ہیں اور دوسرا "صحت النساء" جس میں اولاد کی پیدائش، ان کی پرورش و تعلیم کا ذکر ہے۔ جب ہمیں پہلی بچی پیدا ہوئی، تب ہم بہتر طور طریقوں سے اس کی پرورش کرنے لگے۔ ۱۸۹۱ء میں تعلقہ کوٹڑی میں ہمیں بیٹا پیدا ہوا جہاں میری بیوی کے عزیز یعنی میاں محمد یعقوب اور ان کا کنبہ رہتا تھا۔ بچے کا نام نادر بیگ رکھا گیا۔ جلد ہی میں باقاعدہ ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے لاڑکانہ گیا اور مسٹر میولس کی ماتحتی میں کام کرنے لگا۔ میرے بیوی بچے بھی میرے ساتھ تھے جہاں ہماری دوسری بچی پیدا ہوئی مگر جلد ہی انتقال کر گئی۔ اسے وہیں دفنایا گیا۔ ایک بار پھر سیہون ڈویژن میں میری پوسٹنگ ہوئی۔ اسسٹنٹ کلکٹر مسٹر لیوکس سے چارج لیا اور کوٹڑی والے بنگلے میں رہنے لگا۔ پھر تین سال کے لیے تبادلہ جیکب آباد ہو گیا جہاں بیوی بچوں کے ساتھ رہا۔ اس کے بعد نوشہرو فیروز بدلی ہوئی، جہاں مسٹر قادر داد خان سے چارج لیا، جو بعد میں

ریاست خیر پور کے وزیر بنے۔ تین برس تک بلوچوں کی صحبت میں رہتے ہوئے بلوچی سیکھی۔ بلوچی گفتگو کے ساتھ ساتھ بلوچی لکھنا پڑھنا بھی شروع کیا۔ اس دوران مزید دو بھائی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ دونوں کراچی میں فوت ہوئے۔ بڑے بھائی مرزا غلام رضا ۱۸۹۵ء میں اور ڈاکٹر مرزا جعفر قلی ۱۸۹۸ء میں۔ ان کی میتیں کراچی سے حیدرآباد لائی گئیں اور انھیں گاؤں کے قبرستان میں دفنایا گیا جہاں ہمارے والدین اور چھوٹے بھائیوں کی قبریں تھیں۔ ان دونوں بھائیوں کی وفات کا بھی ہمیں بے حد صدمہ رہا۔ دونوں ہی اپنے بال بچوں کو یتیم کر گئے۔

بھائی مرزا غلام رضا بیگ کی شادی، مرزا قربان علی گرجی کی دختر سے ہوئی تھی انھیں اللہ نے ایک بیٹا اور ایک بیٹی عطا کی۔ دونوں الحمدللہ حیات ہیں۔ بیٹے کا نام مرزا منوچہر بیگ ہے جو کہ بیرون ملک جا کر بیرسٹر بنا اور یہاں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر کام کیا۔ بھائی نے دوسری شادی بھی کی، مگر مزید اولاد نہ ہوئی۔ بھائی مرزا جعفر قلی کا بیٹا مرزا سڈنی ہے، جس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔ پہلی بیگم کے انتقال کے بعد وہ ولایت گئے اور وہیں دوسری شادی کی، جس سے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی۔ ان کی بیگم اور تینوں بچے ماشاءاللہ حیات ہیں۔ ان کی بیٹی کی شادی، میرے بیٹے نادر خان سے ہوئی، جو کراچی میں بیرسٹر ہیں۔ اور میری بڑی بیٹی کی شادی مرزا سڈنی سے ہوئی۔ دونوں صاحب اولاد ہیں۔ ان کے بارے میں مزید تفصیل، کتاب کے آخر میں دیے گئے خاندان کے شجرے سے معلوم ہوگی۔ ابھی تک میرے پاس، میرا اپنا کوئی معقول، کشادہ گھر نہ تھا۔ تھوڑا تھوڑا والا، والدین کا گھر میرے تینوں بھائیوں، بھائی مرزا غلام رضا بیگ، بھائی مرزا صادق علی بیگ، بھائی مرزا علی قلی بیگ اور ان کے بیوی بچوں کے لیے بمشکل گزارے لائق تھا۔ میں جب بھی بیوی بچوں کے ساتھ گاؤں جاتا تھا، ہم انھی کے ساتھ رہتے تھے۔ مگر اب خیال آیا کہ اپنا گھر بنوایا جائے ایک کراچی اور دوسرا حیدرآباد میں۔ اس نیت سے تنخواہ میں سے سو یا دو سو یا کبھی کچھ زیادہ بچت کرتے رہے۔ کراچی میں عیدگاہ کے قریب سردار محمد یعقوب کا گھر تھا۔ اس کے قریب پلاٹ خرید کر بنگلہ بنوایا۔ محمد یعقوب کے دوست، سیٹھ واحد ڈنو میمن کے ذمے یہ کام لگایا تھا۔ وہ اپنے خرچے پہ

بنگلہ بنواتا گیا اور ہم ماہانہ، جو کچھ تنخواہ سے بچا پاتے اسے بھیج دیتے۔ آخر کار وہ بنگلہ دس ہزار روپے میں تیار ہوا اور اسے بچاس روپے کرایہ پہ دیا گیا۔ حیدرآباد میں ہمارے اصل گھر کے شمالی حصے میں، میاں ابراہیم اور ان کے بیٹوں کے دو گھر تھے۔ ان سے کچھ زمین لے کر اس پر ایک پکا گھر اپنے چھوٹے بھائی مرزا علی قلی بیگ کی معرفت بنوایا۔ اس گھر کی تکمیل پر پانچ ہزار روپے لگے۔ ہم اس گھر میں وقتاً فوقتاً آ کر رہنے لگے اور اب تک اس میں رہ رہے ہیں۔ اس گھر کے باہر ایک بیٹھک بنوائی تھی جو اب بھی استعمال میں ہے۔

اسی دوران ۱۹۰۰ء میں، میرے بیٹے نادر بیگ اور چھوٹی بیٹی پر اچانک کالرا وبا کا اثر ہوگیا۔ دونوں کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ آخر بیٹی فوت ہوگئی اور نادر بیگ بچ گیا۔ اس بیٹی کا ہم دونوں میاں بیوی کو بہت دکھ ہوا خصوصاً اس لیے بھی کہ وہ بہت ذہین تھی اور بڑی خوبصورت گفتگو کرتی تھی۔ دوسرا بیٹا بابر بیگ اپنی پیدائش کے بعد کم عرصہ جی پایا۔ پھر بیٹی پیدا ہوئی، وہ بھی فوت ہوگئی۔ پھر اختر بیگ کی پیدائش ہوئی، جو ماشاء اللہ حیات ہے۔ بیٹی کے انتقال کے صدمے اور بے آرامی کے باعث میں نے عارضی چھٹی کی درخواست دی اور آرام کیا۔ یہ چھٹی مارچ ۱۹۰۴ء میں لی۔

ان دنوں حیدرآباد اور اس کے آس پاس علاقوں میں طاعون پھیلا ہوا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا لہٰذا آبادی تیزی سے نقل مکانی کر رہی تھی۔ بھائی مرزا علی قلی جو پہلے ہی بیمار تھے اور اپنی بیماری کے باعث کراچی سے چھٹی منظور کروا کے آئے تھے، زیادہ بیمار ہوگئے اور آخر کار ۱۹۰۴ء میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ طاعون کے باعث ہم اپنا گھر چھوڑ کر باغ میں رہنے لگے، جہاں میری بیوی طاعون کا شکار ہوگئی۔ حاملہ تھی، بچی پیدا ہوئی مگر فوراً ہی رضائے ربانی سے انتقال کرگئی اور جلد ہی میری بیگم بھی ۱۹، مارچ ۱۹۰۴ء کو فوت ہوگئیں حالانکہ علاج کے لیے بہت سے طبیب، ڈاکٹر جمع ہوئے تھے۔ اسے اپنے خاندانی قبرستان میں دفنایا گیا۔ میں نے اس کی تاریخ وفات فارسی میں منظوم کی اور قبر کے سرہانے کتبے پر کندہ کروائی۔ جو اب بھی موجود ہے۔

ہم دونوں نے شادی کے پندرہ سال اور ڈھائی ماہ ساتھ گزارے۔ وہ ۳۳ برس کی عمر میں وفات پا گئی اس تمام عرصے میں اس نے مجھے ہر طرح راضی وخوش رکھا۔ میری خدمت کی، مجھ سے الفت کا اظہار کرتی۔ ہمیشہ فرمانبردار رہی۔ مجھ سے اور اولاد سے اسے بے پناہ محبت تھی۔ اپنی بیماری کے آخری ایام میں مجھے یا بچوں کو اپنے قریب نہ آنے دیتی تھی کہ کہیں انھیں بھی یہ موذی مرض نہ لگ جائے۔ مگر جس قدر بھی ممکن تھا، میں نے اس کی خدمت کی اور علاج کروایا۔ اس کی موت نے مجھے بے حد صدمہ پہنچایا۔ اس کی تصویر میرے پاس تھی بلکہ اس کی آواز بھی فونوگرام میں قید تھی، جسے اب تک کبھی کبھار سنتا ہوں، اور اسے یاد کرتا ہوں، اس بیوی سے اللہ نے مجھے تین اولادیں عطا کیں۔ نادر بیگ، اختر بیگ اور ایک بیٹی جو مرزا سڈنی بیگ کی بیگم ہے۔

ان گھریلو تکلیف دہ اتفاقات کی بناء پر میری چھٹیاں عذابوں اور دکھوں میں گزریں۔ بیوی کے انتقال کے بعد غمگینی اور تنہائی جزو حیات ہوگئیں۔ چھٹیاں ختم ہوگئیں مگر نوکری پہ جانے کی خواہش بالکل نہ تھی۔ کوشش کی کہ میڈیکل سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر چھٹیاں بڑھوالوں، مگر ایسا بھی نہ ہو سکا۔ تمام عزیزوں دوستوں نے صلاح دی کہ دل بہلانے کے لیے ملازمت میں مشغول ہونا بہتر ہے۔ اس کے علاوہ چھٹیوں میں آدمی کی تنخواہ خواہ مخواہ ضائع ہوتی ہے۔ بادلِ نخواستہ مئی ۱۹۰۵ء میں، پھر اپنی پرانی پوسٹنگ والی جگہ یعنی کوئٹہ آیا۔ جہاں گاؤں بھی قریب تھا اور کام کا دباؤ بھی قدرے کم تھا۔ اس کے باوجود بھی گھر کی فکر کھائے جاتی تھی۔ اگرچہ اس دوران بھائی مرزا صادق علی بیگ ریٹائر ہو چکے تھے اور گھر میں رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے میرے بچوں کو سنبھالتے تھے۔ نادر بیگ اسکول میں پڑھتے تھے۔ اختر بیگ چھوٹا تھا، جبکہ بیٹی سمجھدار ہو چکی تھی۔ حالانکہ گھر میں ملازمائیں تھیں مگر میں نے ارادہ کیا کہ بیٹی کی شادی مرزا سڈنی سے کروں جو کراچی میں زیرِ تعلیم تھے اور جسے اس کے باپ یعنی ڈاکٹر مرزا کے انتقال کے بعد میں نے ہی سنبھالا تھا اس نے خود بھی مجھے سردار محمد یعقوب کی معرفت شادی کی درخواست کی تھی۔ لہٰذا مشکلات گھٹانے کی غرض سے میں نے یہ شادی کروادی۔ اپنی

شادی کی طرح یہ شادی بھی میں نے بے جا رسومات، شور شرابے اور بینڈ باجوں کے سوا کی۔ صرف کھانے کی مجلس کی گئی۔ سڈنی کراچی گئے تو بیوی کے ساتھ اختر بیگ کو بھی لے گئے۔ جبکہ نادر بیگ حیدرآباد میں مسز محمد یعقوب کے گھر پڑھنے کے باعث رہتے تھے۔ وہاں سے نہ صرف اسکول قریب تھا بلکہ گھر پر بھی پڑھانے کا بندوبست تھا۔ کبھی کبھی میں بھی بچوں کے ساتھ کراچی جا کر رہتا اور آفیس میں کام کرتا کیونکہ ہمارا ہیڈ کوارٹر کراچی میں تھا۔ اس سال کے آخر میں سڈنی ایل ایل بی کے لیے بمبئی گئے اور میں سب بچوں کو لے کر حیدرآباد آ گیا۔ بچوں کو وہاں چھوڑ کر خود سیر سپاٹے کرتا، کبھی کبھی ان کے پاس بھی جاتا تھا۔

۱۹۰۶ء کے آغاز میں، ڈاکٹر مرزا کی دوسری انگریز بیگم اپنے تین بچوں کے ہمراہ جو کہ ڈاکٹر مرزا کی وفات کے بعد بیرونِ ملک تعلیم کی غرض سے گئے تھے، لوٹ آئیں اور ہمارے ساتھ رہنے لگیں۔ پھر جلد ہی وہ لوگ دوبارہ واپس بیرونِ ملک چلے گئے۔ اس بار میں نے ان کے ساتھ نادر بیگ کو بھی بھیجا تاکہ وہاں تعلیم حاصل کر کے بیرسٹری کا امتحان دے۔ سہولت یہ دیکھی کہ بھابھی اور بچوں کے ساتھ جا کر رہے گا اور اس کا خیال بھی اچھا رکھا جائے گا۔ اس کے بعد میں انھیں ہر مہینے باقاعدگی سے خرچہ بھیجا کرتا۔ اختر بیگ یہیں سردار محمد یعقوب کے ساتھ رہتا تھا۔

گو کہ اس طریقہ کار کے تحت میں نے اپنے بچوں کا مناسب بندوبست کر دیا مگر مجھے تنہا رہنا پڑتا۔ میری بیوی نے میرے ساتھ اس سلوک سے وقت گزارا تھا کہ ایسی گھریلو صحبت کے بغیر زندگی بہت مشکل نظر آ رہی تھی۔ ہر لمحہ بیوی یاد آتی اور اداسی طاری رہتی۔ خاص طور پر جب اپنے گھر آتا تب خود کو تنہا پا کر دل دکھتا تھا۔ میری حالت کے پیشِ نظر بھائی مرزا صادق علی بیگ اور سردار محمد یعقوب نے مجھے دوسری شادی کا مشورہ دیا۔ کراچی اور بمبئی میں ایک دو جگہ شادی کا بندوبست ہو سکتا تھا کیونکہ وہاں کچھ تہذیب یافتہ اور دولتمند خاندان تھے۔ حالانکہ میری پہلی بیوی بھی غیروں سے تھی اس کے باوجود اپنی بڑھتی عمر کے خیال اور پہلی بیوی سے اولاد کی موجودگی کی وجہ سے میں نے سوچا کہ اب غیروں سے شادی کرنا غلط ہے کیونکہ اگر

میں مر گیا تو ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے میکے جاکر رہنے لگے یا میرے بچوں سے کسی قسم کی زیادتی کرے۔ اپنے خاندان میں شادی کا خیال یوں بہتر معلوم ہوا کہ اپنے خاندان کی عورت کو مجھ سے یا میرے بچوں سے زیادہ ہمدردی ہوگی۔ اس لیے فیصلہ کیا کہ دوسری شادی اپنوں میں کروں گا۔ آخر کار قرعۂ فال میرے ماموں زاد مرزا قزلباش کی بیٹی کے نام نکلا۔ شادی کی تقریباً تیاری تھی کہ مرزا بیماری کے باعث انتقال کر گئے کچھ اور عزیزوں کے بھی قضیئے ہوئے۔ ریاست خیر پور کے وزیر سردار محمد یعقوب بھی اچانک وفات کر گئے اس لیے شادی مہمل رہی۔ مئی ۱۹۰۸ء میں میری شادی ہوئی اور اس بار بھی اچھی بیوی نصیب ہوئی ابھی ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہنا شروع ہوئے ہی تھے کہ وہ پہلے بچے کی پیدائش پر انتقال کر گئی۔ اس بیوی سے بھی مجھے محبت تھی۔ لہٰذا یہ ایک اور کاری صدمہ پہنچا۔ بچہ پل کر بڑا ہوا، جس کا نام ہمایوں بیگ ہے۔ آج کل ہائی اسکول میں پڑھتا ہے۔ اس بیوی کے بارے میں بھی کچھ اشعار میری کتاب ''سودائے خام'' میں شامل ہیں۔ اس صدمے کی وجہ سے میں پھر بیمار پڑ گیا اور کام کاج سے جی اکتا گیا۔ لہٰذا ۱۹۰۹ء میں تین ماہ کی چھٹی لی جس کے خاتمے تک طبیعت بحال نہ ہوئی۔ تیس برس کی ملازمت بھی مکمل ہو چکی تھی لہٰذا آدھی تنخواہ کے ساتھ ریٹائرمنٹ لی۔ میری تیسری شادی نومبر ۱۹۰۹ء میں، مرزا قلب علی مرحوم کی صاحبزادی سے ہوئی جو اب تک قائم ہے۔ اس بیوی سے میرے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں جو ابھی چھوٹے ہیں۔

میرا بڑا بیٹا نادر بیگ بیرسٹر بن چکا ہے۔ اس نے لاڑکانہ میں بیرسٹری کی پریکٹس شروع کی اور اب تک وہیں ہے۔ جلد ہی وہ ریزیڈنٹ مجسٹریٹ مقرر ہوا اور دو تین مقامات پر ملازمت کی مگر جب بھائی ڈاکٹر مرزا کی بیٹی سے شادی کی، تب ملازمت چھوڑ کر کراچی رہائش اختیار کی اور بیرسٹری کرنے لگا۔ کراچی میں رہتا ہے۔ وہ تھیاسوفیکل سوسائٹی کا ممبر ہے۔ کتابیں لکھنے پڑھنے کا بڑا شوقین۔ ڈرائنگ، نقاشی، میوزک اور راگ وغیرہ خوب جانتا ہے۔ بڑھئی اور نقش گری کا کام بھی اسے آتا ہے۔ انگریزی میں شاعری کرتا ہے۔ دوسرا بیٹا اختر بیگ زیادہ تعلیم حاصل نہ کرسکا۔ میٹرک کے بعد میڈیکل اسکول اور پھر ٹیکنیکل اسکول گیا۔ آخر کار

پولیس ڈپارٹمنٹ میں سب انسپکٹر بنا۔ تقریباً ایک سال بعد یہ نوکری چھوڑ کر ریلوے ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کی۔ آج کل حیدرآباد کے کلکٹر صاحب کی آفس میں کلرک ہے۔ اس سے چھوٹے بچے انگلش میڈیم اور سندھی میڈیم اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ بیٹیاں بھی اچھی خاصی پڑھی لکھی ہیں۔ انگریزی سے بھی نابلد نہیں۔ سلائی، کڑھائی کے علاوہ دیگر امور خانہ میں بھی ماہر ہیں۔

میرے بچوں کی اولاد کی تفصیل کتاب کے آخر میں دیے گئے شجرے سے معلوم ہوگی۔

پانچواں باب

پیرانہ سالی اور احوالِ گوشہ نشینی

حالانکہ میں نے تیس برس سرکاری ملازمت کی مگر ایک خواہش ہمیشہ دل میں جاگزیں رہی کہ میعادِ ملازمت پوری ہو اور میں اپنی خواہش کے مطابق مطالعہ کروں، کتابیں لکھوں اور عبادت و ریاضت میں وقت گزاروں۔ دورانِ ملازمت بھی دن کو جب بھی سرکاری کاموں سے فرصت ملتی تھی یہی کچھ کرتا تھا۔ مگر رات کو خاص طور پر اپنے سکھ چین اور آرام کو تج کر کتابوں کو وقت دیا کرتا۔ ملازمت کرتے ہوئے بھی تنہائی و گوشہ نشینی دل پسند رہیں۔ تنہا رہ کر تصور و تخیل کی دنیا آباد کرنا اچھا لگتا تھا۔

دوزخ یا بہشت میں کاش اکیلا رہوں
تنہائی جیسا خلد نہ کوئی اور جگ میں دیکھوں

صبح کے پہر زیادہ تر اکیلا گھومنے پھرنے نکل جاتا۔ آج تک یہی دستور ہے۔ قبرستانوں، مقبروں یا زبوں حال گاؤں یا ٹیلوں میں جا کر بیٹھ جاتا۔ گردشِ زمانہ، انسان کے حالات و رویے اور اللہ کی قدرت کے بارے میں سوچتا رہتا۔ ملازمت کے آخری دور میں جب پے در پے گھریلو دکھوں، مصیبتوں اور صدمات کے اتفاقات ہوئے اور دل بے آرام، غمگین اور ملول رہنے لگا تو تنہائی اور گوشہ نشینی کے خیالات زیادہ شدت سے اُمڈے۔ اللہ سے دعا کرتا تھا کہ کسی طرح جلد جان چھڑا کر آزاد ہو جاؤں اور اپنی دلی خواہش کے مطابق مصروفیت اختیار کروں۔

دل کی خلوت میں تماشہ، دو جہاں کا دیکھوں
سر جھکا گریباں میں اسی لیے سدا رکھوں

براعظم خلوت میں بیٹھ کر کرتا ہوں حکمرانی
دیکھو تو عنقا ہماری، ہما کا پر بنی

گوشۂ قناعت نہ ملا جسے، نہ ملا اسے کچھ
گوشۂ خلوت نہ دیکھا جس نے، نہ دیکھا اس نے کچھ

مجھے یاد ہے کہ ایک بار، پانچ آٹھ سال کی (بحیثیت مختیار کار) ملازمت کے بعد، ایک بدمزاج اسسٹنٹ کمشنر آیا۔ اس کی ماتحتی، کئی وجوہات کی بناء پر، ناموافق رہی۔ دل میں خیال آیا کہ ملازمت چھوڑ دوں اور کسی اسکول یا کالج میں پڑھانا شروع کردوں کیونکہ وہی پیشہ دل کو بھاتا ہے۔ جس میں وقت مقررہ کے بعد کام کرنے کی کوئی پابندی نہیں اور تعطیلات بھی کافی ہوتی ہیں۔ لہٰذا گھریلو مصروفیت کے لیے بھی وقت مل جاتا ہے۔

دل کی خلوت میں عارف سیرِ عالم کریں
گوشۂ آرسی دیکھو، سورج تو زیرِ سایہ ہے

مگر دوستوں اور عزیزوں نے مشورہ دیا کہ ملازمت کا دورانیہ ضایع نہ کیا جائے اور بالا افسران آتے جاتے رہتے ہیں۔ کچھ خوش اخلاق تو کچھ بداخلاق آئیں گے، وقت گزر ہی جاتا ہے لہٰذا لاچار ہو کر بیٹھ گیا۔ اور پھر واقعی یوں ہی ہوا کہ کئی مہربان اعلیٰ آفیسر آئے جنھوں نے بہت مدد کی اور اپنے اعتماد کا اظہار کیا۔

ملازمت کے آخری دور میں، چھٹیاں لے کر تیس برس سروس مکمل کی اور ملازمت میں توسیع کی کبھی کوشش نہ کی جیسا کہ عام طور پر لوگ کرتے ہیں حالانکہ میں ابھی عمدگی سے نوکری کرنے کا اہل تھا کہ ریٹائرمنٹ کے وقت میری عمر ۵۵ سال تھی۔ پچیس برس کی عمر میں ملازمت کا آغاز کیا تھا گویا کہ اسی لمحہ، لحظۂ پیری کا آغاز کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ملازمت کی محنت و مشقت، ورزش، تندرستی اور مزاج کے اعتبار سے میں خود کو بالکل جوان محسوس کرتا تھا۔

بڑھاپے کے بارے میں، میرا ایک شعر ہے جو میرے خیال میں سوچنے پر مجبور کرسکتا ہے۔

رکھتے طاقت، بنی گوشہ نشینی کا سبب میرے
اس خلق بے حیا کا، خدا بھلا کرے

آج بھی سیر سپاٹے، گھومنے پھرنے اور لکھنے پڑھنے کا کام اتنا ہی کر رہا ہوں، جتنا کہ دوران ملازمت کرتا تھا۔ اور خدا کی مہربانی سے، نظم وضبط کے باعث ابھی تک تندرست ہوں اور کوئی بیماری کم ہی حملہ آور ہوتی ہے۔ دانت مضبوط ہیں، نظر اچھی ہے گو کہ پڑھتے سے نظر کا چشمہ استعمال کرتا ہوں۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ میں گوشہ نشینی آرام کی خواہش کے پیش نظر نہیں بلکہ اپنی مرضی کے کاموں، تفکر اور خود مختیاری کے لیے چاہتا تھا۔ حالانکہ تنہائی پسند ہوں اس کے باوجود جب بھی کاموں سے تھکتا ہوں تب موافق صحبت اور گفتگو اچھی لگتی ہے۔ مگر عمر اور خیالات سے مطابقت رکھنے والے دوست نہیں ملتے خصوصاً گاؤں میں جہاں میں رہتا ہوں وہاں تنہائی میں اک اور تنہائی نہاں ہے۔ لہٰذا بیوی بچوں کی قربت، ان سے گفتگو، پرورش وتعلیم کی مصروفیت زیادہ مرغوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی کی بلکہ شاید پہلی بیوی کی وفات کے بعد بچوں کو مناسب طریقے سے سنبھالنے کی غرض سے دوسری شادی کی ضرورت پڑی۔ اسی لیے، ملازمت کے دنوں سے لے کر آج تک فرصت کی یہ مشغولیت برقرار رکھتا آیا ہوں۔ اسی لیے ریٹائرمنٹ لینے سے کچھ عرصے قبل، چھٹیوں کے تقریباً آخر میں یعنی ۱۹۰۹ء میں تیسری اور آخری شادی کی۔ جس کا ذکر پہلے بھی کیا اور بعد میں بھی آئے گا۔ الحمدللہ آج تک اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوش وخرم زندگی گزار رہا ہوں۔

پنشن شروع ہونے کے بعد میں نے وہ زمین سنبھالنا شروع کی جو ہمیں سرکار نے ہمارے خاندان کی خدمات کے صلے میں عطا کی تھی اور جسے بھائی مرزا صادق علی بیگ وفات سے پہلے سنبھالتے تھے میں اکثر وہاں جایا کرتا تھا اس کے علاوہ لکھنا پڑھنا بھی جاری تھا۔ مگر تین چار سال کے بعد اس سے بھی بیزار ہوگیا دراصل اس آمدورفت اور کام کاج کی ذمے داری کی تکلیف اٹھانا مشکل ہوگیا تھا لہٰذا یہ کام مرزا صادق علی بیگ

کے بڑے بیٹے مرزا فرخ بیگ کے حوالے کر دیا جو کہ بیرسٹر ہے، اکثر نواب شاہ میں وکالت کرتا ہے اس کے علاوہ لوکل بورڈ کا صدر بھی ہے۔ وہی آج تک اس زمین کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ اس تجربے کے باوجود میں نے پرانی پھلیلی کے قریب زمین خریدی، جہاں روزانہ جایا جا سکتا تھا۔ وہاں کاشتکاری شروع کروائی جس سے گھوڑے کے لیے گھاس اور دانے کی سہولت ہوگئی اور مجھے بھی ایک دلچسپی مل گئی۔

باقی رہی بات اصل مصروفیت کی۔ تو وہ کتابیں لکھنے، تراجم کرنے اور شاعری ہے، جس میں میرا زیادہ تر وقت گزرتا ہے۔ (دیکھیے گیارہواں باب) میں نہ صرف خود کتابیں لکھتا ہوں، بلکہ سندھ کے مختلف افراد، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، جو کتاب یا اشعار مجھے اصلاح یا تنقید کے لیے بھیجتے ہیں، انھیں بھی بوقتِ فراغت دیکھتا ہوں اور درستگی کر کے واپس بھیجتا ہوں۔ بلکہ گر کوئی کسی کتاب لکھنے میں مدد مانگتا ہے تو اسے خوشی سے قبول کرتا ہوں۔ اسکول یا کالج کے مخزن یا رسالے کے لیے اگر کسی مضمون یا شعر کا تقاضا کیا جاتا ہے تو وہ بھی بخوشی بھیجتا ہوں۔ کتابوں کے دیباچے، تمہید یا تبصرے بھی لکھ دیتا ہوں۔ کافی چھوٹی عمر سے ہی سرکاری لٹریچر کمیٹی کا ممبر ہوں اور کئی سالوں سے سرکاری ٹیسٹ بک کمیٹی کا رکن ہوں۔ اس کے علاوہ بمبئی کی پراونشل ٹیکسٹ بک کمیٹی کا ممبر بھی ہوں۔ عربی، فارسی اور اُردو کی نئی کتابیں جو کہ ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن کے پاس آتی ہیں مجھے بھیجی جاتی ہیں اور میں ان پر رائے دیتا ہوں۔ اس کے علاوہ مختلف علمی، اخلاقی یا پنچتی تنظیموں یا جماعتوں کی درخواست پر لیکچر دینے کے علاوہ مضمون وغیرہ بھی لکھ دیتا ہوں۔ اس بارے میں مفصل ذکر بعد میں آئے گا۔

سرکاری ڈپارٹمنٹل امتحان یا یوروپین افسروں کے سندھی امتحانات کے لیے اکثر کمشنر صاحب مجھے بلا بھیجتے ہیں تو یہ ذمہ داری بھی پوری کرتا ہوں۔ سرکاری یا پرائیویٹ تعلیمی کانفرنسوں میں شامل ہونے کا کہا جاتا ہے تو بخوشی شامل ہو کر ان کی فرمائش پر تقریر کرنے یا تحریر دینے سے بھی انکار نہیں کرتا۔ انسدادِ بے رحمی حیوانات کی سرکاری سوسائٹی (حیدرآباد) کا

ممبر ہوں، وائس پریزیڈنٹ بھی رہا ہوں۔ اس موضوع پر کبھی کبھی ضروری مضامین بھی قلمبند کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ سندھ کی انجمن اسلامیہ کا ممبر ہوں۔ انجمن امامیہ، حیدرآباد یا شیعہ کانفرنس آل انڈیا کی مرکزی کمیٹی کا ممبر ہوں جس کا ہیڈ کوارٹر لکھنؤ یا لاہور میں ہے۔ کچھ عرصے سے سندھ کی پبلسٹی کمیٹی کا بھی ممبر ہوں اور ان کے لیے خصوصی مضامین تحریر کرتا ہوں۔ اور جو مضامین ان کے پاس آتے ہیں، ان پر رائے بھی دیتا ہوں۔ یوں سمجھیں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد سے یہی مصروفیات ہیں جو مرغوب بھی ہیں۔ متعلقہ افسران نے بارہا میونسپلٹی کاؤنسلر کی سیٹ کے لیے، لوکل بورڈ کی ممبر شپ کے لیے، اسپیشل مجسٹریٹ یا بنچ مجسٹریٹ بننے کے لیے استدعا کی بلکہ اصرار بھی کیا مگر میں نے معذرت کرلی کیونکہ یہ کام میری طبیعت سے موافقت نہیں رکھتے۔ بلکہ کاؤنسل میں شمولیت کے لیے دوستوں کے دباؤ کے باوجود راضی نہ ہوا۔ خیر پور ریاست کی "وزیری" خالی ہونے کے وقت سے لے کر میر صاحبان نے بصد مہربانی مجھے "وزیر" بننے کے لیے کہا تب بھی میں نے معافی چاہی کہ کئی اسباب کی بناء پر یہ کام بھی میرے مزاج کے خلاف تھا ورنہ یہ ایک ایسا منفعت بخش، اختیارات اور اثر ورسوخ والا عہدہ تھا اور ہے کہ میرے درجے کے دیسی افسران نہایت خوشی سے قبول کریں بلکہ اسے حاصل کرنے کی تگ ودو کریں۔

مندرجہ بالا مختصر بیان سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ سرکاری ملازمت چھوڑنے کے بعد میں چار اقسام کی مصروفیات میں گھرا رہا۔ اول بال بچوں کی پرورش وتعلیم، دوم خلق خدا کا فائدہ اور بہتری، خاص طور پر تعلیم وعلم کے ذریعے، سوم کتابیں لکھنے اور شاعری کرنے، بلکہ یہ کام بھی عوام کے فائدے کا ہی نظر آیا کہ اس میں نہ تو دولت ہے نہ ہی کسی اور نفع کی طمع، چہارم اپنی زندگی کی بہتری اور اللہ تعالیٰ کی بندگی میں مشغولیت، جس کا ذکر ابھی تک اس لیے نہیں کیا گیا کہ مفصل ذکر آگے آئے گا۔ دن کا کچھ حصہ اور بالخصوص رات کا وقت عبادت کے لیے بہت اچھا لگتا ہے جس کا موقع پوری طرح دوران ملازمت نہ مل سکا۔ جس قدر ممکن ہے اس قدر شوق اور چاہ سے، فکر او رخیال سے عبادت کرتا ہوں مگر اس کے

باوجود بھی بیوی بچوں، دیگر مشاغل اور دنیا کا خیال رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے خیالات دوسری طرف بھٹک جاتے ہیں۔ تارک الدنیا ہونے کے بغیر جذب کی یہ کیفیت پیدا نہیں ہوسکتی مگر اس صورت میں اپنوں یا غیروں کی خدمت کس طرح کی جاسکتی ہے؟ یہ ایسی ہی کیفیت ہے جس کے لیے شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے۔

غم فرزند و نان و جامہ و قوت،
بازت آرد ز سیرت مسلکوت!
شب چو عقدِ نمازی بندم
چہ خورد با مداد فرزندم!

ان مصروفیات کے سبب عام افراد کی رائے میری لیے مثبت بھی ہوگی اور منفی بھی۔

اس عمر اور گوشہ نشینی کی حالت میں کئی کتابیں تحریر کرنے اور کثیر الاولادی کے باعث میرا دوست دیوان کوڑول، مذاقاً مجھے ''کتاب لکھنے کی مشین'' کہتا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے شادی سے اس لیے منع کرتا تھا تاکہ اللہ کی عبادت کی سعادت زیادہ سے زیادہ میسر آئے، جس طرح وہ خود مشغول رہتا تھا۔ مگر مجھے دیگر فرائض کی بجاآوری بھی مقصود تھی۔

مشہور ہم عصر افراد اور معزز دوست

بچپن سے لے کر آج تک، کچھ مشہور افراد اور معزز دوست، جن سے میرا تعلق رہا اور جن کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں، کا یہاں مختصر بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ اس سے نہ صرف ان کی یادیں تازہ ہوں گی بلکہ مجھے بھی فخر و انبساط حاصل کرنے اور حقِ دوستی ادا کرنے کا موقع ملے گا۔

سب سے پہلے تو مجھے اپنے والد، والدہ، نانا اور ماموں جیسے بزرگ عزیزوں کو دیکھنے، ان کے ساتھ رہنے اور ان کی صحبت سے بہت کچھ سیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ دنیا میں کئی افراد ہیں جنھیں یہ نعمت میسر نہیں۔ مثال دینے کے لیے ہمارے اپنے خاندان میں کئی ایسے لوگ ہیں مثلاً میرے والد اور نانا کو بمشکل اپنے والدین یاد تھے اور بچپن ہی سے زندگی ان کی شفقت کے بغیر گزاری۔ میرا بیٹا ہمایوں اپنی ماں کو نہ دیکھ سکا کہ پیدائش کیونکہ فوراً بعد اس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر مرزا جعفر قلی کے چھوٹے بیٹے ایڈورڈ کی پیدائش سے پہلے ہی ڈاکٹر مرزا کا انتقال ہو چکا تھا۔ لہٰذا ایڈورڈ اپنے باپ کو نہ دیکھ سکا۔

نانا اور والد کے دوستوں اور اس زمانے کے نامور افراد کو میں نے دیکھا اور ان کے ساتھ خاصا وقت گزارا۔ مثال کے طور پر میر حسین علی خان، میر حسن علی خان، میر محمد خان، آغا زین العابدین شاہ، آغا صادق شاہ، آغا جعفر شاہ، آغا گر اعلی شاہ، آغا امام علی شاہ، آغا غلام نبی شاہ، آغا محمد علی شاہ اور دیگر جن میں کئی قابل حکیم، عالم اور شاعر تھے۔ ہمارے گاؤں میں، میر صاحبان کی حویلیوں سے تعلق رکھنے والے بزرگوں کو بھی میں

نے دیکھا۔ حیدرآباد میں اسکولوں میں پڑھنے کے دوران میاں محمد مخدوم، جو پہلے اسکول کے استاد اور بعد میں ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر بنے، میرے استاد رہے۔ قاضی حاجی احمد اور آخوند ولی محمد دونوں میرے استاد تھے اور بعد میں دونوں نے ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران، ماسٹر وشنو گھنشام، مسٹر بھنڈارکر، مسٹر راناڈی، مسٹر کیشو رائے اور مسٹر راما کنٹھ جیسے اساتذہ میسر آئے۔ مسٹر کوڑومل، مسٹر غلام علی، مسٹر رانا چندر شوقی رام، مسٹر چوہڑمل اور مسٹر جھمٹ مل کے ساتھ بھی وقت گزارا بلکہ مسٹر کوڈومل اور مسٹر غلام علی نے تو مجھے کچھ عرصہ پڑھایا بھی۔ حیدرآباد شہر کے قدیم مسلمانوں میں سے کچھ معمر افراد کے نام لکھتا ہوں۔ جہانیاں والے سید قطب شاہ، سید قاضی یوسف شاہ، سید فاضل شاہ، سید محمد علی شاہ، سید ثابت علی شاہ ثانی، سید تقی شاہ، آخوند محمد قاسم بالائی، مخدوم حبیب اللہ، مرزا لطف علی اور ان کے بھائی، مرزا علی اکبر شیرازی فوجدار، خدا بخش آخوند، حبیب اللہ آخوند، نواب دوست علی خان ٹھوڑو، مرزا خورشید لکھنوی، امید علی نقاش، محمد صدیق آخوند، لطف اللہ آخوند، عبداللطیف آخوند اور دیگر۔ یہ سب لوگ اب مرحوم ہیں۔

دیوان شوقی رام ایڈوانی کی قربت بھی میسر آئی کیونکہ میں مسٹر تاراچند اور مسٹر تول رائے کے پاس جایا کرتا تھا۔ دیوان شوقی رام والد صاحب کے گہرے دوست تھے اور دونوں نے بچپن میں ایک ساتھ تعلیم حاصل کی تھی۔ دیوان شوقی رام کی تحریر بھی والد صاحب کی طرح خوبصورت تھی۔ دیوان مول چند منسکانی جو کہ مسٹر ادھارام، مسٹر عیدن مل اور پنجومل کے والد تھے، انھیں بھی دیکھا اور ملاقاتیں رہیں کہ مسٹر عیدن اور پنجومل دونوں میرے اسکول کے ساتھی تھے۔ دیوان کیول رام (تختے والے) کو دیکھا۔ دیوان ادھارام تھانورداس، دیوان پربھداس ڈپٹی انسپکٹر اور دیوان بھوج راج ولد ٹوپن مل جو ہمارے گھرانے کا منشی تھا اور اس کے بعد اس کے بیٹے چندن مل نے یہ کام سنبھالا اور دیوان چترام شاہانی، دیوان چندا سنگھ، دیوان خوشی رام وغیرہ وغیرہ۔

بمبئی کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران پرنسپل چیٹفیلڈ، ورڈ زورتھ اگریتھام، پروفیسر کینیڈی، پروفیسر جائکس، پروفیسر ہاتھارن تھوبت، پروفیسر ٹیلر، یونیورسٹی رجسٹرار جیمس ٹیلر، پروفیسر مرزا حیرت اور مولوی عبدالفتاح سے تعلقات بنے، ان سے تعلیم حاصل کی اور ان کی خاص شفقت مجھے نصیب ہوئی۔ بمبئی میں قیام کے دوران، ہز ہائی نیس آغا خان اور ان کے خاندان سے بہت قریبی تعلقات ہوگئے۔ ترکی کاؤنسل جنرل سے بھی جن کا تذکرہ پہلے کرچکا ہوں اچھی دوستی رہی۔ بمبئی کے مشہور طیب جی خاندان کے ساتھ بھی بہت اچھے مراسم تھے۔ مسٹر بدرالدین طیب جی اور ان کے بھائیوں شمس الدین، شجاع الدین، قمرالدین، امیر الدین اور ان کے دوسرے بیٹوں سے بھی اچھے تعلقات تھے اور خاصا آنا جانا رہتا تھا۔ بمبئی کے پارسیوں میں سے، مسٹر مانک جی اور کاؤجی جی جی بھائی، کاؤجی ریڈی منی، مسٹر واڈیا، مسٹر موودی، مسٹر پٹیل، مسٹر کانٹریکٹر اور مسٹر فدیدون جی دستور (جو آج کل یونیورسٹی کا رجسٹرار ہے) مسٹر دلال، مسٹر گی، مسٹر بنیل، مسٹر داور، مسٹر بادشاہ اور مسٹر دستور سے دوستی تھی کیونکہ ہم ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مرہٹوں اور گجراتیوں میں سے مسٹر چنورکر، مسٹر جوگلیکر، مسٹر بھنڈارکر بڑے اور چھوٹے اور کئی دوسرے لوگ واقف تھے جن کے نام اس وقت یاد نہیں آرہے، مگر معروف تھے۔ کچھ ابھی حیات اور نامور ہیں۔ مسلمانوں میں سے مسٹر قمرالدین، مسٹر معزالدین، مسٹر ملا وغیرہ میرے کلاس فیلو تھے۔ کالج کے دنوں میں جو سندھی میرے ساتھ تھے اور جو بعد میں آئے ان میں سے مسٹر ٹیکچند، مسٹر ہاسارام، مسٹر لیلارام، مسٹر دولت رام، مسٹر سہا نومل ارر مسٹر پریتم داس چندنانی ہیں، مسٹر دیارام گدومل اور مسٹر علی محمد حسن علی بھی بعد میں آئے مگر پھر ان سے بہت دوستی ہوئی۔

کالج چھوڑنے کے بعد، کراچی میں قیام کے دوران، مسٹر دیارام، مسٹر ادھارام، مسٹر آلومل، مسٹر حسن علی، مسٹر ملانی، مولوی اللہ بخش، مرزا آصف، آغا علی شاہ، مراد خان پٹھان، مسٹر عباس خان اور مولوی تاج محمد سے واقفیت ہوئی اس کے علاوہ مسٹر ہیرن جی آغا، ان کے بیٹے رتن جی، مسٹر مائکس، مسٹر جڈ، مسٹر ٹولیس جیلر، مسٹر ننگن، مسٹر فاؤلر اور کئی دیگر سے اچھی شناسائی رہی۔

کراچی میں رہائش کے دوران مقامی افراد میں سے دیوان وادھومل (ٹلٹی والے) لالہ گیان چند، ان کے بھائی ٹلوکچند اور ان کے بیٹوں کے علاوہ پارومل سہوانی، دیوان شونداس، ٹیکمداس، ٹھلرام اور ڈیون مل ٹھٹوی سے خاص طور پر دوستی تھی۔ دیوان چانڈومل اور ان کے بیٹے دیوان سجرام سے بھی گہری دوستی ہوئی۔ ان کے چھوٹے بیٹے بول چند اور کیولرام نے تو میری ماتحتی میں کام بھی کیا۔ مسلمانوں میں سے قاضی محمد اشرف، خداداد خان اور کئی دوسرے افراد سے رابطہ رہا۔

دورانِ ملازمت جن بالا افسران کی ماتحتی میں کام کیا اور ذاتی دوستی کے علاوہ وہ مجھ پر مہربان رہے، ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔ مسٹر فلٹن، مسٹر ہارٹ دیویز، مسٹر جیمس، مسٹر جالکس، کرنل میہو، کرنل والس، کرنسل واس، مسٹر میولس، مسٹر مکنزی اور مسٹر اسٹیل۔ مسٹر جیمس ڈپٹی کلکٹر ماموں علی محمد پر بہت مہربان تھے۔ اس کے بعد جب وہ بمبئی میں بحیثیت پوسٹ ماسٹر جنرل تعینات ہوئے تب میں بمبئی میں پڑھتا تھا۔ ان سے اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں اور جب وہ کمشنر کی حیثیت سے سندھ آئے تب بھی مجھ پر ان کی خصوصی مہربانی رہی۔ ان ہی کے کہنے پر میں نے ''چچ نامہ'' اور ''سندھ کی تاریخ'' فارسی کتابوں سے انگریزی میں ترجمہ کیں۔ اس کام میں میرے ساتھ میرے دوست مسٹر دیارام کی بہت محنت شامل رہی۔ بعد میں یہ کتاب کمشنر صاحب کے چھاپہ خانے میں سرکاری کتاب کی حیثیت سے شایع ہوئی۔ کرنل میھو تو ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اپنے انتقال تک مجھے خط لکھتے رہے۔ بمبئی ہائی کورٹ کے رجسٹرار مسٹر فلٹن، بمبئی کالج میں مجھ سے ملنے آتے تھے۔ دیسی افسران جو کہ نوکری کے دوران واقف کار ہوئے اور دوست بنے ان میں دیوان وادھومل، دیوان شونداس، ٹیکم داس ٹھٹوی، دیوان پارومل، لالہ گیان چند، دیوان چانڈومل، دیوان دیارام گدومل، مسٹر محسن طیب جی، مسٹر حامد علی، مسٹر خداداد خان، مسٹر قادر داد خان، سردار محمد یعقوب، شیخ صادق علی، قاضی محمد اشرف وغیرہ شامل ہیں۔

میری ملازمت بالائی سندھ کے علاقے میں زیادہ رہی۔ یعنی پرانے ضلع شکار پور اور سرحد سندھ پر، پھر ضلع کراچی، ضلع حیدرآباد، ضلع تھرپارکر کے دونوں ڈویژنوں میں رہی۔ لہٰذا پورے سندھ کے ہندو اور مسلمان زمین داروں اور دیگر معتبر میروں اور پیروں سے یاد الٰہی رہی، جن میں سے کئی افراد بڑے نامور گزرے ہیں۔ ان میں سے کچھ کے نام یہاں لکھنا چاہوں گا۔ پیر حزب اللہ شاہ کنگری والے، پیر غلام محی الدین رانی پور والے، پیر رفیع الدین سرہندی شکار پور والے، میر علی نواز علوی، میاں محمد حسین، محمد شعبان، وکیل عبدالخالق شکار پور، ٹھارو خان سرائی، ان کے بیٹے اور بھتیجے سرائی لاڈو خان اور فیض محمد کھاوڑ، وڈیرہ نبی خان چانڈیو، سردار قیصر خان گمسی، وڈیرہ امام بخش خان، محمد خان تھیبو، وڈیرہ رمضان ناریجو، وڈیرہ مرید خان لاکھیر، ملک صوبدار خان اور ایسب خان، سرائی غلام رسول، سید الہندو شاہ، ملک دودا خان، میر علی مراد سندرانی، غلام علی خان بزدی، صحبت خان گولو، جعفر خان درند، میرد خان ڈومکی، بہادر خان کھوسو، رحیم خان کھوسو، لشکری خان جمالی، نواب شہباز خان بگٹی، نواب محمد بخش خان مزاری شاہ پسند خان پٹھان اور کئی دیگر۔ یہ سب وفات پا چکے ہیں۔ میرے ان سب لوگوں سے بہت اچھے مراسم تھے۔ وہ مجھے پسند کرتے تھے اور میں بھی ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ یہ تعلقات سرکاری ملازمت کی بناء پر نہیں بلکہ مہر د مروت کا صلہ تھے۔

ریاست خیر پور کے میر علی مراد خان اور میر فیض محمد خان سے بھی اچھے روابط تھے۔ کئی بار میں ان کے پاس سرکاری کاموں کی وجہ سے گیا۔ وہ مجھ پر خاص طور پر مہربان تھے اور چاہتے تھے کہ میں ان کے علاقے میں ملازمت کروں مگر قسمت میں نہ تھا۔ سید فانی شاہ شیرازی، ریاست کے قدیم شاعر میرے اچھے دوست ہیں اور ابھی بقید حیات ہیں۔ اچھے شعر کہتے ہیں۔ مولوی بہاء الدین تخلص بہائی، بزرگ شاعر ماتھیلو اور شمس الدین "بلبل" میہڑ کے شاعر بھی میرے دوست تھے۔ مولوی بہائی تو اب بھی حیات ہیں مگر نہایت پیر مرد ہیں۔ کبھی کبھی تازہ شاعری میرے مطالعہ کی نذر کرتے ہیں۔ میرے بارے میں انھوں نے ایک رباعی اپنے ایک خط کے آخر میں لکھی جو یہاں تحریر کرتا ہوں۔

مرزا کہ قلیچ بیگ نامش نامی
شیریں بجہاں چو شعر حالی جامی
از بندہ بہائی این دعا باد قبول
جا ندر دو جہاں باد بصد خوش کامی
مرزا قلیچ بیگ کہ مرد خدا ای است
منظور چشم عاشق بندہ "بہائی" است

میری خدمات اور ان کی قدر شناسی

ہر وہ انسان جو شہرت حاصل کرتا ہے یا شہرت کا خواہشمند ہوتا ہے، وہ ایسے اہم کام کر جاتا ہے کہ لوگ اسے یاد رکھتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی وہ لوگوں کی یادوں میں زندہ رہتا ہے مگر افسوس کہ میں کوئی عظیم کام نہ کر سکا جس کی وجہ سے میں لوگوں کو یاد رہوں یا جس کی وجہ سے لوگوں کو فیض پہنچے۔ میں نے جو کام نجی یا سرکاری طور پر کیے وہ بہت معمولی، مخفی اور گمنام رہے۔ حالانکہ ان سے خلق کو کچھ فوائد حاصل ہوئے اور عوام نے ان کاموں پر بہت خوشی کا اظہار کیا مگر یہ فرض کی بجا آوری تھی جن کی اعلیٰ افسران یا دیگر افراد کی نظر میں کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ کچھ لوگوں کو معمولی کاموں کو بڑھا چڑھا کر دکھانے یا بیان کرنے کا ہنر آتا ہے اس کی بناء پر وہ آفرین و انعامات حاصل کرتے ہیں یا القاب سے نوازے جاتے ہیں۔ مگر افسوس کہ میں اس معاملے میں بے ہنر رہا اس لیے بڑی خاموشی سے اپنے فرائض ادا کرتا رہا اور ان چھوٹے چھوٹے کاموں کو اہم سمجھ کر سرانجام دیتا رہا۔ میرا ایک شعر ہے۔

ہوتی ہے القاب سے الجھن مجھے
اس لیے تو خوش ہوں میں بے لقب

سرکاری ملازمت کے دوران کئی مراحل پر اہم اور مشکل نہریں کھدوائی ہوں گی۔ کشمور بند، نارا کینال اور دریائے سندھ کے مشکل شگاف پر کروائے ہوں گے۔ صبر آزما مراحل میں عدل و انصاف سے فیصلے کیے ہوں گے جن سے افسران و زمیندار خوش ہوئے ہوں گے۔ کتنے ہی اہم مواقع پر جائے واردات پر اپنی سرکاری حیثیت میں موجود رہا ہوں گا۔ کئی

مشکل تکراریں یا معاملات بلوچوں کے جرگوں کے ذریعے یا مجسٹریٹ کی کورٹ کے ذریعے حل کیے ہوں گے۔ کئی اسکول اور مکتب کھولے یا کھلوائے ہوں گے۔ راستوں اور بیابانوں میں درخت اور باغات لگوائے ہوں گے۔ مشکل سے مشکل چھوٹے بڑے پہاڑوں کی چوٹیوں تک جا کر ان کی حدود معین کر کے وہاں نشانیاں لگوائی ہوں گی۔ ملٹری افسران اور ان کے لشکروں کو بڑی عزت و عافیت سے اپنے ڈویژن سے پار کروایا ہوگا۔

یہ ہیں میری خدمات، جو کہ دورانِ ملازمت میرا فرض تھیں اور فقط سالانہ ایڈمنسٹریشن رپورٹ پہ آفرین یا تعریف ملی جس کے بارے میں عام آدمی کچھ نہیں جان پاتا۔ اور افسران کی نظروں میں بھی یہ رواجی نوکری کے فرائض میں شامل رہتا ہے۔ کچھ رپورٹوں کا انتخاب بارہویں باب میں شامل ہے۔ مگر بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ اس قسم کے معاملات نمٹانے والے سرکاری افسران کی تعریفیں اخبارات میں شایع ہو کر ملک بھر میں مشہور ہوتی ہیں اور پھر خاص رپورٹس کے اضافے سے اعلیٰ ترین منصب داروں تک پہنچتی ہیں، جن کی بناء پر ان افسران کو نہ صرف خصوصی انعامات، القاب اور فائدے دیے جاتے ہیں بلکہ بوقت ریٹائرمنٹ زمینوں کی الاٹمنٹ بھی دی جاتی ہے۔ مگر جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ ان ساری باتوں کے لیے خاص ہنر و طریقہ آنا چاہیے جو میری کم نصیبی کہ میں نہ سیکھ سکھا۔ اور جب یہ گُر سمجھ میں آئے بھی تو ان کی تعمیل کی ہمت نہ کر سکا۔ نہ تو دل نے شہادت دی اور نہ ہی عقل نے اجازت۔ اس کے باوجود بھی کئی مواقع پر گورنروں، کمشنروں اور کلکٹروں نے خالی خولی الفاظ میں میری تعریف ضرور کی جو کہ حاضرین محفل نے اکثر سنی۔ یہ بھی میرے ان معمولی، رواجی اور خسیس کاموں کی قدر شناسی تھی جن کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ یہ انتخاب بھی بارہویں باب میں ملاحظہ کیجیے۔

یہ تو تھیں میری سرکاری خدمات۔ مگر جن کاموں پر میں فخر کرتا ہوں اور جو میرے طبعی میلان کے عین مطابق ہیں وہ ہیں میرے ذاتی کام جو ایک حیثیت سے سرکاری کاموں میں بھی شمار کیے جا سکتے ہیں۔ یعنی ان کا تعلق سرکاری محکمۂ تعلیم سے ہے، اور ان سے خلق کو علمی، اخلاقی

اور روحانی فائدہ پہنچ سکتا ہے، وہ ہے جدا جدا مضامین پر کتابیں اور مضامین لکھنا۔ یہ کام میں اوائل عمر سے ہی مکاتیب، اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی کے دوران کرتا رہا ہوں۔ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں نے کتابیں لکھنا شروع کیں جو کالج کی پڑھائی کے دوران بھی لکھتا رہا۔ "بیکنس ایسیز" (Bacon's Essay) اور مسز فاسٹیس کی "پولیٹکل ایکانومی" (Political Economy) ان دنوں کے تراجم ہیں جس کے لیے مجھے محکمۂ تعلیم نے اچھی خاصی رقم بطور انعام دی۔ کالج میں پڑھتے ہوئے، طالب علموں کے لیے علمِ عروض، فارسی اشتقاق اور صرف ونحو پر چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھیں جو شایع ہوئیں اور انھیں پڑھا گیا۔ اس کے بعد کراچی میں رہتے ہوئے کچھ کتابیں لکھیں جو کہ سندھ مدرسہ کے علاوہ سندھ کے دیگر چھاپہ خانوں نے شایع کیں۔ دوران ملازمت کتابیں لکھنے کے علاوہ تراجم بھی کرتا رہا جن میں سے کچھ تو سرکاری خواہش کے تحت لکھیں جن پر مجھے انعامات ملے اور کچھ محکمہ تعلیم ٹیکسٹ بک، پرائیز بک یا لائبریری بک کی حیثیت سے منظور کی گئیں۔ مولویوں کو مدرسے کھولنے کی اجازت ملنے کے بعد مولویوں اور ان کے شاگردوں کے لیے کئی کتابیں لکھیں۔ کچھ کتابیں تعلیم نسواں کے حوالے سے اور کچھ اسلام کے بارے میں لکھیں۔ مسلمانوں میں تعلیم کا شوق چوں کہ کم تھا لہٰذا علم کی ترغیب دینا ضروری سمجھ کر کئی کتابیں دیگر مذاہب اور سماج کے اصولوں کے بارے میں لکھیں، کیونکہ دیگر مذاہب کے لوگوں کی خواہش تھی۔ ان میں نثر بھی ہے تو شاعری بھی۔ سندھی شاعری کے علاوہ فارسی، اُردو اور ترکی زبان میں بھی شاعری کی۔ سندھی میں کچھ کافیاں بھی لکھیں اور ناٹکوں کی کتابوں میں سندھی راگ بھی لکھے۔ یہ سب شایع شدہ ہیں۔ کچھ مخصوص جماعتوں اور سوسائٹیوں کے جلسوں کے لیے تقریریں لکھیں۔ ادیبوں کے کتابوں کے دیباچے اور تمہید کے طور مضامین لکھے۔ یہ سب بعد میں علیحدہ علیحدہ شایع کیے گئے ہیں۔ مطلب یہ کہ مختلف مضامین پر نظم اور نثر میں چھوٹی بڑی تقریباً دو سو کتابیں لکھیں جو کہ سندھ کے مختلف حصوں سے شایع ہوئی۔ ابتدائی دور کی کتابیں شکارپور کے ماسٹر پوکرداس اور سکھر کے ماسٹر ہری سنگھ نے چھاپیں۔ بعد میں الحق پریس، وکٹوریہ پرنٹنگ پریس سکھر، قیصریہ پریس، اسٹینڈرڈ پرنٹنگ ورکس

اور پریمیئر پریس حیدرآباد والوں نے میری کتابیں شایع کیں۔ کچھ کراچی پریس میں شایع ہوئیں اور کچھ کمشنر صاحب کی پریس اور دیگر سرکاری پریس کے ذریعے شایع ہوئیں۔ کچھ کتابیں تو لاہور سے بھی شایع ہوئیں۔

یہ تمام کتابیں میں نے مختلف چھاپہ خانوں یا پریس سے بغیر کوئی قیمت لیے چھپوائیں۔ کتابوں کا چوتھا حصہ پبلشر وقتاً فوقتاً میرے کہنے پر مجھے دیا کرتے تھے۔ آج تک یہی ہو رہا ہے۔ میں نے اپنے خرچ پہ صرف ایک کتاب چھپوائی باقی تمام دوسروں نے شایع کروائیں۔ میری کئی کتابیں ریاست خیرپور نے مجھ سے لے کر اپنی سرکاری پریس ''فیض پریس'' سے چھپوائیں اور اب تک چھپوا رہے ہیں۔ ان تمام کتابوں کی یادداشت اگلے ضمیمے میں ترتیب وار دی جائے گی۔ اس کے علاوہ کالج ڈرامیٹک سوسائٹی کے لیے شیکسپیئر کے کئی ڈرامے تراجم کیے، جو شایع بھی ہوئے۔ کئی بار جلسوں کے لیے فرمائشی تحریر یا کلام لکھ کر دیا۔ کتابوں کی تعداد کا ذکر تو مندرجہ بالا سطور میں کر چکا ہوں اور اگر اشعار کا تخمینہ لگاؤں تو کوئی بائیس ہزار بیت بنتے ہیں۔ جن مضامین یا موضوعات پر تقاریر لکھیں یا تحریریں قلمبند کیں، ان کی یادداشت بھی ضمیمے میں شامل کی جائے گی۔

تذکروں کی کتابوں میں شاعروں کی شاعری یا اشعار کا شمار کیا جا چکا ہے۔ کئی کا تو وزن تک بتایا ہے۔ مثلاً مرزا عبدالقادر ''بیدل'' کی تصنیف کا وزن پانچ سیر لکھا ہے۔ مثنوی مولانا روم اور شاہنامۂ فردوسی کا تین سیر۔ شیخ فرید الدین عطار کی مثنویوں میں ایک لاکھ اشعار ہیں اور ان کے دیوان میں موجود اشعار کی تعداد چالیس ہزار ہے جن میں چھ ہزار رباعیاں ہیں۔ شاعر کاشی نے بھی ایک لاکھ اشعار کہے ہیں۔ امیر خسرو دہلوی کے اشعار کی تعداد چار لاکھ وغیرہ۔

یہ ہیں میری ذاتی مصروفیات، جنھیں اہم یا غیر اہم سمجھنا لوگوں کا کام ہے۔ یہ ڈھیر ساری کتابیں، جو میں نے لکھی ہیں مختلف چھاپہ خانوں سے اور مختلف جگہوں سے شایع ہوئی ہیں، لوگوں نے محبت سے پڑھیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں نے اس تخلیقی محنت کی قدر شناسی کی ہے اور مجھے قابلِ عزت سمجھتے ہیں۔ مناسب مواقع پر احترام سے بلاتے ہیں، میری

غیر موجودگی میں میری تعریف کرتے ہیں۔ ان کی آراء کا کچھ انتخاب، اخبارات کے ذریعے، بارہویں باب میں شامل ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کارگزاری کا مجھے کیا انعام ملا؟ عام لوگوں کی طرف سے انعام تو قدر شناسی اور عزت و احترام ہے۔ کئی جلسوں اور کانفرنسوں میں مجھے صدر مجلس کی حیثیت سے بلایا جاتا ہے۔ ایک دو مواقع پر جو کچھ میں نے کہا وہ بھی گیارہوں باب میں موجود ہے۔ میرے لیے گوشۂ احترام کے ثبوت کے طور پر لوگوں نے میری تصویریں کتابوں، پوسٹ کارڈز اور جنتری وغیرہ پر شایع کیں۔ کراچی کے ایک سیٹھ نے میری تصویر بڑے سائز میں بنوا کر حیدرآباد کے ہوم سٹیڈ ہال میں رکھنے کے لیے بھیجی۔ ایک تصویر بمبئی کے ٹائمز آف انڈیا میں شایع ہوئی جس کے نیچے کیپشن کے طور پر ''شیکسپیئر آف سندھ'' لکھا تھا۔ جن جلسوں میں صدارت کرتا ہوں وہاں ہمیشہ گروپ فوٹو بنوایا جاتا ہے۔

یہ ہے عام لوگوں کی قدر شناسی کی نشانی۔ حکومت کی طرف سے مجھے کسی قسم کا خطاب یا لقب نہیں ملا۔ ہاں البتہ ریٹائرمنٹ سے کچھ عرصہ قبل ''قیصر ہند'' کا چاندی کا میڈل ملا اور ریٹائرمنٹ کے بعد وائسرائے کے دستخط کے ساتھ، ایک ''سرٹیفکیٹ آف میرٹ'' ملا۔ پبلسٹی کمیٹی میں کام کرنے کی بناء پر کمشنر صاحب نے ایک خطِ تحسین اور سونے کی گھڑی انعام کے طور پر دی۔ (دیکھیے بارہواں باب) سرکار کی جانب سے ہم سب بھائیوں کی خدمات ومحنت کی قدر دانی کے طور پر ضلع نواب شاہ کی نصرت نہر کے قریب پانچ سو ایکڑ زمین بطور انعام دی گئی جو آج بھی آباد ہے۔ پہلی جنوری ۱۹۲۳ء کو مجھے ''شمس العلماء'' کا لقب ملا۔ جس کے بعد وائسرائے کے سیکریٹری، گورنر بمبئی کے سیکریٹری، کمشنروں، کلکٹروں، یورپی، مسلمانوں و ہندو دوستوں کی جانب سے مبارک باد کے خطوط آئے۔ جن میں سے کچھ آپ یہاں پڑھ سکیں گے۔ اخبارات نے اس فیصلے کو بہت سراہا۔ ایک ماہنامہ کے جنوری کے مخزن ''غنچۂ امید'' نے میری تصویر کے ساتھ کسی شاعر ''مخلص'' کا شعر بھی شایع کیا۔ اس کے علاوہ ایڈیٹر عبدالمل میگھراج بی اے۔ ایل ایل بی کا مختصر نوٹ بھی تھا جو آپ کے مطالعہ کے لیے شایع کیا جارہا ہے۔

میری عادات، خواہشات، خیالات اور آراء

(پہلا حصہ)

اس باب میں، میں اپنی اولاد تک حقائق پہنچانے کے لیے اپنے کردار، عادات، خیالات مزاج و آراء کے بارے میں کچھ ذکر کروں گا۔ کچھ باتیں تو ابتدائی ابواب میں بھی مذکور ہیں، مزید کچھ اس باب میں درج کر رہا ہوں۔

محبت، ادب اور اخلاق:

بچپن کی عادتوں کا کافی ذکر ہو چکا ہے۔ ہم سب بہن بھائیوں کی آپس میں اور والدین کے ساتھ گہری محبت تھی۔ جیسی ماں باپ کی زندگی میں الفت رہی، ویسی ہی محبت ان کے انتقال کے بعد بھی رہی۔ یہ بات محلے پڑوس کے لوگوں کے علم میں تھی اور ہر ایک اس بابت جانتا تھا بلکہ یہ ایک ضرب المثل سی بن گئی تھی کہ شاید ہی کسی اور گھر میں ایسی محبت ہو۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں، صبح نیند سے اٹھ کر سب سے پہلے ہم ماں باپ کے پیر چھوتے تھے اور وہ ہمیں دعائیں دیتے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد امی کی قدم بوسی کرتے رہے۔ ان کا کہنا مانتے۔ انھیں راضی رکھنے اور ناراض نہ کرنے کے جتن کرتے۔ چھوٹے بھائی، بڑے بھائیوں کا ادب کرتے۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی ہمارے والدین نے ہمیں ہاتھ یا چھڑی سے مارا ہو بلکہ اسکول یا مکتب میں بھی ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔ اسی لیے بچپن ہی سے ہمیں اپنی عزت و آبرو کا بڑا پاس رہتا تھا۔ اسکول یا کسی اور جگہ دوستوں سے حد سے زیادہ گستاخی نہیں کرتے

تھے اور نہ ہی کسی کی بدتمیزی، گستاخی، دست درازی یا ہلکا مذاق سہنے کی عادت تھی۔ دوستوں کو اس بات کا علم تھا لہٰذا وہ ہم سے بڑے اخلاق سے پیش آتے۔ ہم تمام بھائیوں کو اپنے بیوی بچوں سے بہت محبت رہی ہے اور ہمیشہ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے کوششیں کرتے رہے ہیں۔ میں اور میری بیوی، بچوں کو سچ بولنے، جھوٹ نہ بولنے، گالی گلوچ یا مہمل الفاظ ادا نہ کرنے کی تاکید کرتے رہتے ہیں۔ ہر رات سونے سے قبل اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کے بعد سونے کی عادت پختہ کردی ہے۔ یہ دعا بچوں کو یاد کروادی گئی ہے۔ شروع میں ماں یا بڑی بہن ان کے ساتھ دعا مانگتی تھیں۔ بڑے ہونے پر نماز اور قرآن پڑھنے کی تاکید کرتے ہیں۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ، کھا کر اٹھنے پر الحمدللہ یا شکر اللہ کہنا سکھایا ہے۔ کیونکہ ہمارا بھی یہی دستور ہے۔ بچپن میں ہم سب بہن بھائی رات کو مل جل کر مناجات، دعا یا بیت سُر سے گاتے تھے۔ میری لکھی ہوئی مناجاتیں میری کتاب ''سودائے خام'' میں موجود ہیں۔ مجھے اپنی اولاد سے بڑی محبت ہے مگر اس لیے اظہار نہیں کرتا کہ مبادا کہیں گستاخ نہ ہو جائیں اور لوگوں کے سامنے بدتمیزی کریں۔ گھر میں ان سے بہت محبت سے پیش آتا ہوں مگر باہر لوگوں کے سامنے ظاہر نہیں کرتا۔ کوئی غلط حرکت کرنے پر انھیں ڈانٹتا بھی ہوں اب جبکہ وہ بڑے ہوئے ہیں، مارتا بھی ہوں اگرچہ بعد میں پشیمانی ہوتی ہے۔ بچوں کو تعلیم یافتہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بڑے بیٹے کو بیرون ملک بھیجا جو بیرسٹر بنا، چھوٹا نہ جاسکا بلکہ یہاں کی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل نہ کرسکا۔ دوسرے چھوٹے انگلش اور سندھی میڈیم اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ بچیوں کو بھی ضروری تعلیم دی جاتی ہے۔

عزیزوں سے سلوک:

عزیزوں، رشتہ داروں اور محلہ داروں سے ہم نے ہمیشہ اچھا رویہ رکھا۔ کچھ ذاتی اسباب کی بناء پر ہماری اپنے ماموں سے ان بن ہوگئی جو کہ افسوس آج تک چلی آرہی ہے۔ حالانکہ ظاہری طور پر لوگ ادراک نہ کرپاتے ہوں گے۔ اس چپقلش کی بناء پر ہمیں نقصان

یا تکلیف پہنچانے کے درپے رہتے ہیں مگر ہم (خاص طور پر میں) انھیں تکلیف یا نقصان دینے کا سوچ بھی نہیں سکتے، صرف اپنی عزت بچانے کے لیے ضروری حفاظتی تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ اسی طرح میری بڑی بیٹی اور بڑے بیٹے کی شادی کے وقت کچھ ذاتی وجوہات کی بناء پر میری اور میری اولاد کی بھائی مرزا صادق علی بیگ اور ان کے بچوں کے ساتھ کچھ ناراضگی ہوگئی مگر کچھ عرصے کے بعد آپس میں گھل مل گئے۔ میری ایک عادت ہے اور رائے بھی کہ زمانہ اختلاف میں دل میں حسد اور کینہ رکھنے سے حالات مزید خراب ہوتے ہیں۔ لہٰذا صبر سے وقت گزارتا ہوں اور جانتا ہوں کہ برائی کرنے والے کے سامنے اس کی برائی خود بخود آجائے گی۔ لہٰذا انتقام لینا یا ضد کرنا نامناسب ہے۔ مروت سے کام لینے سے دشمن بھی دوست بن جاتے ہیں اگر نہیں تو شرمندہ تو ضرور ہوں گے۔ شیخ سعدیؒ نے فرمایا:

بندہ حلقہ بگوش از نوازی برود
لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

اپنی اس عادت کے بارے میں میرے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہر برائی ہے بھلائی ہوگئی میرے لیے
یا الٰہی میرے بدخواہوں کو بھی خوش رکھ

درسِ فیض ہے گر سیکھنا بادل سے سیکھ
لیتا ہے کڑوا مگر لوٹاتا ہے میٹھا وہ

بد بولیں لوگ گر دوں دعا سے ہی جواب
ہوں مانندِ ابر کڑوا لوں میٹھا میں دوں

نہ حساب رکھوں دشمن کے کسی ظلم کا
چشم پوشی ہے سائبان ہمارا

جو غریب رشتے دار ہیں، ان کی مدد کی غرض سے کچھ رقم ماہانہ دینے کی کوشش کی ہے۔ اپنی مال ملکیت میں ان کا اور اپنے بھائیوں کے بال بچوں کا حق سمجھتا ہوں۔

روزمرہ کے اصول:

سندھی یا انگلش میڈیم اسکولوں اور کالج کی تعلیم کے وقت سے لے کر میری یہ عادت چلی آرہی ہے کہ صبح سویرے اٹھ کر، نماز اور قرآن پڑھتا ہوں۔ دیگر اوقات کی نمازیں بھی پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگرچہ اسکول کے کاموں کی وجہ سے فرصت ذرا کم ملتی تھی جب کالج کی تعلیم پوری کر کے ملازمت شروع کی، اس وقت سے باقاعدگی سے نمازیں پڑھتا اور قرآن کی تلاوت کرتا ہوں۔ ایک عرصے سے میری عادت رہی ہے کہ صبح سویرے تین چار بجے کے قریب جاگتا ہوں۔ وضو بنا کر، تہجد کی نماز پڑھتا ہوں اس کے بعد تقریباً آدھا گھنٹہ غور و خوض کرتا ہوں۔ اللہ کی قدرت اور حکمت کے متعلق سوچتا ہوں اور محو ہو جاتا ہوں۔ پھر تلاوت قرآن کریم پڑھتا ہوں۔ ہمیشہ معنی و تفسیر والے قرآن پڑھنے کی وجہ سے قرآن کا مفہوم بخوبی سمجھ جاتا ہوں۔ تلاوت قرآن کے بعد وظیفہ پڑھتا ہوں اس کے بعد حدیث کی، دینی یا تصوف کی کوئی کتاب پڑھتا ہوں۔ اور پھر بھی اگر صبح روشن ہونے میں کچھ دیر ہوتی ہے تو (خاص طور پر موسم سرما میں) اپنی کتاب پر کام کرتا ہوں۔ فجر کی نماز کے بعد چہل قدمی کی عادت ہے۔ ملازمت کے دنوں میں سرکاری کام نمٹاتا تھا اور اب اپنا ذاتی کام، یعنی کتابیں لکھتا ہوں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرتا ہوں مگر سوتا نہیں کیونکہ مجھے دن کو نیند نہیں آتی۔ تین بجے نماز سے فارغ ہونے کے بعد، سرکاری کام کرتا تھا اب پڑھنے لکھنے میں مصروف رہتا ہوں۔ پہلے نماز عصر کے بعد ڈاک دیکھنے کے بعد ضروری دستخط کرتا تھا۔ اب اکثر باہر بیٹھ کر اخبار یا کوئی کتاب وغیرہ دیکھتا ہوں۔ غروب آفتاب کے بعد، نماز کی ادائیگی سے فارغ ہو کر یا تو بچوں سے باتیں کرتا ہوں یا پھر انھیں کچھ پڑھاتا ہوں۔ رات کے کھانے کے بعد نماز عشاء پڑھ کر آرام کرتا ہوں۔ عام طور پر شب نو دس بجے سو جاتا ہوں اور علی الصبح یعنی تین چار بجے اٹھ جاتا ہوں۔ گر کسی سبب نو دس بجے نہ سو سکوں تو اکثر رات کو بے آرام رہتا ہوں، نیند نہیں آتی۔

اصول عبادت:

ذکر ہو چکا ہے کہ صبح صادق کے وقت اٹھ کر ذکر و فکر میں مشغول ہوتا ہوں یعنی اللہ کی حکمت کے متعلق غور و خوض کرتا ہوں۔ حدیث میں ہے کہ

اک ساعت غور و خوض کی
ہے بہتر اطاعت ستر برس

پہلے قرآن شریف پڑھنے کے بعد وہ وظیفے پڑھتا ہوں جن میں اللہ کی تعریف و قدرت کا بیان ہے۔ جواہر القرآن، جوشن کبیر اور جوشن صغیر پڑھتا ہوں۔ ہر ایک کتاب کو سات حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ہفتے کے سات دنوں میں یہ سات حصے پڑھتا ہوں۔ خیال کی عمیق گہرائی میں اترنے کے لیے کچھ فقرے مخصوص کر دیے ہیں، جن میں سے باری باری ایک ایک کو دہراتا، اس کے نفس مضمون کو سوچتا اور غور و فکر کرتا ہوں کیونکہ جانتا ہوں کہ محض زبانی ذکر کرنے یا وظیفہ دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔

خدا کا ذکر کرو دل سے وگرنہ طوطا بھی
زبان سے خدا کو کریم ہے کہتا

آئنہ بنے جو مذہب، نہ رکھیں میل خلق کے لیے
چہرہ نہ دیکھیں جس کا، نہ اٹھائیں نگاہیں اس کے لیے

یہ فقرات ہیں۔ پہلے "سبحان اللہ"۔ جس کے کہنے اور تصور کرنے سے اللہ تعالیٰ کے پاک ہونے کی مثال پر غور کرتا ہوں کہ وہ کس طرح پاک ہے اور ہمیں کس طرح پاک رہنا ہے۔ کئی کتابیں اس موضوع پر پڑھ چکا ہوں۔ لہٰذا اس سوچ و فکر کی راہیں کشادہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ پھر "الحمدللہ" زبان پر لاتا ہوں اور دل میں قدرت خداوندی کی مثالیں یاد کرتا ہوں۔ آسمان، خلا اور زمین پر عالم نباتات، ان کی قسمیں، ہزاروں پھول پھل اور میوہ جات وغیرہ۔ عالم حیوانات میں ہزاروں نمونے، مختصر ترین حشرات الارض سے لے کر یم

شیم جانوروں تک، رینگنے والے جانور، آبی جانور، ہزاروں اقسام کے پرندے، جنگلی جانور، انسان اور جن و ملک عالم ارواح وغیرہ۔ ان تمام پر علیحدہ علیحدہ کتب سندھی زبان میں تحریر کی ہیں اس لیے سوچنے میں آسانی رہتی ہے، پانچ منٹ میں آنکھیں بند کیے ان تمام کائناتی مناظر کی سیر کر لیتا ہوں۔

جب کھولوں آنکھیں، تماشا دنیا کا دیکھوں
جب موندوں آنکھیں، سیر عقبیٰ کی کروں

تیسرا فقرہ یا کلمہ ''شکر اللہ'' زبان پر لاتا ہوں اور دل میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور مہربانیاں یاد کر کے، اس کا شکر بجا لاتا ہوں کہ اس نے اب تک مجھے صحتمند اور سلامت رکھا۔ کشادہ رزق عطا کیا۔ عزت و آبرو عطا کی۔ عبادت کا شوق و رجحان دیا۔ اسلام کی ہدایت دی۔ بال بچے اور عزیز و خویش عطا کیے جن کی بدولت وقت خیر و خوبی سے گزر رہا ہے۔ اس کیفیت کے دوران میں اپنی گزری زندگی کا اپنے آج سے، دوسرے کمزور یا ضعیف افراد سے موازنہ کر کے اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ چوتھا کلمہ ''استغفر اللہ'' جب زبان پر آتا ہے تب جو گناہ و غلطیاں یاد آتی ہیں، انھیں یاد کر کے اللہ سے معافی مانگتا ہوں اور آئندہ کے لیے توبہ کرتا ہوں۔ اللہ کے احکام کی نافرمانی، ماں باپ، عزیز و اقارب، دوستوں اور انسانوں کے حقوق مکمل ادا نہ کر سکنے، ان کی خاطر خواہ مدد نہ کرنے یا فیصلہ کرتے وقت کوئی غلطی یا چوک ہو جانے یا دوسروں کو ذاتی فائدے کی خاطر ایذا یا نقصان پہنچانے کی باتوں کو یاد کر کے پشیمان ہوتا ہوں معافی کا طلبگار رہتا ہوں بلکہ بعض اوقات تو گریہ بھی کرتا ہوں۔

یونہی تسبیح پھیرنا عبث ہے اشکوں بنا
پھوٹتی ہے سبز کونپل کب آبیاری کے سوا
عمر جوانی کٹی اکثر نادانی میں
باقی بچی جو، گئی پشیمانی میں

پھر "لا الٰہ الا اللہ" اور "اللہ اکبر" کے فقرات پڑھتا اور غور کرتا ہوں، ان کلمات کے مفاہیم پر سوچتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی وحدت اور عظمت کے متعلق یقین سے کہتا ہوں کہ سوائے اللہ کے دوسرا معبود، مقصود یا مطلوب بلکہ موجود کوئی نہیں اور نہ ہی ہونا چاہیے۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کی آخری ہدایت کے متعلق سوچتا ہوں کہ اس نے اللہ کا راستہ دکھایا۔ یعنی اسلام کا راستہ، جس کے سبب میں گمراہی و بت پرستی سے بچ گیا۔ شکر گزاری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ نبی آخر الزماں ﷺ کے لیے صلوٰۃ پڑھتا ہوں۔ یہ تصورات دہرانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے جدا جدا ذاتی و صفاتی نام یاد کر کے، ان کے مفاہیم پر غور کر کے اللہ سے دعا کرتا ہوں۔ دعا بھی مخصوص ہے۔ پہلے اپنے والدین، بھائیوں، بہنوں اور پھر دیگر عزیزوں کے حق میں دعا کرتا ہوں۔ زندہ اور مردوں کی روحوں کے لیے دعا گو ہوتا ہوں کہ خداوند کریم انھیں معاف کرے اور بہشت نصیب کرے، پھر اپنے حق میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ پروردگار! مجھے برے کاموں، برے خیالوں اور برے لوگوں سے بچانا، نفس اور شیطان کو قابو میں رکھنے کی طاقت دینا، تندرستی دینا، علم و حکمت نصیب کرنا، ہدایت کا رستہ دکھانا، اپنے عشق اور محبت کی راہوں پہ چلنے کی توفیق عطا کرنا، دنیا کی محبت میں ہرگز مبتلا نہ کرنا، وہ کام کروانا جن سے تو راضی ہو، اچھے کام کرنے کی ہمت اور توفیق عطا کرنا، موت قریب ہے عالم نزع آسان کرنا۔ عذاب قبر، عذاب آخرت اور عذاب جہنم سے پناہ دینا، ایمان کی سلامتی کے ساتھ اٹھانا اور آخرت باعزت رکھنا، روز حشر صالح اور نیکوکاروں کے ساتھ اٹھانا، بال بچوں کی خیر رکھنا، انھیں تندرست رکھنا، طویل عمر عطا کرنا اور صالح بنانا۔ عزیزوں، خویشوں، دوستوں، محلے داروں بلکہ سارے جہاں کی خیر کرنا۔ صبح التجا کرتا ہوں کہ جس طرح خیر سے رات گزاری اسی طرح خیر سے دن گزار کر رات کرنا، دن کو اعمالِ صالح کرنے کی توفیق دینا، انصاف کے کام کروانا تاکہ خلق کو فائدہ پہنچے۔ رات کو سوتے وقت لحظہ دعا میں یہ فقرات ضرور شامل کرتا ہوں کہ مالک! جس طرح تو نے خیر و عافیت سے دن گزارا اور رات آئی، اسی طرح رات بھی خیر سے گزار کر صبح کرنا۔ میں سوتا ہوں، تم میرا خیال کرنا۔ اگر میری موت رات کے پہر لکھی ہے تو میری روح تیری ہوئی۔ میرے سوگواروں کا

دھیان رکھنا۔ یہ ہے میری دعا اور میری عبادت جو بچپن سے میری عادت رہی ہے۔ مفصل طور پر اسے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ میری اولاد یہ جان لے کہ میں کس طرح عبادت کرتا ہوں اور اگر وہ خود، یا کوئی قاری اس سے مستفیض ہونا چاہے، یا اسے پسند کرے تو ضرور اپنا لے۔ اس مضمون پر مشتمل مختصر دعا رات کو بچوں کو بھی سکھاتا ہوں، جس کا ذکر مختصراً پہلے کر چکا ہوں۔ دعا کیا مانگنی چاہیے، اس بابت ایک قطعہ گیارھویں باب میں شامل ہے۔

نماز اور روزے:

ہم سب بہن بھائی بچپن ہی سے رمضان کے روزے رکھتے آئے ہیں۔ میں چونکہ سدا سے کم خوراک ہوں اس لیے روزہ رکھنا پسند کرتا ہوں۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

کھاؤ گے گر زیادہ تو بنو گے فیل
کھاؤ گے گر کم تو ہوجاؤ گے جبرئیل

نماز کے علاوہ روزہ رکھنے کا بھی مجھے بے حد شوق رہا ہے۔ یعنی شعبان میں بھی روزے رکھتا ہوں۔ گر کبھی مہمانوں کی آمد کے باعث، کسی شادی یا کسی اور مجلس میں، زیادہ شکم سیری کر لیتا ہوں تو دوسرے دن ضرور روزہ رکھتا ہوں۔ روزہ رکھنا اس لیے بھی پسند ہے کہ یہ نفس کی خواہش کو قابو میں رکھنے کے لیے بہترین مشق ہے۔ اس سے بھوک و پیاس کی تکالیف کا احساس ہوتا ہے اور جو غریب و مساکین بوجہِ حالات بھوکے رہتے ہیں، ان کے لیے رحم کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اللہ کا شکر بجالانے اور ان غریبوں کو خیرات دینے کا خیال ذہن میں بیدار ہوتا ہے۔ کوشش کر کے نماز وقت پر ادا کرتا ہوں۔ لیکن اگر سرکاری ملازمت کا کوئی ضروری کام یا کسی مقصد کے لیے آیا ہوا کوئی ملاقاتی منتظر ہوتا ہے تو پھر پہلے کام سے فراغت پاتا ہوں اس کے بعد نہایت دھیان گیان سے نماز پڑھتا ہوں۔ دورانِ سفر جب آسانی سے نماز ادا نہیں کر سکتا تب وقتِ نماز آنکھیں موند کر، دل میں نماز پڑھتا ہوں اور منزل پہ پہنچ کر قضا نمازیں ادا کرتا ہوں۔

زکوٰۃ و خیرات:

نماز پڑھنے اور روزے رکھنے کے علاوہ زکوٰۃ بھی دیتا ہوں۔ سال میں جمع شدہ تمام رقم کا چالیسواں حصہ، مخصوص وقت پر مساکین کو دیتا ہوں یا کسی نیک کام میں خرچ کرتا ہوں۔ خاندان کے یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں سے لے کر محلے کے غریبوں کو ماہوار رقم بطور خیرات بھجواتا ہوں۔ بھکاریوں کو ڈانٹنے یا پھٹکارنے کے بجائے جو کچھ مناسب سمجھتا ہوں دے کر روانہ کرتا ہوں۔ ان میں سے بعض حجت و تکرار کرتے ہیں اور چڑ کر بھی بات کرتے ہیں تب بھی میں تحمل اور رواداری سے کام لیتا ہوں۔ مہمانوں کی آمد پر خوش ہوتا ہوں اور ہمیشہ ان کے سکون و آرام کا خیال دامنگیر رہتا ہے۔ یہی تاکید بیوی بچوں کو بھی کرتا ہوں۔ اگر کبھی کوئی مہمان بن بلائے یا بے وقت آجائے تو میں اپنا کھانا اسے دے دیتا ہوں اور جو کچھ گھر میں موجود ہوتا ہے وہ کھالیتا ہوں۔ دل نے ہمیشہ یہ خواہش کی کہ اتنی استطاعت اور سہولت ہمہ وقت موجود رہے تاکہ مہمان آتے جاتے رہیں۔ ایران، عرب یا ہندوستان کے علاقوں سے زیادہ مہمان آتے ہیں اور کچھ تو کافی دن مہمان رہنے کے بعد خیرات بھی لے کر جاتے ہیں۔ میں ہمیشہ ان سے خندہ پیشانی سے پیش آتا ہوں۔ باہر سے آئے ہوئے دوستوں کی میزبانی کرنا بھی پسند ہے۔ بلکہ ان کے ساتھ دیگر عزیزوں کو بھی دعوت پر بلاتا ہوں مگر خود کوشش کر کے کہیں مہمان بننا پسند نہیں کرتا بلکہ اگر کوئی دعوت پر بلاتا ہے تب بھی کوئی نہ کوئی عذر پیش کر دیتا ہوں۔ مگر لازماً جانے والی جگہوں مثلاً شادی بیاہ یا موت وغمی پر اپنے ایک بیٹے کو وہاں لازماً بھیجتا ہوں۔

مذہب اور فرقے:

مذہب کے لحاظ سے ہم "شیعہ مرزا" ہیں۔ یعنی جعفری یا اثنا عشری۔ والد صاحب اور نانا مرحوم بچپن میں اپنے ملک سے نکلنے کے بعد پہلے ایران میں آئے جہاں شیعہ مسلک کی تعلیم ملی۔ پھر جب سندھ پہنچے تب میر صاحبان کے پاس رہے، جو خود بھی شیعہ تھے۔ اس لیے تمام عمر اسی مذہب پر عمل پیرا رہے۔ رسول ﷺ اور آلِ رسول ﷺ سے خصوصی محبت رکھتے تھے

اور اس کے بعد تمام صحابیوں پر حضرت علیؓ اور آلِ علیؓ یعنی پنجتن اور آلِ عباسؓ کو فوقیت دیتے تھے۔ سندھ میں آباد ہونے کے بعد ہمارا بلکہ ہمارے بزرگوں کا بھی زیادہ تر تعلق اہلِ سنت سے رہا اس لیے ان کے سامنے کسی قسم کا تعصب کرنا نامناسب لگتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ والد صاحب مرحوم سنیوں کے ساتھ، ان کے طریقۂ کار کے مطابق نماز پڑھتے تھے۔ سنی پیش امام کی امامت میں بھی نماز پڑھتے تھے۔ جب اکیلے ہوتے تب شیعہ مسلک کے مطابق نماز ادا کرتے۔ حالانکہ آلِ نبی ﷺ سے بے حد محبت کرتے تھے مگر اس کے باوجود میں نے انھیں کبھی اصحابۂ کرام کے بارے میں غلط جملہ کہتے نہیں سنا۔ ہم بھائی بھی ان کے نقش قدم پہ چلتے ہیں۔ حالانکہ ہم میں سے کچھ شیعہ مسلک کے زیادہ پابند ہیں اور کچھ بظاہر سنی ہیں یعنی عید کی نماز یا عید جمعہ و دیگر نمازوں کی ادائیگی کے وقت سنیوں کے ساتھ شامل رہتے ہیں۔ مجھے دوسرے مذاہب کے متعلق کتابیں پڑھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے حالانکہ میرے کچھ عزیزوں کو ہے۔ مجھے تو باقاعدہ شوق ہے کہ دیگر مذاہب کی کتابیں پڑھ کر، ان میں موجود اصولوں کا قرآن کریم کے اصولوں سے موازنہ کروں۔ اس سوچ کے نتیجے میں سنیوں اور شیعوں کی کئی کتب کا مطالعہ کر چکا ہوں اور دونوں مسالک کے بچوں کے لیے علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھی ہیں۔ عیسائی، ہندو، تھیاسوفی، تصوف اور دیگر مذاہب کی کتابیں اکثر شوق سے پڑھتا ہوں۔ توریت، انجیل، زبور، تھیاسوفی کا ترجمہ بھی کر چکا ہوں۔ ان جدا جدا مذاہب کے اصولوں کو سمجھنے کے بعد صوفیوں کی یہ بات پوری طرح ثابت ہوتی ہے کہ تمام مذاہب کا مخزن و محور ایک ہی ہے یعنی اللہ کی وحدت اور مخلوقات کی کثرت، اللہ کے حکم کی تابعداری اور فرمانبرداری جسے ''اسلام'' کہتے ہیں اور مذاہب کے بانیوں یعنی پیغمبروں اور اولیاؤں کی تعظیم۔ دراصل رفتہ رفتہ، ظاہری رسومات، قومی احساسات اور مختلف خاصیتوں کی بناء پر تفاوت پیدا ہوا اور علیحدہ علیحدہ فرقے بن گئے۔

ان باتوں کو مدنظر رکھ کر کہتا ہوں کہ تصوف کا بنیادی اصول ''صلح کُل'' سب سے بہتر ہے جو خالص اسلام ہے اور جس میں تمام مذاہب آجاتے ہیں جن کی رو سے تمام انسان آپس میں بھائی بھائی اور ہم مذہب ہو سکتے ہیں۔

جاؤ گے جس مذہب میں تم، دیکھو گے جھگڑا و فساد
جو ہو آرام کے طالب تو لوٹو صلح کل کی جانب

کیا تعصب نے علیحدہ ہندو و مسلم کا برتن
ورنہ مے خانے میں، ساقی بھی ایک پیالہ بھی ایک

اس موضوع کے متعلق میرے کئی اشعار ہیں جو بارہویں باب میں شامل ہیں۔

میرا مذہب:

بعض افراد مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تمہارا مذہب کیا ہے؟ سنی ہو یا شیعہ یا پھر ان کچھ اور؟ تمہارا پیر یا مرشد کون ہے؟ ایسے سوالات پر الجھ جاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ میں سنی بھی ہوں تو شیعہ بھی۔ بلکہ سب مذہب میرے ہیں۔ تمام مذاہب کے اصول جانتا ہوں۔ ان پر کتابیں لکھ چکا ہوں اور بغیر تعصب کے سب سے میل جول ہے۔ میں جانتا ہوں کہ دنیا میں:

دونوں ہیں درکار کعبہ بھی بت خانہ بھی
اک چکی کے دو پاٹ ہوتے ہیں ضرور

نہ صرف آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا بلکہ ان کی مرکزی کمیٹی کا بھی ممبر ہوں۔ سندھ اور حیدرآباد کی انجمن امامیہ کا ممبر بھی ہوں۔ اس سے قبل اس کا وائس پریزیڈنٹ تھا۔ شیعوں اور سنیوں کی مشترکہ انجمن اسلامیہ کا پہلے وائس پریزیڈنٹ اور اب ممبر ہوں۔ مرثیہ و منقبت پڑھتا ہوں اور خود بھی لکھتے ہیں۔ مگر یاروں اور اصحابہ کو غلط لفظ نہیں کہہ سکتا بلکہ تمام مذاہب کے بانیوں کے لیے تعظیم رکھتا ہوں۔ اولیاؤں اور صوفی درویشوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ ان کا کلام خوب پڑھتا اور پسند کرتا ہوں۔ میرے پیر و مرشد حضرت علیؑ اور ان کی اولاد، دیگر اولیاء و بزرگ ہیں۔ اس لیے کہتا ہوں کہ نہ میں سنی نہ میں شیعہ اور نہ کچھ اور۔

اس سوچ کے تحت نوکری کے وقت یا اس سے قبل اور بعد میں بھی جب بھی کسی عالم فاضل، پیر فقیر یا کسی درویش وصوفی کے بارے میں سنتا ہوں تو جا کر انھیں ملتا اور ان کی صحبت میں وقت گزارتا ہوں۔

بیر کی مانند تصوف میں کاملوں سے ربط رکھ
دیکھ کو پیوند سے کیسے بن گئے صوفی، سندھی

مرحوم بزرگ واولیاء، جن کے متعلق کتابوں میں ذکر پڑھا ہے، یا کہیں تعریف سنی ہے ان کی درگاہوں اور مقبروں کی زیارت بھی کی ہے۔ سندھ کی تقریباً سب درگاہیں دیکھی ہیں۔ جب کوٹڑی ڈویژن میں تھا تب کوہستان سے آگے پب پہاڑ عبور کر کے لاہوت بھی گیا اور شاہ بلال کی درگاہ کی زیارت کی۔ اس بارے میں میرا ایک شعر بھی ہے جو "سودائے خام" میں موجود ہے۔ دورانِ ملازمت اس قسم کی درگاہوں کے متعلق تحریریں قلمبند کر کے کمشنر صاحب مسٹر جیمس کے کہنے پر، انھیں بھیجیں۔ میرا ہمیشہ خیال رہا کہ:

مرشد کامل ہے، صاف سینہ
ہے سکھاتا طوطے کو یہ آئینہ

آنکھ ودل تجھ کو ملے، تیرے آگے ہی کھلا عالم کا باب
اور کیسا استاد چاہیے، اور کیا چاہیے کتاب

کوئی مسلم ہے مجھے کہتا، کوئی کہتا ہے کافر کالا
حقیقت دین میرا ہے، اعلیٰ تر گنوں والا

نواں باب

میری عادات، خواہشات، خیالات اور آراء

(دوسرا حصہ)

خوراک:

میں پہلے روزہ رکھنے کی عادت کا ذکر کر چکا ہوں، اب اپنے روزمرہ کے کھانے پینے کی عادات کے متعلق ذکر کروں گا۔ ہم سب بہن بھائی اور گھر کے تمام افراد کم خوراکی اور سادہ غذا کے عادی رہے ہیں۔ آسانی سے بھوک پیاس برداشت کر لیتے ہیں۔ بلکہ سخت موسم بھی جھیل لیتے ہیں۔ بچپن سے یہ عادتیں زندگی کا حصہ ہیں اس لیے کم زیادہ گرمی، سردی یا موسمی تغیرات کی بنا پر، اللہ کی مہربانی سے بیمار نہیں پڑتے۔ مکلف و مرغن غذا کے قطعی عادی نہیں ہیں۔ اس عادت کی وجہ سے اشتہا قابو میں رہتی ہے۔ زیادہ تر کھانا وقت کی پابندی سے کھاتے ہیں۔ بچپن سے نہ صرف گندم اور چاول بلکہ دیہاتی غذا یعنی باجرہ اور جوار کی روٹی، لسی اور مکھن پسندیدہ غذا ہے۔ عام طور پر گندم اپنی زمین سے آتی ہے۔ اپنا چوپایہ مال ضرور پالتے ہیں تاکہ دودھ لسی اور مکھن گھر میں رہے۔ گوشت، مچھلی اور پلا بھی کھاتے ہیں مگر سبزی اور میوے زیادہ پسند ہیں۔ مجھے تو سبزیاں بہ نسبت گوشت کے زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ میرا بیٹا نادر بیگ اور ان کے بال بچے فقط سبزیاں کھاتے ہیں۔ گوشت یا ماس بالکل نہیں کھاتے۔ اس لیے نہیں کہ وہ تھیاسوفسٹ ہیں بلکہ کم عمری سے ہی اسے طبیعت کا میلان اور تندرستی کا تقاضا سمجھتے ہیں۔ گھر میں ہم سب چھوٹے بڑے ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر ہاتھ سے کھانا کھاتے ہیں۔ کچھ عرصے پہلے یعنی ملازمت کے بعد سے میں کانٹے چھری کے ساتھ میز پر

بیٹھ کر کھاتا ہوں مگر گھر کے دیگر افراد کانٹے چھری کا استعمال نہیں کرتے۔ بھائی جعفر قلی اپنی بیگم اور بچوں کے ساتھ کانٹے چھری کے ساتھ کھاتے ہیں۔ مگر جب ہمارے پاس آتے تھے تب ہاتھ سے ہی کھاتے تھے۔ نادر بیگ کا بھی یہی دستور رہا۔ جوانی سے ہی کم خوراکی اور کم گوئی میری عادت ہے۔

آدم کو کیا خراب و خوار، دو سازوں نے
اک شہنائی گلے کی دوسرا ڈھول پیٹ کا
باقی ہیں یہی دونوں فتنہ و فساد کے
وہ ہوتا نہیں خوار جو کم خور بنا

عام طور پر ہر چار پانچ گھنٹے کے بعد کچھ نہ کچھ کھاتا پیتا ہوں تاکہ کام کاج کرنے کی طاقت رہے۔ جب صبح سویرے چار پانچ بجے اٹھتا ہوں تو ڈبل روٹی یا بسکٹ کے ساتھ چائے یا کافی لیتا ہوں۔ پھر نو دس بجے ہلکا ناشتہ اور چائے اور ایک بجے کے قریب دوپہر کا کھانا۔ دن کو چار پانچ بجے بسکٹ اور چائے اور پھر نو بجے کے قریب رات کا کھانا۔ اس کے بعد ایک گھنٹہ چہل قدمی کر کے سو جاتا ہوں۔ میں چائے زیادہ پیتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ مجھ میں شاید اسی وجہ سے کام کرنے کی زیادہ ہمت ہے۔ چائے کی تعریف میں ایک شعر بھی ہے جو گیارھویں باب میں شامل ہے۔ اس کے باوجود بھی کئی کئی دن تک چائے کا ناغہ اس لیے کرتا ہوں کہ کہیں عادی نہ ہو جاؤں۔ پانی ابال کر پینے کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ اگر پانی یا پینے والے برتن کو صاف نہ دیکھیں تو پانی قطعی نہیں پی سکتے۔ اگرچہ سب ساتھ مل کر کھانا کھاتے ہیں لیکن ہر ایک چمچے سے اپنی رکابی میں سالن نکالتا ہے۔ ایک ہی برتن میں ہاتھ ڈال کر کھانا کھانا معیوب سمجھتے ہیں۔ سوڈا یا لیموں پانی کے ساتھ پسند کرتے ہیں۔ شراب کو حرام سمجھتے ہیں اور ہم میں سے کوئی بھی شراب نہیں پیتا۔ تمبا کو یعنی حقہ بھی نہیں پیتے۔ ہاں البتہ والد صاحب اور امی حقہ پیتے تھے۔ اب کچھ عرصے سے، خاندان کے کچھ لڑکے سگار پیتے ہیں مگر مجھ سے چھپا کر۔

غسل اور صفائی:

صفائی ستھرائی کا بھی ہمیں بہت احساس رہتا ہے۔ موسم گرما میں تو ہر روز صبح سویرے ضرور نہاتا ہوں بلکہ کبھی کبھی تو شام کو بھی۔ بچوں کو بھی تقریباً ہر روز نہلاتے ہیں۔ سردی میں روز نہیں نہایا جاتا اگرچہ گرم پانی استعمال کرتے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں، بچے چھلیل جا کر بھی نہاتے ہیں۔ میں خود تو تیرنا نہیں جانتا مگر بچے تیراکی جانتے ہیں۔

لباس:

خوراک کے بعد کچھ ذکر لباس کا۔ والد صاحب مرحوم جب سندھ پہنچے تب ایرانی لباس زیب تن کرتے تھے۔ وہ قبا جو پہن کر یہاں آئے تھے اب بھی ہمارے پاس موجود ہے بالکل اس طرح جیسے میری پیدائش پر مجھے پہنایا جانے والا کرتا ابھی تک سنبھال کے رکھا ہوا ہے۔ میر صاحبان کے پاس رہنے کی وجہ سے نانا اور والد صاحب نے سندھی میرانہ لباس پہننا شروع کیا۔ یعنی میرانی سندھی ٹوپی، کرتا، صدری اور جوتے۔ میر صاحبان کے بعد بھی ان کا لباس یہی رہا۔ اپنے آخری دنوں میں ٹوپی لگانے کے بجائے لنگی کی پگڑی باندھنے لگے تھے۔ میرے دو بڑے بھائی بھی سندھی ٹوپی اور یہی لباس پہنتے تھے بلکہ بمبئی کے کالج میں بھی سندھی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ اس لباس میں ان کی ایک تصویر بھی موجود ہے۔ میں نے یا میرے چھوٹے بھائیوں نے کبھی میرانی سندھی ٹوپی نہیں پہنی۔ گھر میں جمنی ٹوپی لگاتے، بعد میں پگڑی باندھنے لگ گئے تھے۔ کالج میں بھی میں پگڑی باندھ کر جاتا تھا۔ بعد میں وہاں دیگر ایرانیوں اور آغا خانیوں کی صحبت میں سیاہ ٹوپی لگانے لگا۔ اس کے بعد ترکی ٹوپی کا استعمال شروع کیا جو اب تک رائج ہے۔ انگریزی ٹوپی صرف ڈاکٹر مرزا اور نادر بیگ نے استعمال کی۔ خاندان کے دوسرے نوجوانوں نے اب استعمال کرنا شروع کی ہے۔ نوکری سے پہلے میں کلین شیو تھا۔ پھر داڑھی مونڈنا ترک کردی۔ جس کے متعلق میں نے فارسی میں بھی کچھ شاعری کی ہے۔ بڑھاپے میں بالوں کو خضاب نہیں لگاتا۔

پیدل چلنے کی عادت بچپن سے ہی پختہ ہے۔ سات آٹھ برس کی عمر میں گاؤں سے شہر پیدل آتے جاتے تھے۔ دیہات میں رہنے کے باعث خوب گھومتے پھرتے تھے بلکہ میلوں کے میل سفر طے کر جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں اپنے دو بھائیوں کے ساتھ پیدل ٹنڈو محمد خان گیا تھا جو وہاں سے دس کوس دور تھا۔ ہم شام کو نکلے۔ چاندنی رات تھی۔ صبح کے قریب ہم وہاں پہنچے۔ دن وہاں گزارا، شام کو وہاں سے نکل کر گاؤں واپس پہنچے۔ میں آج بھی صبح کو بلا ناغہ گھنٹہ دو گھنٹہ ضرور پیدل چلتا ہوں۔ اور پھر قریباً آٹھ بجے واپس آ کر کام شروع کرتا ہوں۔ ہمارے بچے بھی پیدل سفر کرتے ہیں لیکن چونکہ اب ہمارے پاس گاڑیاں، گھوڑے اور بائیسکلیں ہیں لہٰذا وہ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی اچھے موسم میں انھیں پیدل ہی بھیجتے ہیں۔ ملازمت کے دنوں میں ضلع میہڑ اور قمبر میں تمام پہاڑی علاقے گھوما "کتے کی قبر" بھی دیکھی اور اس قبر کے بارے میں لکھا بھی۔ کوٹڑی سے کھیر تھر اور کالا جبل بھی پیدل آیا گیا ہوں۔ اس سفر پر تو پہاڑی علاقوں کے رہائشی تک حیران رہ گئے۔

ہوا میں پیر، مگر ہوئی نہ رخصت جوانی
پھول کھو دیتا ہے رنگ، رہتی ہے خوشبو باقی

جانوروں سے سلوک:

دیہات میں رہنے کی وجہ سے پودوں اور پرندوں کا بہت شوق رہا۔ گائیں، بھینسیں، بکریاں، گھوڑے اور اونٹ وغیرہ رکھنے پڑتے ہیں۔ ہرن، بارہ سنگھے، دنبے وغیرہ بھی پالتے ہیں۔ بلکہ ہم نے تو سانبھر اور ہرن وغیرہ کے بچوں کو بھی پالنے کی کوشش کی مگر وہ بچ نہ پائے۔ میرے بھائیوں نے شکاری کتے اور بلے بھی پالے ہوئے ہیں۔ مگر مجھے ان سے قطعی دلچسپی نہیں ہے۔ اچھی نسل کی مرغیاں، بطخیں، مور، تیتر، کبوتر، طوطے اور مختلف النوع پرندے اکثر پالتے ہیں اور ان کی نسل بچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عمدہ نسل کے گھوڑے بھی ہمارے پاس موجود رہتے ہیں۔

بوقت ضرورت گھر کے پالے ہوئے جانوروں ہی میں سے جانور منگواتے ہیں، اتنے بہت سے جانوروں کی موجودگی کی بناء پر میں اپنے آبائی گھر کو ''کشتی نوح'' کہتا ہوں کہ جس میں ہر جانور اپنی جوڑے کے ساتھ موجود ہے۔ اس صورت حال کی عکاسی بھی میں نے اپنی شاعری میں کی ہے۔

شکار:

گاؤں میں پرورش پانے کی وجہ سے بچپن ہی سے شکار کا شوق رہا۔ خاص طور پر میرے بڑے بھائیوں کو۔ بچپن میں یہ لوگ جال کے ذریعے تیتر پکڑتے تھے اور بڑے ہونے پر بندوق سے شکار کرتے تھے۔ بھائی مرزا صادق علی بیگ اور بھائی جعفر قلی بیگ بطور خاص شکار کے شوقین تھے۔ نشانہ بھی اچھا تھا۔ دوسرے بھائی بھی شکار کرتے تھے۔ ہرن، بارہ سنگھے، خرگوش، بطخیں، تلور، ہنس اور تیتر شکار کرتے تھے۔ میں خود بھی جوانی میں شکار کا شوق رکھتا تھا اور ملازمت کے دنوں میں بندوق ساتھ رکھتا تھا۔ ایک بار اتفاقاً میرے ہاتھ سے بندوق چل گئی اور اس کا ٹریگر میرے گال پر لگا، بڑا گہرا زخم لگا جس کی وجہ سے بہت عرصہ تکلیف رہی۔ یہ داغ اب بھی موجود ہے مگر اب داڑھی میں چھپ گیا ہے۔ اس کے بعد سے بندوق نہ رکھی اور نہ ہی پھر کبھی شکار کیا۔ اس کے علاوہ مجھے جانوروں پر بڑا رحم بھی آتا ہے۔ شکار کے بارے میں، میری رائے ہے کہ جہاں کچھ اور کھانے کو میسر نہ ہو وہاں پرندے یا جانور کا شکار کیا جائے۔ ایسی صورت میں بھی صرف اتنے ہی پرندے یا جانور شکار کیے جائیں جتنی ضرورت ہو۔ تماشے کے لیے پرندے یا جانور مارنا گناہ کے برابر ہے۔

گئی ہائے جوانی، نہ کبھی پھر دیکھ سکوں
ہرن کا شکار دل اب تک ہے پکارے، کروں
قد میرا ہوا کمان بڑھاپے سے خمیدہ
لاٹھی بنا کے زہ تیر اندازی خوب، کروں

موذی جانور یعنی سانپ، بچھو اور بھیڑیئے وغیرہ کو مارنا دوسری بات ہے۔ مجھے بہر حال جانوروں پر بہت رحم آتا ہے۔ میں نے کبھی ہاتھ سے کوئی جاندار، حتیٰ کہ مرغ یا تیتر بھی نہ کاٹا ہوگا اور نہ ہی کسی اور کو کاٹتے دیکھ سکتا ہوں۔ میں تو دیہات میں بھڑ یا بچھو کو دیکھ کر بھی چھوڑ دیتا تھا۔ دورانِ ملازمت، ایک بار، صبح کی چہل قدمی کے دوران سڑک پر ایک بچھوا سرکتا دیکھا۔ بڑا حیران ہوا کہ یہ بچھوا خشکی پر کیوں کر آیا۔ ایک لحظہ کے لیے سوچا۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو سڑک کے اس پار کوئی دو میل کے فاصلے پر ایک نالہ بہہ رہا تھا جو ان دنوں سوکھ رہا تھا اور سڑک کے دوسری پار کوئی ایک میل کے فاصلے پر ایک نہر تھی۔ بچھوے نے اپنی جبلت کے تابع سوچا ہوگا کہ پانی خشک ہونے کے باعث اب نہر کی طرف جانا چاہیے اس لیے اس سمت سرکتا جارہا تھا۔ مجھے خوف ہوا کہ کہیں کوئی کتا، گیدڑ یا کوئی دسرا جانور اسے مار نہ ڈالے، لہٰذا اسے اٹھا کر، پیدل سفر کر کے نہر تک پہنچا آیا۔ اس عمل نے دل کو بڑی راحت پہنچائی۔ اس کے علاوہ گوشت کم کھانے کے باعث بھی شکار کرنے کی خواہش دل میں نہیں جاگتی۔ اس جذبے کی بناء پر جانوروں کو ظلم سے بچانے والی سوسائٹی کا ممبر ہوں۔ جس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا۔

جان بخشا حیوان کی، اصل ہے انسانیت
بنو تم انسان اے بھائی، کیوں کاٹتے ہو جاندار

نوکری کا طریقۂ کار:

سرکاری ملازمت کس طرح کرتا تھا اس کا کچھ ذکر کرنا چاہوں گا۔ سرکار کا ملازم ہونے کے باعث، سرکاری احکامات، قواعد وضوابط کی مکمل تعمیل کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ خواہ کسی معاملے میں میری رائے مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ رعایا کی حیثیت سے، میں خود پر لازم سمجھتا ہوں کہ سرکار کے خلاف نہ کوئی لفظ کہوں، نہ سنوں۔ سرکار کے خلاف فساد یا بغاوت کرنا نامناسب بلکہ اسلامی اصولوں کے مطابق نمک حرامی اور گناہ سمجھتا ہوں۔ نوکری ایمانداری سے

کرتا تھا گو کہ سرکاری احکامات کی مکمل تعمیل کرتا اس کے باوجود بھی رعایا اور خلق پر انصاف، رحم اور مہربانی سے نظر رکھتا تھا۔ سرکاری قاعدہ خواہ کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو، اس کی تعمیل عملدار کے دلی احساسات سے تعلق رکھتی ہے اگر قانون لاگو کرنے والا آفیسر نرم مزاج ہے تو قانون کو نرمی سے لاگو کرے گا اور اگر افسر سخت مزاج ہے تو قانون کو سختی سے نافذ کرے گا۔ بے شک یہ اعتدال کا راستہ ہے۔ جس سے قاعدے کی تعمیل بھی ہو اور کسی کو خواہ مخواہ تکلیف بھی نہ پہنچے۔ مثلاً لگان کے مسئلے کو لیجیے: اگر حکومتی قوانین سختی سے نافذ کیے جائیں تو کاشت کار کو بلا سبب زیادہ مشکلات پیش آسکتی ہیں اور اگر لگان کے وہی قوانین قدرے نرمی سے نافذ کیے جائیں تو کاشتکار کو سہولت رہے گی۔

راہ دکھانا چاہو گر، ہے عالم سارا راہ
ہاتھ بڑھاؤ اور بچاؤ، دنیا ہے گڑھا

سرکاری ملازمت کے عرصے میں نہ تو میں نے کسی سے بہت گہری دوستی کی نہ کسی سے خاص دشمنی۔ اس طرح کوئی نہیں کہہ سکتا کہ فلاں زمیندار سے یا فلاں شخص سے فلاں کی دوستی یا دشمنی ہے۔ تمام افراد کو ان کی حیثیت کے مطابق مان مرتبہ دیتا تھا اور اچھے کام کرنے پر داد دیتا تھا۔

معافی کے خواستگار کو عام طور پر معاف کر دیتا تھا۔ اگر کبھی کسی نے میرے خلاف کچھ کہا یا کیا تب بھی اس سے بغض رکھ کر، اسے نقصان نہ پہنچایا ہوگا۔ زندگی بھر کسی سے گالی گلوچ نہ کی اور نہ ہی خفگی میں الٹا سیدھا کچھ کہا۔ اگر غلطی سے بہت زیادہ چڑ کر کسی کو 'بدمعاش' یا 'بے وقوف' کہہ دیتا تو بعد میں پشیمانی محسوس کرتا تھا۔

تم باگ اپنی نفس مُہوس کو نہ دو
ایذا نہ کسی خار و خس کو بھی دو
گر چاہو کہ پاؤ جگ میں سکھ اور عزت
بے کس سے نہ لو کچھ اور ناکس کو نہ کچھ دو

یاد ہے، ایک بار کسی لڑکے کو، ایک سرکاری نقصان کرنے کی پاداش میں ''احمق'' بھی کہا، مارا اور ڈپٹ کر نکال دیا، اس کے جانے کے بعد پشیمان ہوا اور ملازمین کو سمجھایا کہ کسی بہانے اسے بلا کر کھانا کھلائیں اور خوش کر کے بھیجیں۔ کسی مقدمہ میں کسی کو سزا دی ہوگی تب بھی رحم کھا کر اور اگر کسی کو مجرم سمجھا تب بھی لاچار قاعدے وقانون کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے سزا دی ہوگی غصے یا عداوت سے نہیں، کسی مقدمے میں ملوث دو گروہوں کو یا ان کے وکلاء کو جان بوجھ کر پریشان نہ کیا ہوگا جس طرح کئی افسران کرتے ہیں بلکہ ان کی سہولت کے لیے وقت نکالا ہوگا۔ فوجداری مقدمات کو نبٹاتے وقت خاص طور پر ڈرتا تھا کہ کہیں بے انصافی نہ ہو جائے۔ جب بھی فیصلے کے لیے کوئی مقدمہ آتا تھا تو اس کے مطالعہ کے بعد فیصلہ کرتے وقت سخت ذہنی الجھن کا شکار رہتا تھا کہ کہیں غلط فیصلہ نہ کر بیٹھوں۔ ایسے حالات میں اکثر نماز پڑھ کر، اللہ سے دعا کرتا کہ مجھے ہدایت کرے اور انصاف کرنے کی توفیق دے۔ اس کے بعد از سر نو کیس کو پڑھتا، غور و فکر کر کے فیصلہ کرتا، اس یقین کے ساتھ کہ یہ فیصلہ اللہ نے میرے دل میں ڈالا ہے اور اگر اس میں کوئی سہو یا بے انصافی ہوگئی تب بھی اللہ معاف کرے گا۔ سرکاری ملازمت میں رشوت سے ہمیشہ اجتناب برتا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس ایمانداری اور سچائی کے بل بوتے پر میں نے اور میرے دوسرے بھائیوں نے بہت عزت پائی۔ میں اس بات پر بھی ہمیشہ نظر رکھتا تھا کہ ہمارا پڑاؤ جہاں بھی ہو وہاں ہمارا عملہ یا ملازمین غریبوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچائیں۔ اس کے لیے بہت سمجھداری کی ضرورت ہوتی تھی اور ہم ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ جو بھی شخص کسی کام یا درخواست کے سلسلے میں آتا اس کا کام جلد از جلد کروا کے اسے روانہ کرتے تھے۔ میں یہ نظر بھی رکھتا تھا کہ کہیں چوکیدار، ملازم یا منشی اسے کوئی تکلیف تو نہیں پہنچاتے۔ حالانکہ اتنے دھیان اور توجہ کے باوجود بھی ملازم طبقہ اپنی کارگزاریوں سے باز نہ آتا تھا۔

پہلا مقدمہ جو کہ میں نے بحیثیت مجسٹریٹ چلایا، وہ مجھے یاد ہے کہ ایک بڑھیا نے جنگل سے تھوڑ جمع کر کے نمک بنایا تھا اور پولیس نے اسے پکڑ لیا تھا۔ اس پر جرمانہ کیا مگر اس

عورت کی غربت دیکھ کر بڑا رحم آیا کہ وہ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے جیل جا رہی تھی اس لیے چھپ چھپا کر نوکر کو جرمانے کے پیسے دیے تاکہ اسے دے کر آئے۔ بغیر ٹکٹ ریلوے میں سفر کرنے والے ایک بھکاری کے ساتھ بھی یہی کیا۔ ملازمت کے دوران اکثر زمینداروں کی دعوت قبول نہ کرتا نہ ہی کسی کی میزبانی کرتا تھا۔

رسم و رواج کے مطابق، مختلف علاقوں کی ہندو پنچائیت، بتاشے یا مصری کے تھال لاتی تھی، میں ان لوگوں کے سامنے ہی ملازم کو بلاتا اور تھال اس کے حوالے کر کے کہتا کہ "کسی اسکول جا کر، استاد کی معرفت بچوں میں بانٹ آؤ" بالا افسران کو بھی کوئی میوہ یا تحفہ نہ بھیجا۔ حالانکہ علم تھا کہ دیگر عملدار ایسا کرتے ہیں اور نہ ہی اعلیٰ افسران کے عملے کو مقرر رقم بھیجنے کی بھی فکر کی۔ یہ کام ان کی صوابدید پر چھوڑتا تھا لیکن مجھے کبھی بھی کسی افسر نے اس بات پر عتاب میں جتلا نہیں کیا۔ کبھی بالا افسروں کی خوشامد نہ کی ہمیشہ برابری کی سطح پر کام کیا۔ مجھے یقین ہے کہ دیگر عملداروں کے رویے اور مزاج و حرکتوں کو دیکھ کر اچھے افسران یہ سمجھتے ہوں گے کہ میں جان بوجھ کر مختلف طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتا ہوں اس لیے سمجھدار عملدار زیادہ مہربان رہتے تھے۔ مگر کچھ خوشامد پسند اسے مغروری قرار دے کر ناراض رہتے تھے۔ مگر میں اس کی پرواہ نہیں کرتا تھا کیونکہ یہ یقین تھا کہ کسی طرف سے بھی بے ایمانی کی تہمت نہیں لگ سکتی بلکہ کسی قسم کا شک بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ کہتے ہیں کہ "آنرا کہ حساب پاک است، از محاسبہ چہ باک۔

کلکٹر کرنل میسو بڑا سخت گیر افسر تھا۔ بے ایمان، رشوت خور اور سست افسروں کا دشمن تھا۔ اس کی مجھ پر اس درجہ مہربانی تھی کہ جب میں وارہ کا مختیارکار تھا۔ بیمار پڑا۔ ان کی بیگم چونکہ اسی علاقے میں رہتی تھیں لہٰذا وہ جب بھی آتا، میرے پاس ضرور آ کر مجھے تسلی دیتا۔ مسٹر میولس بھی مجھ پر بہت مہربان تھے۔ سرکاری ملازمت میں کئی مقامات پر نوکری کی اور ہر جگہ پر دو یا تین سال گزارے، بلکہ کوٹری ڈویژن میں تو میری پوسٹنگ دس سال رہی اور عوام سے ایسا اچھا برتاؤ کیا کہ آج بھی وہاں کے لوگ مجھے یاد کرتے ہیں اور پھر وہاں نوکری کرنے کا کہتے ہیں۔ جب بھی ٹرانسفر ہوتا لوگوں کا اصرار ہوتا کہ کوئی الوداعی پارٹی یا محفل منعقد ہو اور

گروپ فوٹو بنوایا جائے مگر میں نے کبھی کوئی دعوت قبول نہیں کی اور نہ ہی تصویریں بنوائیں۔ حالانکہ اب آج کل یہ دستور سا ہوگیا ہے۔کئی آفیسر تو خود اشاروں کنایوں سے ایسی دعوتیں کرواتے ہیں تاکہ ان کی شہرت ہو۔خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ عادت نہ تو میرے بھائیوں میں تھی اور نہ ہی ان کے بیٹوں میں۔

دل کا مزاج اور سادگی:

میرا خیال ہے کہ اپنے دلی مزاج اور سادگی کے متعلق اختصار کے ساتھ لکھنا مناسب ہے۔ میں اپنے عزیزوں بلکہ دوستوں میں صابر وشاکر، شریف النفس برداشت و تحمل والا اور کم گو شمار کیا جاتا ہوں۔ اس بات پر میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اسے فخر سمجھ کر خوش ہوتا ہوں۔

نیاز، نسل شرافت کی ہے اصل دلیل
زیادہ موڑے جانے سے جاتی ہے پہچانی تلوار اصیل

میرا نام قلیچ ہے، جس کے ترکی میں معنی ''تلوار'' کے ہیں۔

حالانکہ جانتا ہوں اور اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ لوگ میری ان خوبیوں کو عجیب گردانتے ہیں اور اسے حد سے زیادہ نرمی یا بھولپن شمار کرتے ہیں۔ اگر کوئی طنزیہ بات کہہ دے یا مذاق کرے تو بجائے زیادہ چڑنے کے صبر کرتا ہوں۔ ایسا رویہ کچھ لوگوں کے ہاں بے وقوفانہ سمجھا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا ہو مگر میں سمجھتا ہوں کہ میری طبیعت بچپن سے ایسی ہی ہے یا تو میں بہت معصوم تھا یا وہ زمانہ کچھ اور تھا اور اب کچھ اور ہے۔ معصومیت کی ایک مثال سنیے! اسکول کی تعلیم تک مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ عورتیں بچے کہاں سے لاتی ہیں یا انھیں کیوں کر پیدا ہوتے ہیں! مجھے یاد ہے کہ زیادہ بچوں کو جنم دینے کے باعث میری والدہ کے پیٹ پر جھریاں اور زچگی کے مخصوص نشانات تھے اور مجھے معلوم تھا کہ پیٹ کاٹ کر، بچہ پیٹ سے نکال کر، پیٹ دوبارہ سی دیا جاتا ہے۔ عرصے تک میرا یہی خیال رہا۔ آج کل کے چھ سات

سالہ بچے بھی بچوں کی پیدائش کا عمل جانتے ہیں۔ اپنی سادگی کی اور مثال بیان کرتا چلوں۔ جسے پڑھ کر شاید پڑھنے والوں کو لطف آئے۔ میں نے پچیس برس کی عمر میں سرکاری ملازمت حاصل کی۔ اس وقت تک غیر شادی شدہ تھا۔ پھر شادی کی، جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے۔ جب شادی کرنے کا سوچا، تب خیال آیا کہ شادی تو کر رہا ہوں مگر مرد و عورت کی ازدواجی زندگی کے متعلق تو مجھے اطمینان بخش معلومات نہیں ہیں۔ حالانکہ یہ بات طبعی و فطری ہے اور عام باتوں یعنی کھانے پینے کی طرح خود بخود انسان کو معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ میاں بیوی کی شادی، بچوں کے پیدا ہونے کا سبب اور کوشش ہے مگر ان تعلقات کی مکمل شکل یا صورت معلوم نہیں تھی لہٰذا یہ خطرہ رہتا تھا کہ پتہ نہیں شادی کے بعد میں کیا کروں گا اور کس طرح کروں گا جبکہ مجھے یقین ہے کہ آج کل تو دس برس کی عمر کے بچے بھی شاید اس معاملے کی مکمل واقفیت رکھتے ہیں۔ معصومیت کے علاوہ نرم دلی اور رحم دلی کی خصوصیات بھی میری شخصیت کا حصہ ہیں اگر کبھی میرے بچوں یا ملازمین کے خلاف کبھی کوئی شخص شکایت لے کر آتا ہے تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ قصور یقیناً میرے ہی بچے یا ملازم کا ہے۔ لہٰذا انہیں لازماً فہمائش کرتا یا سزا دیتا ہوں۔ دوسرے لوگ عام طور پر اپنوں کی طرفداری کرتے ہیں۔ کسی بھی شخص کے خلاف شکایت یا برائی اس وقت تک نہیں سنتا ہوں جب تک یقین نہ ہو۔

دو افراد لڑتے دیکھوں یا سنوں تب میرا دل فوراً ان میں سے کمزور فریق کی حمایت کر دیتا ہے اور اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ جو گرے یا ہارے، یا غمزدہ ہو، اس کے لیے بڑا افسوس رہتا ہے۔ دوسروں کے گھروں کے قصے یا غم کا احوال مجھے رلا دیتا ہے۔ ایک بار، دورانِ ملازمت، گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا، راستے میں ایک گاؤں میں، کسی گھر میں فوتگی کی خبر سنی، کسی عورت کا انتقال ہوا تھا، گھر میں کوئی مرد نہ تھا بچے بے تحاشہ رو رہے تھے۔ میں ٹھہر گیا۔ معلوم کرنے پر حقیقت کا ادراک ہوا۔ میں گھوڑے سے اتر گیا۔ اپنے تانگ اور اردلی کی مدد سے اس عورت کے کفن دفن کا بندوبست کیا اور بچوں کو دلاسہ دینے کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کا بندوبست کیا۔ ان کو روتے دیکھ کر، میں نے بھی بہت آنسو بہائے۔ دل کے رجحان

کے اس باعث میں کثرت سے موت کو یاد کرتا ہوں اور رات کو سوتے وقت سمجھتا ہوں کہ شاید رات قضا مجھے لینے آئے۔ میرا شعر ہے کہ

موت کو کرتا ہے ہر دم یاد
ہے تحقیق زندہ جاوید
رکھے جو موت سے دل آشنائی
ہمیشہ کے لیے رہے آباد

اسی خیال کے تحت، میں نے اپنے قبرستان میں، اپنی پہلی بیوی کی قبر کے برابر اپنی پختہ قبر بنوالی ہے۔ وہاں میرے ماں، باپ، بھائی اور بہنوں کی بھی قبریں ہیں۔ وہاں ہر جمعہ کو جا کر فاتحہ خوانی کرواتا ہوں۔ اپنے مرحوم عزیزوں کو یاد کرتا ہوں اور اپنی قبر دیکھ کر کہتا ہوں کہ ایک دن میرا جسدِ خاکی یہاں دفنایا جائے گا بشرطیکہ کہیں کسی اور جگہ دورانِ سفر نہ مر جاؤں۔ اپنا کفن بھی تیار کروالیا ہے بلکہ جنازے کی ڈولی بھی بنوا چکا ہوں، جو کہ دیگر عزیزوں کے انتقال پر استعمال ہورہی ہے۔ اپنے کئی عزیزوں اور دوستوں کے قطعۂ وفات فارسی میں لکھے ہیں۔ یہ خیال بھی دل میں آیا کہ اپنی قبر پر بھی گر میرا ہی قطعۂ وفات کندہ ہو تو کیا ہی اچھا ہو۔ لہٰذا کافی عرصے سے، ہر ہجری سال کے آغاز میں، اپنی موت کی تاریخ شعر میں کہتا ہوں، جن میں ابجد کے حساب سے وہ ہجری سال محفوظ کر لیتا ہوں۔ اپنی اور دیگر احباب کی وفات کی تاریخیں اشعار کی صورت میری کتاب "سودائے خام" میں شامل ہیں۔ نمونے کے طور پر، اپنی وفات کی کچھ تاریخیں گیارہویں باب میں شامل کروں گا۔

صبر وقناعت اور توکل:

شکر ہے اس رب کا جس نے دل میں صبر، قناعت اور توکل کی نعمتیں بھردیں اور دنیا کی طمع سے بالکل بے نیاز رکھا۔ اسی سبب سے پیسہ جوڑنے کی خواہش قطعاً نہیں۔ غربت کے دور سے آج کے حالات تک، اپنی ایمانداری کے سبب پہنچا ہوں، اور یہی راستہ میرے بھائیوں

نے بھی اختیار کیا۔ اسی طرح اطمینان ہے کہ میری اولاد کو بھی اللہ تعالیٰ اچھے حال میں رکھے گا۔ لہٰذا جائز ناجائز ذرائع سے، ان کے لیے دولت جمع کر کے مرنے کی کوئی خواہش نہیں۔

گر چاہو کہ دولت ہو جو پائدار و برقرار
خلوت و قناعت، کی عادت رکھو برقرار
وہ زمانے کی نہ دیکھیں تلخیاں جو کرتا ہے قناعت
کڑوے سمندر میں بھی سیپ، ابر نیساں ہی پئے

اپنی حیثیت کے مطابق اپنا فرض سمجھ کر انھیں تعلیم دی اور دے رہا ہوں، جو کچھ بنایا وہ ان کے لیے چھوڑ کر جانے کے لیے تیار ہوں اور اس مقصد کے لیے کہ مرنے کے بعد اولاد کے درمیان کسی قسم کی ناچاقی یا نااتفاقی نہ ہو، اپنی وصیت لکھ کر اس پر مہر ثبت کر دی ہے۔ اور دو ایگزیکٹوٹرز بھی مقرر کر دیے ہیں تاکہ وصیت کی تعمیل ہو۔ کچھ رقم کی لائف انشورنس پالیسیاں خرید چکا ہوں جو میرے مرنے کے فوراً بعد ان کے کام آسکیں گی۔ یہ بس عقلی و دنیاوی احتیاط ہے باقی سب اللہ کے توکل کے سہارے، ان کے حوالے کر دیا ہے۔

ما کار خویش را بہ خداوند کار ساز
بسپردہ ایم تا کرم اوچہ میکند

بے طمعی:

دنیا کی طمع اس قدر کم ہونے کے باعث دنیا اور آخرت کی عزت و سرخروئی کی ہمیشہ دعا مانگی ہے۔ غلط راستے سے دنیا کی دولت یا بے جا نام و نمود، اعلیٰ عہدے یا بڑے لقب کے لیے کبھی خواہش نہیں کی۔ پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ خیرپور کی وزیری کے لیے میر صاحب فیض محمد خان نے بہت اصرار کیا تھا مگر کچھ اہم اسباب کی بناء پر، جو کہ میرے دل کے اصولوں کے خلاف تھے، اور جن شرائط پر وزیری کی پیشکش ہوئی تھی وہ مجھے قبول نہیں تھیں لیکن یہ شرائط دوسروں نے قبول کیں اور وزیر بن گئے۔ (دیکھیے گیارہواں باب)

سرکاری ملازمین القاب حاصل کرنے کے لیے آفیسروں کی منت سماجت اور خوشامدیں کرتے ہیں۔ مگر میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ مجھے جب ''قیصرِ ہند'' کا تمغہ ملا، اس کے بارے میں بھی مجھے اچانک علم ہوا وہ بھی بذریعہ اخبار۔ اسی سال بھائی مرزا صادق علی بیگ کو بھی ''خان صاحب'' کا لقب ملا تھا اور وہ بھی اس بابت لاعلم تھے۔ نہ معلوم حکومت کو کس محکمے یا کسی شخص نے سفارش کی۔ ملازمت کرتے ہوئے ''سرٹیفکیٹ آف میرٹ'' بھی اچانک ملا اور میں بالکل لاعلم تھا۔ پنشن شروع ہوئی تو حکومت نے ایک ہزار ایکڑ زمین معمولی رقم کے عوض دینے کی پیشکش کی۔ بڑی صعوبتوں کے بعد ایک زمین ٹنڈو محمد خان کے قریب ملی۔ یہاں انجینئر نے پانی دینے پر اعتراض کیا۔ شاید زیادہ پیسہ خرچ کرتے تو انجینئر بھی راضی ہو جاتے مگر نہ تو میرے پاس اضافی پیسے تھے اور نہ ہی دینا چاہتا تھا۔ لہٰذا بڑی نفرت سے زمین کے دعوے سے دستبردار ہو گیا۔ یہ میرے ذہنی و طبعی میلان، توکل و قناعت کی ایک مثال ہے۔ جو بھی صورت حال ہوتی ہے، اس پر قانع رہتا ہوں، اور خود کو اسی لائق سمجھتا ہوں کہ میری بھلائی اسی میں ہے۔

حرص و ہوس کا دل میں پیدا ساز نہ کر
خود بینی اور خود فروشی کا آغاز نہ کر
گر نہ ہوئی مراد تری پوری، نہ پکار
ہو تم نیاز کے لیے یہاں، ناز نہ کر

انھی رجحانات کے سبب جہاں بھی سرکاری طور پر تبادلہ ہوتا تھا، وہاں خوشی سے چلا جاتا کیونکہ جانتا تھا کہ یہی مصلحتِ خداوندی ہے۔ کبھی اپنے تبادلے کے لیے کسی کو درخواست یا عرض نہ کی۔ جانتا ہوں کہ کتنے ہی بے شمار افراد ہیں، جن کی حالت مجھ سے کمتر اور خراب ہے تب شکرانہ ادا کرتا ہوں کہ ان سے بہت بہتر ہوں۔ خدانخواستہ کبھی کوئی مصیبت یا تکلیف پہنچتی ہے یا کوئی نقصان ہوتا ہے تو صبر کرتا ہوں اور دل کو تسلی دیتا ہوں کہ اس سے بھی زیادہ تکلیف یا نقصان پہنچ سکتا تھا یا شاید ہونا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اسے قابلِ برداشت رکھا نجانے دنیا میں کتنے افراد ہوں گے جنھیں اس سے کہیں زیادہ تکلیف ہوئی۔

نفس سے جنگ:

موت کو ہر وقت یاد رکھنے، اللہ پر بھروسہ کرنے اور خلق کی آسائش و فیض رسانی کے خیالات کے ساتھ، دشمنی و اختلافات بھلا کر دوستی کرنے کی خواہش رکھنے سے شیطانی خیالات سے چھٹکارا پانے کی ہمت پیدا ہوتی ہے۔ کبھی کبھی بشریت سے مجبور ہو کر اگر دل میں کوئی برا خیال آتا بھی ہے تو ایک دم اسے بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں اور اکثر فتح یاب ہوتا ہوں۔ یہ عمل کرنے سے اچھے اور رحمانی خیالات کے تصور میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔

نفس جب ہو تابع، تب کام کرو ذہانت کے سب
امن سے عالم رہے جب چور چوکیدار بنے

نہ مرنا جو چاہے تو نفس کو مار
بچے کے لیے مار ہے سدھار

اس عادت کے ساتھ بچپن کی سادگی اور بھولپن بہت تعاون بخش و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہے جو کہ مجھے عجیب لگتا ہے اور جسے میں اپنے لیے اللہ کی خاص مہربانی سمجھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کچھ اور لوگ بھی اس کیفیت سے گزرتے ہوں۔ جب میں بالغ ہوا، تب مجھے یاد ہے کہ میں نے پہلا شیطانی خواب دیکھا۔ جسے ''احتلام'' کہتے ہیں۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ میں بالغ ہوا ہوں اور شیطان اور نفس کا یعنی شہوت کا عمل مجھ پر چل سکتا ہے۔ لہٰذا میں خود پر پابندی لگانے کی کوشش کرنے لگا بچپن کی طبیعت کی سادگی، شرم و حیا اور اپنی عزت و ناموس بچانے کی خواہش، ان تمام چیزوں نے مجھ پر بہت مثبت اثرات مرتب کیے۔ یعنی میں شیطانی کاموں سے بچنے لگا۔ بلکہ شیطانی خیالات تک نہ آنے دیتا یا اگر آتے بھی تھے تو میں اپنی قوت ارادی سے انھیں روکنے میں کامیاب رہتا۔ پھر جلد ہی شادی کی قربت۔ اس جوانی کے وقت سے لے کر آج تک، مجھے کبھی کوئی شیطانی خواب نہیں آیا۔ کئی بار ایسے خواب ضرور دیکھے ہوں گے مگر ہمیشہ اپنی بیوی کے، نہ کسی اور

صورت کے۔ اس کے باوجود کبھی ایسی صورت حال سے نہ گزرا کہ لازماً نہانے کی نوبت آئے۔ یہ بات میں عجیب سمجھتا ہوں اور جیسا کہ عرض کیا کہ اسے اللہ کی خاص مہربانی سمجھتا ہوں۔ حالانکہ امکان ہے کہ دیگر افراد بھی اس کیفیت سے گزرتے ہوں۔ بہرحال۔ اس کیفیت کے لیے اللہ تعالیٰ کا شکرگزار رہتا ہوں۔

کس نے کیا مجھ گدا سے، تجھ کو برابر اے شاہ
نفس اور ہوس بنے میرے ایک غلام
غالب ہوا نفس تجھ پر، بنا تیرا آقا
میرے بھی اک غلام کے ہوئے تم غلام

میری عادات، خواہشات، خیالات اور آراء
(تیسرا حصہ)

شادی کے متعلق میری رائے:

شادی کرنے یا مجرد رہنے کے متعلق، شادی سے قبل میں نے بہت سوچا تھا۔ اور باقاعدہ موازنہ کرتے ہوئے دونوں کے فائدے و نقصانات تفصیل کے ساتھ کاغذ پر لکھے، تجزیہ کیا اور پھر شادی کی۔ اس نکتے پر اپنی مختصر رائے اس لیے پیش کرنا چاہتا ہوں کہ شاید پڑھنے والوں یا پھر میری اپنی اولاد کو پسند آئے اور وہ اس سے کچھ رہنمائی حاصل کریں۔ اس موضوع پر کچھ تو اپنے باب "زینت" میں بھی تحریر کیا ہے اس کے علاوہ مضمون پر ایک شعر بھی ہے۔ (گیارہواں باب دیکھیے)

جس طرح کہ پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ اوائل عمری میں، میں شادی کرنے کے خلاف تھا اور مجرد و آزاد زندگی گزارنے کا قائل تھا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ میرے خیالات میں تبدیلی آئی اور شادی شدہ زندگی کو بہتر سمجھنے لگا مگر یوروپین انداز زندگی سے متاثر ہونے کی بناء پر یہی خواہش تھی کہ کسی یوروپین لڑکی سے شادی کی جائے نہ کہ سندھی گھرانے سے۔ اس کے لیے باقاعدہ کوشش بھی کی مگر پھر ان کی خامیوں پہ بھی نظر گئی اور دیسی شادی کی افادیت زیادہ معلوم ہوئی مگر اس شرط کے ساتھ کہ پہلے لڑکی دیکھ کر پسند کرنی چاہیے۔ سوچ و فکر کی تبدیلی کے اِن مراحل سے گزرنے کے بعد شادی کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ اگر کوئی خاص اعتراض نہ ہو اور خود پر پہرہ لگانا، یعنی اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پانا مشکل نظر آئے تو

مجرد رہنے سے، شادی کرنا زیادہ بہتر عمل ہے۔ اس لیے کہ اس طرح دنیا میں وقت بہتر طور پر گزرتا ہے، دل کے خیالات اچھے اور پاکیزہ رہتے ہیں اور دینی حکم کی بجا آوری بھی ہو جاتی ہے۔ عزیزوں، دوستوں، اپنی قوم، ذات یا خاندان میں اگر کوئی مناسب رشتہ نہ ہو، تب مجبوراً غیروں میں شادی کرنی چاہیے۔ کیونکہ جتنا احساس اپنے کو ہوگا، اس قدر غیر کو نہ ہوگا۔ کوشش کرکے، شادی وہاں کی جائے جہاں لوگ تہذیب یافتہ ہوں اور اگر لڑکی حسین و دولت مند بھی ہو تو سب سے بہتر و گرنہ آخری دونوں شرائط لازمی نہیں۔

شادی کرنے کی درست عمر، میری نظر میں سن بلوغت کا آغاز ہے۔ کیا لڑکی کیا لڑکا، بالغ ہوتے ہی ان کی فوراً شادی کر دینی چاہیے اگر کوئی اور ناگزیر وجہ مانع نہ ہو تب۔ ایسا کرنے سے ایک تو بچے کے خیالات مجتمع رہیں گے دوسرا اِدھر اُدھر بھٹکنے اور اندھی جوانی کے جوش میں کوئی غلط حرکت کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ اس کے علاوہ کئی دیگر برائیوں سے بھی بچا رہے گا۔ بچت کی عادت اپنانے کے ساتھ ساتھ محنت کو اپنا شعار بنائے گا۔ ورنہ جن بچوں میں سن بلوغت کے آغاز سے کوئی بری عادت پڑ جائے تا عمر اس میں مبتلا رہنے کا امکان رہتا ہے۔ دوم یہ کہ شروع سے ہی میاں بیوی کی آپس میں الفت ہونے سے، یہ محبت تا عمر چلتی ہے۔ سوم یہ کہ اولاد ماں باپ کی زندگی میں اتنی بڑی ہو جاتی ہے کہ وہ اسے اپنی مرضی کے متعلق تعلیم دلا کر، لائق فائق بنا سکتے ہیں۔ اس ضمن میں ہمارے پاس ہمارے والدین کی مثال موجود ہے۔ بیٹیوں کے متعلق میری رائے ہے کہ گر اپنے عزیزوں اور دوستوں میں کوئی رشتہ بہتر ہے تو بہتر، ورنہ غیروں میں، کسی خاندانی، تہذیب یافتہ، آسودہ اور باعزت جوان کے ساتھ رشتہ کرنے میں کوئی عیب نہیں سمجھنا چاہیے۔ گر کوئی مناسب رشتہ نہ ہو تو پھر غیر شادی شدہ رہنا بہتر۔ حالانکہ شادی کا شوق ہر مرد و زن کو ہوتا ہے۔

شادی سے ہوتی ہے خانہ آبادی
شادی سے ہی ہوتی ہے خانہ بربادی
اول ہے راحت، آخر ہے رنج
تب بھی ہر اک پکارتا ہے شادی، شادی

میری رائے ہے کہ صرف ایک شادی کرنی چاہیے۔ کسی بھی عذر پر، دوسری شادی کرنا نامناسب ہے سوائے کسی خاص مجبوری کے۔ جس زمانے میں کثرت ازدواج کا رواج تھا اور اس کے علاوہ باندیاں اور دیگر عورتیں بھی رکھی جاتی تھیں، تب بھی ہمارے والد صاحب نے ایک ہی شادی پہ قناعت کی۔ اور ہم سب بہن بھائی ایک ہی ماں سے پیدا ہوئے۔ اگرچہ نانا مرحوم کی دو تین شادیاں تھیں۔ اس بات سے گھر کے معاملے میں والد صاحب کے خیالات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ تجربے کی روشنی میں، میں کہہ سکتا ہوں کہ انسان میں نفسانی خواہش اور شہوت بہت زیادہ ہے۔ حسن وعشق کی دل پذیری سے بھی انکار ممکن نہیں۔ اس کے باوجود بھی قدرت والے کی مہربانی سے، حیا، شرم، ننگ، ناموس اور عزت سے اپنا وقت گزارا۔ بچپن کی تعلیم وتربیت اور اچھی عادتیں ہمیشہ دامنگیر رہیں اور مجھے اپنی پناہ میں رکھا۔ اس خاندانی تربیت اور اچھی تعلیم نے عین عالم شباب میں، اعلیٰ ملازمت، پیسے کی آسودگی اور اختیارات کے باوجود بے حیائی اور نامناسب کام سے دور رکھا۔

یہ رائے لکھنے سے میری مراد یہ ہے کہ اپنی اولاد کو اپنے تجربے وخیالات سے فائدہ پہنچائیں اور کم عمری میں ہی بچوں کو مذہبی، اخلاقی تعلیم اور اچھی صحبت دینے کی کوشش کریں۔

علم کا شوق:

اب میں اپنے لکھنے پڑھنے کے شوق اور عادت کا کچھ مفصل ذکر کروں گا۔ پچھلے ابواب میں درج ہے کہ پڑھنے لکھنے کا شوق مجھے بچپن ہی سے بہت رہا۔ بلکہ کھیل کود پر بھی کتاب کو ترجیح دیتا تھا۔ اوائل عمری سے کتابیں لکھنے اور اشعار کہنے کا شوق رہا اور یہ جانتا ہوں کہ:

جس کی خامشی میں مزہ ہے لاکھوں باتوں کا اے یار
اور کوئی چیز ایسا لطف نہ دے سوائے کتاب
اولاد مری ہیں شعر وسخن، فخر ہے جن پر مجھ کو
جاہل نہیں ہوں جو کروں باپ دادا پر فخر

جیسے جیسے میرے علم میں اضافہ ہوتا گیا، ویسے ویسے کتابوں کا ذخیرہ بڑھتا گیا۔ اسی لیے ہمارے بزرگوں کی عمدہ و قیمتی کتب میں نے خاص طور پر اپنے پاس سنبھالیں۔ اس کے علاوہ انگریزی، عربی، فارسی، ترکی، اُردو اور دیگر زبانوں کی کتابیں بھی پڑھنے اور جمع کرنے لگا۔ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران، مجھے یاد ہے کہ اتوار کے دن ''کالبادیوی روڈ'' پر پرانی کتابوں کی دکان پر جا کر بیٹھتا تھا۔ کالج چھوڑنے کے بعد بھی یہ شوق قائم رہا اور کراچی کی لائبریریوں میں جا کر کتابیں پڑھتا اور کچھ کتابیں اپنے لیے خریدتا بھی تھا۔ جب میرے پاس بہت سی انگریزی کتابیں جمع ہوگئیں، تو میں نے یہ سب کتابیں کراچی کی جنرل لائبریری میں بطور امانت رکھوائیں، تاکہ سلامت بھی رہیں اور پڑھنے والے استفادہ بھی کریں۔ کافی عرصے بعد جب میں نے اپنا گھر بنوایا اور کتابوں کی الماری خریدی، تب وہ کتابیں وہاں سے نکلوائیں مگر افسوس کہ ان میں سے بہت سی کتابیں گم تھیں اور کسی نے بھی ذمہ داری قبول نہ کی۔ مجھے اس بات کا بہت افسوس ہوا۔ اس کے بعد سے آج تک نئی کتابیں جمع کرتا رہا ہوں جن میں سندھی زبان کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ سندھی میں جو بھی نئی کتاب شایع ہوتی ہے اس کا ادیب ہمیشہ ایک کتاب مجھے بھیجنے کی مہربانی کرتا ہے۔ خود میری اپنی تحریر کردہ کتابوں کی بھی ایک اچھی خاصی لائبریری ہے۔ اس کے باوجود بھی میں اپنی نادانی قبول کرتا ہوں۔

کسی علم سے بھی قلیچ محروم نہ ہوا
نکتہ نہ رہا کوئی، جس کا مفہوم نہ ہوا
ستر کے قریب پہنچا، تب اس کو
معلوم ہوا کہ کچھ معلوم نہ ہوا

مجھے عام طور پر علم، حکمت، فلسفے، اخلاق اور مذاہب کی کتابیں پسند آتی ہیں اور وہی پڑھتا ہوں خواہ وہ انگریزی میں ہوں یا کسی اور زبان میں۔ ناول اور قصے عموماً نہیں پڑھتا۔ آنکھوں سے دیکھ کر، دل میں پڑھتا ہوں اور بہت تیز رفتاری سے پڑھتا ہوں، مگر بہت دھیان سے اور اچھے جملوں پر خط کشیدہ کرتا ہوں جنھیں کتاب ختم کرنے کے بعد، علیحدہ نوٹ بک پر

لکھتا ہوں۔ جتنی بھی کتابیں میرے پاس ہیں، ضخیم اور کوئی کئی جلدوں پر مشتمل، انھیں کم از کم ایک بار تو میں نے ضرور پڑھا ہے۔ کئی کتابیں دو تین بار پڑھ چکا ہوں۔ خاص طور پر وہ جن کے تراجم کیے ہیں۔ ایسے انتخاب کی بھی خاص جلدیں جمع ہو چکی ہیں۔ فارسی، عربی اور اُردو والے انتخابات کا نام "ابکار الافکار" رکھا۔ اور انگریزی انتخاب کا "انگلش جیمس" ہے۔ ابھی تک فارغ اوقات میں انھیں دیکھتا ہوں۔ نثر سے زیادہ شعر کو پسند کرتا ہوں۔

تصنیف کا شوق:

کتابیں پڑھتے پڑھتے، کتابیں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ کچھ کتابیں اسکول کی تعلیم کے دوران اور کچھ کالج میں زیر تعلیم رہتے ہوئے لکھیں۔ کچھ کتابیں ملازمت سے قبل اور کچھ ملازمت کے دوران لکھیں مگر ریٹائرمنٹ کے بعد سے میں باقاعدہ کتابیں لکھ رہا ہوں اسی لیے میری تصنیف شدہ کتابوں کی تعداد اچھی خاصی ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری زبانوں کی ٹھیک ٹھاک ضخیم کتابوں کو سندھی میں ترجمہ کیا۔ عام طور پر معاوضہ لیے بغیر کتابیں شایع کرواتا ہوں۔ شایع شدہ کتابیں مجھ تک پہنچتی ہیں تو میں سندھ کی تقریباً ہر لائبریری کو ارسال کرتا ہوں۔ غریب شاگردوں کو مفت میں تقسیم کرتا ہوں۔ اسکولوں اور مدرسوں میں امتحانات لینے جاتا ہوں تو بطور انعام یہ کتب انھیں دیتا ہوں۔ بہت کم کتابیں کتب فروش کے پاس جاتی ہیں۔

میں نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔ جب بھی فراغت کا کوئی لمحہ، یا تھوڑا بہت ٹائم ملا تو خاموشی سے ایک طرف بیٹھنے، کھیلنے کودنے یا خوامخواہ باتیں بنانے کے بجائے کچھ لکھا یا پڑھا۔

سرکاری ملازمت کے دوران بھی فرائض کی بجا آوری کے بعد کا زیادہ تر وقت پڑھنے لکھنے یں صرف کرتا تھا۔ اکثر یہ کام رات کو کرتا تھا خصوصاً صبح کاذب کے وقت۔ ایک کتاب لکھنے میں خاصا وقت درکار ہوتا ہے۔ میری عادت ہے کہ جب بھی کوئی نئی کتاب لکھنے کا آغاز کرتا ہوں تب پہلے صفحہ کی پیشانی پر، ایک کونے پر باریک حروف سے "بسم اللہ" لکھنے کے بعد ہی کچھ اور لکھتا ہوں۔ اور کتاب مکمل کرتے ہی آخری صفحہ کی انتہا پر ایک کونے پر "الحمدللہ"

لکھتا ہوں اور دونوں مقامات پر تاریخ آغاز و تاریخ تکمیل ضرور لکھ دیتا ہوں۔ میرے ہاتھ سے لکھی گئی کتاب کی یہ مخصوص نشانی ہے۔ کتابیں لکھنے کا کام شہرت، نام ونمود یا روپے پیسے کی حصول کے لیے نہیں بلکہ تین خاص مقاصد کے لیے ہے۔ ایک تو یہ کہ فراغت کے لمحات کو ایک مفید و کارآمد مصروفیت میسر آتی ہے۔ وقت ضایع نہیں ہوتا اور انسان بے مقصد خیالات، گفتگو اور حرکتوں سے بچ جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ کتابیں لکھنے کے لیے، اچھی اور عمدہ کتابوں کو بار بار پڑھنے کا موقع ملتا ہے اس سے علمی سرمائے میں اضافہ ہوتا ہے، تیسرا یہ کہ اچھی کتابیں لکھنے سے عوام الناس کو فائدہ پہنچانے کا موقع ملتا ہے یہ بھی ایک طرح کی خیرات یا زکوۃ ہے۔ علمیت کے معیار کو ناپنے کا چوں کہ کوئی پیمانہ نہیں ہے لہٰذا یہ ضرور ہے کہ ہر لکھنے والے سے کم علمیت یا واقفیت رکھنے والے افراد ہوں گے جن کو فائدہ پہنچانا یا مدد کرنا فرض ہے گویا یہ علم کی زکوۃ اس طرح ہے۔ جس طرح دولت اور مال پر زکوۃ واجب ہے۔ میری نظر میں علمیت بھی ایک سچی دولت ہے۔ اور جو کتابیں میرے پاس موجود ہیں، میں انھیں ایک خزانہ سمجھتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ میرے بعد، میرے بیٹوں میں سے کوئی ان کی حفاظت کرے گا، نادر بیگ کو بھی پڑھنے لکھنے کے شوق میں مبتلا دیکھ کر خوشی ہوتی ہے، کتابوں کو اپنا ساتھی سمجھتا ہوں۔

نہ دوست بنا کوئی کتاب کے سوا
جو خامشی سے تم سے بولے
کسی حالت کو بھی پہنچو تم مگر یہ
نہ کبھی ناراض ہو، نہ ہونے دے

ایک کتاب لکھنے کا عمل مجھے تھکا دیتا ہے۔ اس لیے ہمیشہ تین کتابیں ساتھ لکھنا شروع کرتا ہوں۔ ایک کتاب پر صبح کو کام کرتا ہوں، دوسری پہ دوپہر میں اور تیسری کتاب رات کے پہر تحریر کرتا ہوں۔ ایک دو گھنٹے مسلسل لکھنے سے تھکن کا احساس ہوتا ہے۔ اب جبکہ مکمل طور پر گوشہ نشین ہوں، سارا وقت میرا اپنا ہے تب وقت کی اس ترتیب سے کام کرنے میں بڑی سہولت رہتی ہے۔ جس طرح پہلے وقت کی تقسیم کے تحت کام کرنے کا ذکر کیا، اسی طرح صبح

سویرے اٹھ کر عبادت، ذکر، فکر اور وظائف کے بعد کوئی کتاب لکھتا یا پڑھتا ہوں۔ دن طلوع ہونے پر ہوا خوری اور چہل قدمی کے لیے باہر نکلتا ہوں۔ آٹھ بجے کے قریب آ پس آ کر لکھنے بیٹھتا ہوں اور گیارہ بجے گھر جا کر، کھانے سے فارغ ہو کر کچھ آرام کرتا ہوں۔ تین بجے کے قریب نماز ادا کرنے کے بعد، پھر لکھنے بیٹھتا ہوں، پانچ بجے کے بعد باہر بیٹھ کر مطالعہ کرتا ہوں اور سورج غروب ہونے پر گھر جاتا ہوں۔ موسم گرما میں دن کا بڑا حصہ اپنے گاؤں والے باغ میں املتاس کے درخت پر بنائے گئے آشیانے میں گزارتا ہوں۔ کھانا بھی وہیں کھاتا ہوں۔ پھر شام کو لوٹ کے گھر آتا ہوں۔ اس صورت حال کے متعلق بھی مرا ایک شعر ہے۔

تصوف و شاعری سے دلچسپی:

صبح کی ہوا خوری کرتے ہوئے، بہت سے خیالات ذہن میں آتے ہیں اشعار کی آمد بھی ہوتی ہے۔ ایسی کیفیت پھر رات کو سونے سے قبل ہوتی ہے۔ بعض اوقات لوگوں کی فرمائش کے مطابق کوئی راگ یا شعر ترتیب دیتا ہوں۔ شاعری کے متعلق بھی میرا ایک شعر ہے جو کہ اسی حصے کے آخر میں شامل کروں گا۔ میرے اشعار اکثر علیحدہ علیحدہ مضامین کے متعلق ہیں۔ لیکن اسلام کے بارے میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے قرآن و حدیث اور فقہ کی بنیاد پر علیحدہ علیحدہ مضامین لکھے ہیں۔ حکمت اور فلسفے کے موضوعات پر اکثر تصوف کی بنیاد پر لکھا ہے۔ حالانکہ بڑے بڑے بزرگوں نے تصوف کے اصول بیان کیے ہیں اور شریعت پر بھی کاربند رہے ہیں مگر اس کے باوجود بھی شریعت کے پابند عام افراد نے ان پر اعتراضات اٹھائے ہیں۔ بلکہ کئی تو انھیں کافر، غیر شرعی حرکات کرنے والے یا غیر شرعی طور طریقے بتانے والے گردانتے ہیں۔ لہٰذا ایسی تہمت سے میں بھی آزاد نہیں۔ کئی مسلمانوں، سنی بلکہ شیعہ حضرات نے ان موضوعات پر کئی اعتراضات اٹھائے، جن کا میں نے مشکل سے جواب دیا۔ مگر میری ظاہری ہیئت (جو کہ شریعت کے عین مطابق ہے) نے مجھے بچایا ہے۔ اس لیے دوسرے بزرگوں کی مانند میری رائے بھی یہ ہے کہ شرعی اور دینی کاموں اور

رسموں کے متعلق آپ کی رائے اور خیال کچھ بھی ہو مگر وہ آپ صرف اپنی ذات پر لاگو کریں یہ باتیں خلق کو بتانے یا وعظ کرنے کی نہیں۔ ورنہ شیخ حلاج منصور کی سزا تو سب پہ آشکار ہے۔ زندگی شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے قول کے مطابق بسر کرنی چاہیے، وہی طرزِ عمل جو دیگر صوفیائے کرام کا بھی رہا ہے۔ بقول شاہ:

روزے اور نماز، یہ بھی اچھے کام
وہ کچھ منزل اور جس سے ریجھے رام

کیوں بازار حسن کی کرتے ہو سیر
وہ ہے تیرے ساتھ جس کا ڈھونڈے پیر

غیرت نہیں ہے، شرم تم کو نہیں آتی
وہ دیکھے تم کو، تم دیکھ رہے ہو غیر

ان اشعار کے مطابق، میرا اعتقاد بھی مذہبی احکامات کی روحانی، حقیقی اور باطنی مفہوم پر ہے مگر یہ میری ذات تک محدود ہے، اوروں کے لیے نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہب کے ظاہری رسوم و دستور کی تعمیل بھی کرتا ہوں مثلاً حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے سفرِ معراج کو روحانی کہتا ہوں جسمانی نہیں۔ اگرچہ اس طرح نہ ماننے والے کو کافر کہتے ہیں۔ اسی طرح انسان کے وجود میں حق کی موجودگی، انسان کے اللہ کا خلیفہ یا نائب ہونے یا موت کے بعد روح کا دنیا میں آنا، جیسا کہ تھیوسوفی والوں کا خیال ہے، یا جسے تناسخ بھی کہتے ہیں کے متعلق میرا اعتقاد کچھ ایسا ہی ہے۔ مفہوم کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو یہ اسلامی اصولوں اور شرعی احکام کے مطابق موافق، درست و روا ہو سکتا ہے۔ یہی اعتقاد اکثر صوفی اساتذہ کا رہا ہے جیسا کہ مولانا رومی کا، مولوی عبدالرحمان جامی کا، شیخ فرید الدین عطار کا اور اس کے علاوہ کئی اور اساتذہ کا۔ میرے اعتقاد کے متعلق میرے اشعار سے رائے

قائم کی جا سکتی ہے۔ (دیکھیے بارھواں باب) سچائی کے حقیقی مفہوم تک رسائی کے بعد ظاہری عبادات یعنی حج، زیارتیں، تسبیح پڑھنے، جنگلوں میں ریاضتیں کرنے یا چلے کاٹنے کو غیر ضروری سمجھتا ہوں۔

جب حج کا میں کرتا ہوں ارادہ
میرے پاس چلا آتا ہے کعبہ سدا
چلی آئے گی جنت بھی یوں ہی میرے پاس
کہ 'اُزلِفتِ الجنۃ'، فرماتا ہے خدا

لیکن اگر یہ ظاہری عبادت بھی کی جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔ اسی طرح پردے کے متعلق بھی میری رائے معتدل ہے کہ حد سے زیادہ پردہ نہیں ہونا چاہیے جیسا کہ یہاں کے اکثر شریف مسلمان گھرانوں میں رواج ہے۔ حد کے اندر پردہ اچھا بلکہ ضروری خیال کرتا ہوں۔ جیسا کہ اپنی کتاب "زینت" میں پردے بارے میں لکھا یا پھر ایک اور رسالے میں۔ انھی خیالات پر خود بھی عمل کرتا ہوں۔

گر ہو آہن کی بھی دیوار حرم سرا
عصمت نہ جانے عورت تو، پردہ پھر کیسا!

اسی طرح سود کو حرام سمجھتا ہوں لیکن صرف مسلمانوں کے درمیان۔ لیکن غیر اسلامی بادشاہت میں یا دیگر مذاہب کے ماننے والوں سے مروج سود لینے کو جائز سمجھتا ہوں۔ سود بھی چوں کہ لاچار دیا جاتا ہے۔ لہٰذا رشوت کی طرح اس کا لینا اور دینا بھی حرام ہے۔ اس موضوع پر میری ایک مختصر کتاب ہے، جس میں قرآن و حدیث کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ اسلامی حکم کے مطابق چوری کی سزا کے طور پر ہاتھ کاٹنے اور دیگر جرائم کے لیے کوڑے وغیرہ کی سزائیں ہیں، جو آج کل کے زمانے میں نہ صرف غیر مسلم حکومتوں بلکہ اسلامی ریاستوں میں بھی مروج نہیں اسی طرح سود کے مسئلے یا کئی اور پیچیدہ مسائل کو بھی حل کرنے کی ضرورت ہے۔

سیاسی رائے:

حالانکہ میں سیاسی باتوں یا سیاست سے تعلق نہیں رکھتا اور نہ ہی کسی سیاسی تحریک کا حصہ ہوں، اس کے باوجود بھی میں سیاست کے بارے میں اپنی رائے رکھتا ہوں۔ ہمیشہ اس رائے پر عمل پیرا رہا ہوں اور اسے اسلامی و دینی احکام کے موافق سمجھتا ہوں اس موضوع پر میں کئی ایک پرچے لکھ چکا ہوں جو کہ پبلسٹی کمیٹی نے شائع بھی کروائے ہیں وہ رائے یہ ہے:

میں نے کہیں لکھا ہے کہ بحیثیت رعایا اور بحیثیت مسلمان، ہمارا دینی فرض ہے کہ غیر مسلمان بادشاہ یا حاکموں کے خلاف فساد برپا نہ کریں، نہ بغاوت کی کوشش کریں نہ اس سے قطع تعلقات کریں اور نہ ہی اس کے احکام کی خلاف ورزی کریں۔ بالخصوص ایسی صورت میں جب ان کی حکومت میں ہمیں ہر طرح کی مذہبی آزادی ہو اور کوئی غیر ضروری بندش یا پابندی بھی نہ ہو۔ اگر کسی مسلمان کو یہ حکومت یا طرزِ عمل پسند نہ آئے تو کسی اور ملک میں رہائش اختیار کرے اور وہاں بے شک کوئی بھی طرزِ عمل اپنائے۔ خلافت کے متعلق میرے رائے وہی ہے جو اہل تشیع کی ہے یعنی بنو امیہ اور بنو عباس کے بعد ان کے جانشین کو حضرت محمد ﷺ کا خلیفہ یا جانشین شمار نہیں کرتا بلکہ عارضی شمار کرتا ہوں۔ خصوصاً جب ان مناصب پر مروان اور یزید جیسے حاکم ہو گزرے ہیں، جن کے فاسق و فاجر ہونے میں خود سنیوں کو بھی شک نہیں۔ ایسے حاکموں کو شیعہ پیغمبر کا خلیفہ کہنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ ان کے اصولوں کے مطابق پنجتن اور ان کی اولاد، بارہ امام نبی ﷺ کے پشت در پشت وصی، جانشین اور خلیفہ ہیں اور آج تک حضرت امام محمد مہدی کو حاضر امام سمجھتے ہیں اور اس مفہوم کے ساتھ سچے خلیفہ یا امام کی غیر موجودگی میں غزوہ یا دینی جنگ کو ناجائز سمجھتے ہیں جبکہ سنی اسے جائز کہتے ہیں۔

سیاسی باتوں کا ذکر کرتے ہوئے میں "سوراج" یا "ہوم رول" کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہتا ہوں، جس کا اعادہ بارہا کر چکا ہوں۔ مختصراً یہ کہ "جمہوریت ایک اچھی طرزِ حکومت ہے۔"

یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے آپ اپنے گھر یا خاندان کو انصاف سے چلا پائیں، پھر اپنے شہر یا ضلع کی حکومت چلا سکیں یعنی میونسپلٹی یا لوکل بورڈ، پھر پورے ملک پر حکومت کرنے کے بارے میں سوچیں۔ یہ خیال درجہ بدرجہ کامیابی و کامرانی حاصل کرنے کے بعد آنا چاہیے یہی ترقی کا ذریعہ ہے۔ اس صورت حال کے ادراک کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں یا دیگر موجودہ اقوام کا اتحاد ضروری ہے، جب قومی، ملکی، مذہبی اور پنچایتی اتحاد اور اتفاق پیدا ہوگا تب ہی ہندوستان کے لوگوں کو Nation یا قوم کہا جاسکے گا، اس سے قبل نہیں۔ باقی رہی بات ایک دوسرے کی مدد کی تو ہم ملک و ہم مذہب ہونے کے ناتے بے شک ہمیں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیے۔ ایک دوسرے سے تعاون کرنا ضروری ہے۔ ''سودیشی'' یعنی اس خطے کے ہنر مندوں اور کاریگروں کے بنائے ہوئے مال کو خریدنا اور ان کی حوصلہ افزائی ہمارا فرض ہے۔ مذہبی یا قومی تعلیم کو فروغ دینا ہمارا فرض ہے۔ منشیات، جوا، بدکاری یا زنا کو بند کروانے کی کوشش کرنا ہم پر فرض ہے۔ مگر مشوروں، نصیحتوں یا وعظ کے ذریعے یا ایسے ذرائع سے، جن سے کسی کی دل آزاری نہ ہو، نہ کہ لاقانونیت، مارنے پیٹنے اور زور زبردستی سے۔ سودیشی مال کو عام کرنے کے لیے، غیر ملکی کپڑوں کے انبار جمع کر کے آگ لگانا، یا قومی تعلیم کے فروغ کے لیے رواں تعلیمی ادارے بند کرنا، یا بچوں سے تعلیم چھڑوانا اور بزرگوں کی نافرمانی کر کے گھر سے نکل جانا، نامناسب جگہوں پر مٹرگشت کرنا میری نظر میں بالکل نامناسب، اسراف یا ظلم اور گناہ ہے۔ کئی سیاسی یا قومی باتوں کے متعلق میری شاعری گیارہویں باب میں پڑھئے گا۔

اپنی موجودہ زندگی کے متعلق میری رائے:

آخر میں، میں اپنی موجودہ صورت حال آپ کو بتانا چاہوں گا۔ یہ میری، میرے اپنے متعلق رائے ہوگی۔ اگرچہ اللہ کی مہربانی سے، ہر طرح سے آزاد ہوں۔ تندرستی جیسی نعمت میسر ہے اور اپنی پسندیدہ مصروفیات میں مشغول ہوں، اس کے باوجود خود کو تنہا محسوس کرتا ہوں اور اکثر اداس رہتا ہوں۔ کیونکہ بیوی بچوں کے سوا کوئی ہم عصر، ہم خیال ساتھی یا دوست

نہیں۔ آج کل کے لوگوں اور دوستوں کے خیالات بہت مختلف ہیں۔ اور وہ میرے خیالات سن کر وہ یقیناً مجھے ایک دقیانوسی وضع کا بوڑھا آدمی گردانتے ہوں گے۔ جو اہل صحبت تھے، سب رخصت ہوئے۔ شاہ سائیں نے فرمایا ہے!

مرگئے سارے مور، نہ ایک بھی ہنس رہا
سارا دیس ہوا، نذر جھوٹے زاغوں کے

ایسی ہی ایک شکایت میں نے بھی اپنے شعر کے ذریعے کی ہے۔

افسوس وہ گئے یار جو رکھتے تھے تیز
لگتی تھی جن کی صحبت راحت آفیز
کہاں جا کر بیچوں دل یوسف کو میں
کہ بازار مصر سے چلے گئے سب عزیز

گھڑی بھر کے لیے عالم میں نہ کوئی میرا ہمدم
نہیں ہے بے کسی کے سوا اور کوئی غم
دکھ کس کو سناؤں اپنا، اپنے دل کے سوا
کہ نہیں کوئی میرا، اپنے دل کے سوا محرم

جب لکھنے پڑھنے سے تھکاوٹ ہوتی ہے، تب بیوی کا ساتھ اچھا لگتا ہے۔ مگر وہ بیچاری بھی بیری اور میرے بچوں کی خدمت میں بے حد مصروف رہتی ہے۔ حالانکہ مجھے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے اس کے باوجود بھی جس قدر، اور جس نوعیت کی صحبت مجھے درکار ہے، وہ میرے پاس نہیں۔ بچوں میں سے بھی، بڑا بیٹا عام طور پر کراچی میں ہوتا ہے۔ باقی بچے ابھی چھوٹے ہیں دوستوں میں سے بھی میرا ہم خیال صرف دیوان دیارام گدومل ہے جو ایک طرح سے دنیا یعنی اپنا وطن ترک کر کے بمبئی جابسا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو خط لکھ کر دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ دوسرا ایسا قریبی

دوست سیٹھ غلام علی چھاگلا ہے جس کا ساتھ مجھے پسند ہے مگر وہ بھی کراچی میں رہتا ہے۔ لہٰذا جب کراچی جاتا ہوں تب ہی ملاقات ہوتی ہے۔ کبھی کبھار حیدرآباد سے، یا کچھ اور علاقوں سے بھی کچھ افراد کام کاج یا ملنے کی غرض سے آتے ہیں یا کبھی کوئی دعوت وغیرہ کا انعقاد کرتے ہیں تو بخوشی وہاں جاتا ہے کہ وہاں پرانے دوست مل جاتے ہیں اور باہم گفتگو کا موقع ملتا ہے۔ میں خود کسی کے گھر جانا خود پسند نہیں کرتا مگر جب گورنر یا کمشنر صاحبان حیدرآباد تشریف لاتے ہیں تب ان سے ملاقات کے لیے جانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ سال میں ایک بار کلکٹر صاحب سے لازماً ملتا ہوں اور اسے ریٹائرمنٹ کے بعد فرائض کا حصہ سمجھتا ہوں۔

یہ ہے وہ ساری صورت حال، جس کی بناء پر میں خود کو تنہا سمجھ کر اداس رہتا ہوں۔ اپنے اکیلے پن کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی زبانوں کے زوال پر بھی غمزدہ رہتا ہوں۔ نانا مرحوم اور والد صاحب کے ساتھ گزارے لمحات یاد کر کے روتا ہوں کہ غیروں کو تو چھوڑیے خود میرے اپنے عزیز اور اولادوں میں سے بھی کوئی فارسی زبان پر عبور نہیں رکھتا۔ نہ جانے میری ایسی عمدہ فارسی کتب کا کیا حال ہوگا؟

کثیر الاولاد ہونے کے باعث فکر اور تشویش بھی زیادہ لاحق ہے۔ خود بیٹھ کر انھیں پڑھاؤں اتنی طاقت ذہن میں نہیں ہے بلکہ ان کے شور شرابے اور شرارتوں کے باعث طبیعت مکدر رہتی ہے۔ مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہوگیا ہے جو پہلے نہیں تھا۔ یادداشت بھی دن بدن کمزور ہوتی جارہی ہے، خصوصاً ناموں کے معاملے میں اور صورت حال یہ ہے کہ بعض اوقات تو اپنے بیٹوں کے نام بھی یاد نہیں رہتے۔ بڑی مشکل سے نام ذہن میں آتے ہیں۔ اس لیے الجھن زیادہ محسوس کرتا ہوں۔ مثبت پہلو یہ نظر آتا ہے کہ جو کتابیں پڑھ کر بھول چکا ہوں، انھیں از سرِ نو پڑھنے میں لطف محسوس کرتا ہوں۔

ہوئی یاد داشت کمزور، بڑھی لذت زیادہ
بھولوں اور دہراؤں، لفظ لفظ موتی سے

ان باتوں کی وجہ سے اب دنیا سے بے زاری ہوگئی ہے اور مزید کچھ دیکھنے کا جی نہیں چاہتا۔ موت کو تو ہمیشہ سے یاد کرتا رہا ہوں مگر اب موت کو حیات سمجھتا ہوں۔ اس لمبی عمر سے تنگ آ چکا ہوں اور اسے بے وجہ سمجھتا ہوں۔

زندگی در گرد نم افتاد باید زیستن
شاید باید زیستن، ناشاد باید زیستن

جب دنیا تعفن زدہ ہے اور اس میں دل کی خواہش کے مطابق صحبتیں اور اسباب میسر نہیں، تب طویل عمری کا کیا فائدہ؟

مردوں پہ منڈلاتے کیا حاصل ہو گدھ کو
آدمی کیا پائے سرور، گر لمبی ہو زندگی

مگر شاید اللہ کی رضا یہ ہے کہ میں لمبی عمر پاؤں تاکہ میری پینشن سے میرے بچوں کو فائدہ ہو یا لکھنے پڑھنے کا جو کام کرتا ہوں، اس سے خلق خدا کو فیض حاصل ہوتا ہو۔ میرے زیادہ تر دوست میری لمبی زندگی کی دعائیں مانگتے ہیں شاید اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کر لی ہے۔ اگرچہ بڑھاپا اور کمزوری اسباب تکلیف ہیں اس کے باوجود میں خوش رہنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں ضعیفی کی کیفیت کے بارے میں دونوں قسم کے خیالات یعنی تعریف و شکایت اشعار میں رقم کی ہیں۔ ذرا پڑھیے۔

ہے بڑھاپا آیا، زندگانی گذر گئی
قوت تھی جو جسم میں، وہ تو جانی گزر گئی
تیار ہو جا موت کے لیے اب تو قلیچ
موت ہی ہے زندگی، جب جوانی گزر گئی

محتاجی عجب، بڑی فقیری پیری
بے شک ہے بڑھاپے میں صغیری پیری

نانا سے جو پوچھا، بُری پیری یا موت
چلا اٹھا بالا، پیری، پیری

آیا بڑھاپا، اعضاء سب چور ہوئے
جو یار جوانی کے تھے، سب دور ہوئے
رہتی ہے یاد ہر وقت لحد کی
مشکی جو تھے بال، کافور ہوئے

اور اب اس کے جواب میں بڑھاپے کی تعریف ملاحظہ کریں۔

شاہی تھی جوانی اور فقیری بڑھاپا
آزادی ہے جوانی اور اسیری بڑھاپا
شغل میرا شعر لکھنا، خلوت موجو
میرے لیے سچ کہوں، امیری بڑھاپا

آیا بڑھاپا، فکر سب دور ہوئی
ملی تنہائی، پریشانی سب دور ہوئی
ہوا شغل فراغت وبلاغت کا عجیب
دل اپنا بھی خوش، دنیا بھی مسرور ہوئی

گو دل کو بہلانے کے لیے بڑھاپے کو جوانی پر ترجیح دیتا ہوں مگر پھر بھی حقیقت یا سچ بیان کرنے سے باز نہیں آسکتا۔

جو رہے جوان، ان کو نہ بھائے بڑھاپا
اب تو میرے لیے ہے باعث عذاب بڑھاپا
نہ بچے کرے پیدا گر بوڑھی ہو عورت
جنم دیتا ہے ہزار عیبوں کو بڑھاپا

اگرچہ خوش حال ہوں، وقت عزت سے گزر رہا ہے مگر مندرجہ بالا باتوں کی وجہ سے غم مزاج کا حصہ بن گیا ہے۔ حال اور مستقبل کی فکر لاحق رہتی ہے۔ گو ہمیشہ عام لوگوں کی بھلائی مدِ نظر رہی ہے، پاکیزہ خیالات اور نیک کام کرنے کی عادت رہی ہے، اس کے باوجود بے شمار گناہ، قصور اور عیب یاد آتے ہیں اور خوفزدہ ہوتا ہوں۔ مگر حکم قرآن کے مطابق "لاتقنطوا من رحمته اللّٰہ" پر بھروسہ کرکے، اللہ تعالیٰ سے بخشش کی امید رکھتا ہوں۔ توبہ اور پشیمانی سوچ کا مستقل حصہ بن چکی ہیں اور امید کرتا ہوں کہ وہ غفور الرحیم مجھے معاف فرمائے گا اور میرے سوگواران کو اپنی امان میں رکھے گا۔

ریت کے ذروں سے زیادہ رہے میرے گناہ
گردن جھکی شرم سے، خوف دل میں اٹھا
آوز یہ آئی غیب سے، غم نہ کر قلیچ
اچھے تھے عمل تیرے، ہم بھی دیتے ہیں شفا

میری زندگی اور خیالات کے متعلق میرے اشعار کی گواہی

انتخاب:

گذشتہ ابواب میں، میں نے اپنی ذات، عادات اور آراء وغیرہ کے متعلق جو کچھ درج کیا ہے، اس میں اپنے اشعار کا حوالہ بھی دیا ہے جو بیان کی گئی تفصیلات کے مطابق اس باب میں شامل کروں گا۔ مختلف ابواب میں، شعر کا محض حوالہ دینے اور اشعار درج نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ میری شاعری کا انتخاب ایک ہی باب میں شامل ہوتا کہ پڑھنے والوں کو میرے اشعار کے انتخاب کا مطالعہ کرنے کا اچھا موقع ملے۔

غزل

غزل "زیب النساء" خواہر من، بجواب غزل زیب النساء تخلص "مخفی"، دختر اورنگزیب کہ بیت آخرینش این است۔

غزل

در رہ مہر و محبت گرفشانم جان رواست،
اضطراب بیدلان را صحبت جانان دواست۔
راست میگوئی کہ در دل سر بصحرا میزنی،
آری آری میزنی لیکن حیا زنجیر پاست۔

در تعجب ماندہ ام کاندر محبت کاملی،
چیست پروانہ نمرت خود شمع در مہرت فداست۔
گر شدت شاگرد بلبل چشم بلبل☆ از سن ست۔
گل بصنعت میکشم برتر ازیں حکمت کجاست۔
گرشوی لیلیٰ اساس و ارشوی مجنون صفت،
زینت تو مخفی آمد زینتم شمس الضحیٰ ست۔
جان من گرو خر شاہی برآن ہرگز مناز،
والدم فر فریدون داشت خسرو جلد ماست۔
گر تو بعد از رنج و راحت روبفقر آوردۂ،
بین کہ مارا از ازل فقر ابدہ دادہ خداست۔
گر توئی ''زیب النساء'' فخر و تکبر ہم مکن،
من خودم ''زیب النساء'' و خواہرم شرف النساست۔

داڑھی کے متعلق خیالات

الا یا ایھا الساقی بجامم دہ حمایت ہا،
کہ عشق آسان نمود اول ولی افتاد غایت ہا۔
چو اول می تراشیدم بدست خویش ریشم را،
ندانستم کہ آید برسرم چندین شکایت ہا۔
کسی میگفت گبرم، کس یہودی خواند و نصرانی،
از نیسان می شنیدم آہ از ہرسو حکایت ہا۔

☆ یہاں چشم بلبل سے مراد، دستکاری کی ایک قسم ہے۔

کنون بگذاشتم تا یکزمان دور و دراز افتد،
دهد چون ریش قاضی ہر کجا تفسیر آیت ہا۔
بباید با صفائی دل صفائی صورت آدم را،
نداند کس مگر صوفی ازین راز و کنایت ہا۔
"قلیچ" ایام بی ریشی فراموشم نمی گردد،
کہ میکردند خوبان☆ بر دلِ ریشم عنایت ہا۔

پہلی ملازمت تعلقہ کنگڑ میں

مرا کوائف کنگر چو یاد می آید،
دلم چو خندۂ گل شاد شاد می آید۔
عنان کشید مرا تا بہ آن طرف قسمت،
کزان ہنوز نسیم مراد می آید۔
بصحبت نفری چند معتقد بودم،
بلی بہ اہل وفا اعتقاد می آید۔
کنون کہ دور فتادم ز حضرتِ احباب،
نشان مہرو محبت بہ یاد می آید۔
میان بیشہ و صحرا چہ خوب تر شہریست،
درون شہر چہ خوش آب و باد می آید۔
اگرچہ بانگ سگ و بوم و ہای و ہوی شغال،
زشام تا بگہ بامداد می آید۔

☆ خوبان: یورو پین لڑکیاں۔

برائی گوشہ نشینان و اہل صلح و صفا،
بہ از بلاد جم و کیقباد می آید۔
ز عام و خاص بگوشم رسید کاین شہریست،
کز آن بدر ہم فسق و فساد می آید۔
شنیدہ ام کہ ہمین ست ملک مہا،
ہر آنکہ رفت دلم پاک زاد می آید۔
صبا اگر گزرے اوفتد بدان سویت،
بگو مدام زمن خیرباد می آید۔
چو اتفاق فتدبار دیگرش بینم،
کنون قصیدۂ رنگین سواد می آید۔
"قلیچ" چونکہ شدی صاف دل محبت کیش،
ز حرف حرف تو بوئے و دادی آید

میری پیدائش پر لکھی تاریخیں

من چو زادم والدِ مرحوم من شد خوش یقین،
شکر گفت الحمدھم للہ رب العلمین۔
فال نیک از من گرفت و طالعم ہم دید سعد،
آن محرم ماہ بہ تاریخ بودہ چارمین،
بہر تاریخ ولادت نیک منظر مادہ یافت،
۱۲۷۰ھ
باز یافت برخنگ ہم یا ارحم الراحمین۔
۱۲۷۰ھ

جد ما جدم ز شوقِ دل مرا خواندہ ''قلیچ''،
چونکہ در تاریخِ ہند آندم ہمیخواند عہد این۔
تاجدارِ دکن او بودہ نظامش شد لقب،
خسرو دوران ''قلیچ'' آنجا نوشتہ بد چنین۔

۱۲۷۰ھ

لفظ ہا تاریخ ہندو تاج خسرو یافت سال،

۱۲۷۰ھ

ہم دران صفحہ تعجب بر تعجب شد قرین۔
مادۂ تاریخ گفت از خود بہارِ باغِ ہند،

۱۲۷۰ھ

ہم ز مصحف یافتہ و العاقبۃ للمتقین۔

۱۲۷۰ھ

ہر دو بہرِ من دعائی خیر از حق خواستند،
از عزیزان ہرکہ حاضر بودہ گفتہ آمین۔
بعد ازان ہم چون شنیدی ہر کسی نامِ ''قلیچ''،
گفتی او یادش بخیر از بہرِ سالِ اولین۔

۱۲۷۰ھ

میری وفات کی تاریخیں

بیچارہ ''قلیچ'' رفت آخر ز جہان،
دائم بدہ رب و موت را یاد کنان۔

غفرانک ربنا چو وردش بوده،
تاریخ وفات خویش گفته غفران
۱۳۳۱ھ

قطعہ

اندرین دنیائی فانی چون "قلیچ"،
اسپ عمر خود باین منزل رسانید۔
شوق سیر عالم باقی شدش،
ارجعی از دل الی ربک بخواند۔
سال تاریخ وفات خویش گفت،
این قدح بشکست این ساقی نماند۔
۱۳۳۲ھ

قطعہ

"قلیچ" آنکه او در جهان زیست شاد،
بفضل خدا دیده او هر مراد۔
چو عمرش شده شصت خواندش اجل،
جوابش همان لحظه لبیک داد۔
نموده دمی فکر تاریخ خویش،
بدل خود بخود گفت مغفور باد
۱۳۳۳ھ

رباعی

می زیست ''قلیچ'' در جہاں چون مزدور،
چون مُرد بفضل حق شدہ او ماجور۔
چون سال وفات خود ز ہاتف پرسید،
بشنید ند از غیب بادا مغفور۔
۱۳۳۴ھ

رباعی

می زیست ''قلیچ'' در جہان چون مزدور،
چون مُرد بفضل حق شدہ او ماجور،
چون سال وفات خود ز ہاتف پرسید،
گفت از سر الطاف ....

رباعی

می زیست ''قلیچ'' در جہان چون مزدور،
چون مرد بفضل حق شدہ او ماجور،
چون سال وفات خود ز ہاتف پرسید،
گفتا بسر بدیہہ بادا مغفور۔
ب ۱۳۳۶ھ

قطعه

"قلیچ" آنکه او در جهان زیست شاد
بفضل خدا دیده او هر مراد
بخواندش اجل چوں شده شصت وسه
جوابش همان لحظه لبیک داد
زهاتف پے سید تاریخ گفت
بگو با سر دل که مغفور باد

۱۳۳۷ھ

دیگر

بشنو ای دوست بعد شصت وسه سال،
دور عمر "قلیچ" گشت تمام۔
نور حق تافت بر سر روحش،
آفتابش رسید برلب بام۔
چون بشر زاد و چون فرشته پرید،
شد ز آغاز بهترش انجام۔
در تجلی مطلع انوار،
یافت تاریخ خود فروغ دوام۔

۱۳۳۷ھ

قطعه

چون گزر کرد سال شصت و چهار،
دور عمر "قلیچ" گشت تمام،
نور حق تافت بر بر روحش،
آفتابش رسید برلب جام،
چون بشر زاد و چون فرشته پرید،
شد ز آغاز بهترش انجام،
با تجلی مطلع انوار،
یافت تاریخ خود فروغ دوام۔

۱۳۳۸ھ

قطعه

در جهان بد "قلیچ" چون درویش،
با نمد ساخت و باکلاه و دلق،
صلح کل داشت با ہم تا زیست،
دید چون جان خود رسیده بحلق،
خواست سال وفات خود از غیب،
ناگہ آمد ندا کہ راحت خلق۔

۱۳۳۹ھ

دیگر

شصت و ہم پنج سال زیست "قلیچ"،
ہمچو طفلان درین جہان خراب۔
آہ عمرش گذشت در غفلت،
شدہ بیدار چون ببردش خواب۔
فکر سال وفات خویش چو کرد،
آمد از غیب ہشت خلد جواب۔

۱۳۳۹ھ

قطعہ

امسال "قلیچ" مردہ آخر،
یاران نخورید ہیچ حسرت۔
میکرد مدام موت را یاد،
زان داشت گہی نہ خوف و نفرت۔
دنیا با آنکہ بودہ زندان،
بہرش شدہ جایگاہ فرحت۔
زندہ ست ہنوز او نہ مردہ،
زین راز بماندہ خود بحیرت۔
بافضل خداش نار شد نور،
آتشکدہ گشت رشک جنت۔
از سال وفات خود چو پرسید،
ہاتف گفتا خلیل سیرت۔

۱۳۴۰ھ

رباعی

ہفتاد چو شد "قلیچ" در دیر جہان،
تاریخ وفات خویش را شد خواہان۔
ہاتف بجواب گفت خوش کرداری،
۱۳۴۱ھ
ہم داد بہ او نوید حور و غلمان
۱۳۴۱ھ

رباعی

برفت از جہان بعد عمری "قلیچ"،
کہ آخر بلکن کمال زوال۔
گنہگار بد لیک تائب شدہ،
ازان گشتش امید بخشش کمال۔
اجل دید از دور و در فکر شد،
کہ تاریخ خود خود بگوید بحال۔
بگفتا دلش انی تُبتُ الیک،
وانی من المسلمین ست سال۔
۱۳۴۲ھ

رباعی

بگذشت قلیچ ازین جہان غل و غش،
صد شکر کہ دل صاف بدش جانش خوش،
عمرش شدہ ہفتاد و سہ سالِ قمری،
جمعیت خاطری شدہ تارعش۔

۱۳۴۴

ہاتف بہ قلیچ گفت در نزع بجواب،
گو سال وفات ....
گفتا شدہ محنت و مشقت ہر دو،
شد ختم بفر مود سروشش بجواب۔

۱۳۴۴ھ

بل باد خجستہ و مبارک گویم،

۱۳۴۴ھ

تاریخ دگر ز فضل رب الارباب۔

مرحوم بھائیوں کی یاد میں کافی (بھیروی)

جگ جگ تم جیو رے جوگی،
کیا نبھائی تم نے یاری
کیا کیا گبرو چھوڑ چلے، رشتے ناتے توڑ چلے
خاک میں خود کو ڈبو چلے، پوشاک حجاب تم نے اتاری
کیا نبھائی تم نے یاری

سفر کو چلے سارے سوامی، سوانگ مٹا کے بنے بے نامی
دیسی بنے پردیس مقامی، ختم کی سب کار گزاری
کیا نبھائی تم نے یاری
خبر نہ کوئی ملتی ان کی، باتیں مخفی ہیں سب جن کی
جاؤں بات بجن کی، درد کی راہ نیاری
کیا نبھائی تم نے یاری
کیا دولت تھے سوامی سیانے، اجڑ گئے ہیں سب ٹھکانے
مارے محبت مولا جانے، دل پہ چلے ہے آری
کیا نبھائی تم نے یاری
لطیفؔ تو جن کا رستہ دیکھے، جن کے کارن نیر ہیں بہتے
وہ تو اب نہیں یہاں رہتے، قاف پہ پہنچی ان کی سواری
کیا نبھائی تم نے یاری

جبل پب میں آمدِ شاعری

ہوکر لاہوتی لال، سارے سفر سجائے
من میں جوش جگا گئے جوگی، بھولے خوب خیال
دل میں دیپ جلائے
جنگل کو آباد کیا ہے، چھوڑ کے شہر فی الحال
کوہ کے کشٹ اٹھائے
ہستی سے جب پستی پائی، خود کو کیا پامال
عشق کے ناز اٹھائے

پاؤں زخمی کوہ سے کر کے، حال ہوئے بے حال
آ کر عشق ہی اٹھائے
ہاتھوں، پاؤں، کہنیوں پر، وہی چلے ہم چال
تب وہ قریب پائے
کاٹ کے کشالے، قاف جا پہنچے، آئے مشکل ٹال
رب نے یار ملائے
جان گنوا کر، لاہوت جا پہنچے جس کو ترسے سال
مولا نے محبوب ملائے
جنت تو ہے لامکانی، آب بہے تا پاتال
طوبیٰ کے جہاں سائے
بندہ، گندہ، مور، مجاور، واہ واہ شاہ بلال
صحرا میں شہر بسائے
زور قلیچ ہے قسمت تری، تیرے سب سوال
پرور نے پہنچائے

میرے وقت کا بٹوارہ

میں نے اپنا وقت یوں بانٹا، بچپن سے ہے اک ہی رستہ
جو چوبیس گھنٹے ہیں دن میں، بانٹ کے چار حصے کیے ہیں
اک حصہ میں زیرِ زمین ہوں، دوسرا زمین پہ مکیں ہوں
تیسرے حصے میں عرش بریں پر، چوتھے حصے میں عرش زریں پر

اوّل موت کی مانند گزرے، نیند و غفلت کھیل میں گزرے
وقت تو گویا ضائع ہے وہ، بندہ جیسے مر ہی گیا وہ
موت کا خوف جو رہے شامل، اس حصے میں جو ہو داخل
ہے عالم یہ بھی نفسانی، اسفلی، دوزخی یا شیطانی
عالمِ خواب کہتے ہیں اس کو، موت کی چھوٹی بہن ہے نیند تو
بندے کے لیے ہے نیند ضروری، نیند بشر کی ہے مجبوری
وہ شاہؔ کو سوتے اچھے لگے ہیں، نیند عبادت ان کی ہے اصل
دوسرا حصہ جو زمین پہ کاٹوں، جہاں کے اس میں کام کروں
دنیا کے اس میں کروں کام کاج، جن کے اصول بنائے سماج
کہتے ہیں اس کو عالمِ انسانی، شرعی، ناسوتی اور حیوانی
پہلا نیند اور یہ عالمِ بیداری، مجاز کے جس میں کام ہیں جاری
باطنی علم و حدیث کہتے ہیں، لوگ دنیا کے نیند میں سارے
جب مرتے ہیں تب اٹھتے ہیں، اسلئے نام سوتے جاگتے کے
دنیا کو کہیں عالمِ خواب، نیند تو خواب میں گویا خواب
تیسرا حصہ آسمان پہ گزاروں، اس میں بیٹھ کے میں شاعری کروں
فکر میں خود کو اڑتا پاؤں، جسم یہاں اور دل وہاں پاؤں
جیسے عالم ہوں یہ مثالی، وجۂ طریقت بنا خیالی
علم ہے جس میں جبروتی ملتا، جو ہے سب کا پالنے والا
رہتا ہوں خوش خیالی میں غرقاب، لکھتا ہوں نظم و نثر کی کتاب
ہے یہ اولاد میری روحانی، بچیاں، بچے جنے جسمانی
چوتھا حصہ ہے سب سے افضل، عرش پہ روح کی ہے منزل
وہ وقت عبادت کا ہے یار، صدق سے دل میں آئے ستار

محوِ حق ہونے کا ہے یہ زمان، لِی مَعَ اللّٰہ کا ہے یہ نشان
سیرِ ملکوت کا وقت بھی وہ، سیرِ لاہوت کا وقت بھی وہ
عالم ہے یہ حقیقی اور روحانی اور یہی ہے روحانی اور عرفانی
اس طرح میں جیتا مرتا ہوں، بقا فنا دونوں دیکھتا ہوں
ہر حصے میں چھ گھنٹے یار، ہوں نہ ضائع رہوں ہوشیار
موت کا حصہ کروں میں چوری، نیند اور غفلت کروں تھوڑی
ایسے ہی کچھ وقت بچالوں، جس کو نئے حصے میں لگالوں
فرض ادا ہیں کرنے سارے، اپنے رب اور خلق کے پیارے
باری باری ہر حق کر پورا، ایک کی خاطر چھوڑ نہ دوجا

میرا مذہب

کتنے لوگ ہیں پوچھتے مجھ سے، تیرا کیا مذہب
تو سنی ہے یا شیعہ ہے یا صوفی لامذہب
تو مومن ہے، یا مسلمان ہے یا ہے تو کافر
تو تو مذاہب پر کتابیں لکھتا رہتا ہے اکثر
لکھے ہیں تو نے دینِ اسلام، قرآن اور حدیث
پاک لکھے ہیں تو نے مضامین اور کئی ہیں خبیث
انجیل لکھی، توریت لکھی اور لکھی تھیا سوفی
فلسفہ اور ہندو مذہب، بہائی اور دہری
شیعوں کی بھی کتاب لکھی اور سنیوں کے لیے بھی لکھی تو نے
کفر و دین کو یکجا کر کے مذہب نئے بنائے تو نے

سب سے ایک سا تو چلے ہے، سب سے ہے کرتا پیار
ایک طرف نہ جائے تو، نہ بھولے کوئی طرف یار
سچ کہے تو ظاہر و باطن میں ہے تو یکساں
یا تو ظاہر ایک ہے اور باطن میں ہے دوجا
میں آرام سے ان کو دیتا ہوں یہ جواب
علیکم سلام و الاکرام، اے دوست و احباب
جیسے تم ہو، ویسا میں بھی ہوں بنی آدم
جیسے لوگ بھائی بھائی سارے ہیں باہم
اکائی، دہری اور عیسائی میں، یہودی بھی
بہت سے فرقے ہیں اسلامی اور ہندوی بھی
گر یہ سچ ہے ایک ہی ماں باپ کی ہیں یہ اولاد
فرض ہے ان پہ بھائی چارہ، حق کا ہے یہ ارشاد
اس کے بعد ہی میں ہوں مسلمان یارو
رب کی ذات کو مانوں اور مانوں نبیوں کو یارو
اس کے ساتھ رکھوں میں سب سے محبت اور محبت
اللہ کے بندے ہیں، ہیں سب نبیوں کی امت
اس کے بعد ہے اُمت خاص محمدﷺ کی
بھائی بھائی آپس میں ہیں شیعہ اور سنی
اس لیے ہے سارا عالم ایک ہی کنبے سا
فرد کنبے کا ہوکر بیر سمجھوں عظیم گناہ
سب سے محبت رکھتا ہوں میں درجہ بدرجہ
کچھ ہیں دور، قریب ہیں کچھ، کوئی لگتا ہے اپنوں سا

سب سے اچھا میں چلوں، سب سے رکھوں میں پریت
میں نہ دُکھاؤں دل کسی کا، یہی ہے میری ریت

پھر بھی پوچھتے ہو میرا مذہب و مشرب
کہتا ہوں میں، اس سے ہے میرا صلح کل مطلب

اس لیے تو مسلمان اور کافر میں دونوں
شیعہ بھی ہوں، سنی بھی ہوں یا تو نہیں دونوں

نفاق اور نہ تقیہ رکھوں، مذبذب ہوکر
مسلمان کہلاؤں خود کو، مومن بھی اکثر

کبھی ہاتھ باندھ کر، کبھی کھول کر پڑھوں نماز
ہاتھ جوڑ کر عالموں سے کرتا ہوں میں نیاز

نبی ﷺ کے بعد اشرف ہیں، علی اور اس کا آل
مانتا ہوں، پر حکومت میں دنیا کے اور خیال

مال و زر پہ ہے جھگڑا، حسب نسب پر نہیں
پاک برائی کارن جھگڑے، وہ آلِ اطہر نہیں

مانتا ہوں اصحابِ رسول کو بھی درجے وار
کرتا ہوں تکریم و عزت بدنہ بولوں ان کو یار

ان کے صدق و نفاق کا فیصلہ، کروں کیسے میں
حال دلوں کا اور علمِ غیب رب ہی جانتا ہے

اس پر لڑوں میں کیوں، کھو دوں کیسے اپنی بات
میں تو بھائی چارے کے حق میں کروں سب اثبات

بعد اصحابہ سب اولیاء کو مانتا ہوں میں
وہ جو شیخِ طریقت اور سچے صوفی ہیں

شروع ہوتے ہیں سب طریقے علی ولی سے
مخفی علم، امامِ پاک کا، بعد ہے ان کے

یہ ہیں خاص اور دوسرے عام خدا کے مرد
مانتا ہوں ابدال انھیں میں، کچھ ہیں قطب و فرد

میرا عقیدہ، نیت میری حق کو سب معلوم
امید عفو کی رکھتا ہوں میں یاحی یاقیوم

یہ میرا مذہب ہے، اب چاہو بولو جو
شیعہ بولو، سنی بولو، یا چاہے کافر بولو

یا الٰہی میرے اس اعتقاد کو رکھ قائم
قلیچ کا تیرے آگے ہے سوال یہ دائم

میرا جینا مرنا

لوگ مناتے ہیں خوشی اپنی سالگرہ پہ
ہر سال آتے ہیں جب جنم دن ان کے

قسمت ہے عجب میری کہ اپنے اور پرائے
روتے پیٹتے ہیں کہ کون سالگرہ منائے

جنم کے بعد بچے روتے اور ہنستے بھی ہیں
دوسرے روتے دیکھے اور روتا ہوا خود آیا میں

پیدا میں محرم میں ہوا، چوتھی تھی تاریخ
ہر طرف تھا بپا حشر اور ہر طرف تھی چیخ

اور جب مرتے ہیں تو رلائے درد و بیماری
لوگ ان کی جوانی اور درد پہ کریں آہ و زاری

امید ہے جب میں مروں گا تو جنت ملے گی مجھ کو
میرے بڑھاپے پہ نہ روئیں، تب ان کو خوشی ملے گی
بڑھاپے میں لا تقنطوا پڑھتا ہے یہ
گرچہ گناہ گار ہے پر چاہتا ہے جنت بھی

میری زندگی کی مختلف جھلکیں

بچہ تھا، نوجوان ہوا، آئی جوانی بوڑھا ہوا
بیٹا بنا، بھائی بنا، ماموں بنا، چاچا ہوا
بھانجا بنا، خالہ زاد بھی، بھتیجا نہ چچا زاد بنا
داماد بنا، سسر بنا، بہنوئی بنا، سالا ہوا
شاگرد بنا، استاد بھی، اوّل تنہا ہی رہا
شادی کرلی، باپ بنا، نانا بنا، دادا ہوا
پہلے تو تھا غریب میں اور پھر میں دولتمند بنا
پیدل چلا، سواری ملی، پھر لاڈلا بالکا ہوا
استاد بنا، مختیار کار بنا، پھر بنا ڈپٹی
پنشن لی پھر میں نے، آزاد مشقت سے ہوا
زیر، بالادست اور حاکم بنا، محکوم بھی
مرزا بنا، مزدور ہوا، بندہ بنا، آقا ہوا
شاعر بنا، مصنف بنا، بذلہ گو اور خوش نویس
تیز رو تحریر میں، تقریر میں اعلیٰ ہوا

سیکھے ہنر نقاش بنا، بڑھئی ہوا
کافر بنا، مومن بنا، شیعہ بنا، سنی ہوا
میں نے زمانے کے ہیں دیکھے مختلف رنگ و ڈھنگ
دیکھی بہاریں اور خزائیں اور بھی مضبوط ہوا
ہر حال میں حاصل کیے، دکھ سکھ کے میں نے تجربے
اک وقت میں خوش دل ہوا، اک وقت آزردہ ہوا
گرچہ دنیا بے وفا ہوئی، ہوں میں خوش قسمت قلیچ
شکر ہے اللہ کا جو چاہتا تھا وہی ہوا

کون ہوں، کیا ہوں میں؟

میں روح ہوں، رہتا ہوں آدمی کے لباس میں
حیوان بھی ہوں، پرندہ بھی، گو پنکھ نہ میرے پاس میں
اڑتا ہوں آسمان پہ دل سے اور آنکھوں سے
سوتا جاگتا ہوں، حیوان کی طرح دوڑوں پکاروں میں
کیے جاتا ہوں محنت و مشقت حیوان کی طرح میں
سوتا ہوں مُردوں کی طرح جاگوں زندوں کی طرح میں
آشیانہ ہے املتاس کی ٹہنی کے اوپر میرا
بیٹھ کے اس پر گزارتا ہوں سارا دن میرا
بیٹھ کر وہاں پڑھتا، لکھتا اور سوچتا ہوں میں
شاعری کرتا ہوں اور درد میں ڈوبتا ہوں میں
وہاں بیٹھے پڑھوں نماز، مصحف اور وظیفے
پھر کھاؤں پیوں، آرام کروں سب وہم بھلا کے

باغ ہوا میری جنت، املتاس بنا ہے طوبیٰ
میں پچھلی کی نہر کو مثلِ تسنیم سمجھا
ہے دھرتی پہ مرا عرش، ہے معراج یہی میری
جبرئیل کو دماغ اور حق کو دل میں محسوس کروں میں
یہاں جیتے جی حیوان اور انسان ہوں قلیچ
بعد مرنے کے ملائک کی طرح محسوس کروں میں

مجرد اور شادی شدہ زندگی کا موازنہ

اکیلے تھے، گزرتی تھی بہت آزاد اور تنہا
نہ کوئی غم دل میں تھا اپنے یا پرائے کا
کھایا پیا، خرچ کیا، پہنا اوڑھا خوب
کسی نے نہ شکایت کی، کسی نے نہ پتہ پوچھا
خوشی سے ہم ملازم تھے، تھا شغل لکھنے گانے کا
فراغت سے عبادت تھی، تھی میسر دین و دنیا
خوراک اور پوشاک میں ہمیشہ نکھرے ستھرے رہے
بنا کے بال، لگا کے خوشبو، ڈال کے آنکھوں میں سرمہ
بالآخر ہوگئی شادی، کی خدا نے خانہ آبادی
تھا سارے جگ سے میں بہتر، ہوا میں پھر سب جیسا
رہے ہم گھر کی محبت میں سدا خوش بعد شادی کے
برس دو گم رہے جب تک ہوا ایک بچہ پیدا
جوں جوں برس بیتے اور بچوں کی ہوئی برکت
بڑھی ہے فکر و پریشانی، ہوئے درد و خرچ زیادہ

فراغت کی گئیں گھڑیاں، عبادت میں پڑا رخنہ
نمازوں میں بھی بچوں کا خیال اور دھیان ہے رہتا
تھا پہلے جگ سے بہتر، ہوا ہمسر اور اب ابتر
ہے پنہاں اسی میں راز عمر کی ترقی و تنزلی کا
پناہ گاہ ہے نفس کی نکاح، شیطان سے بے شک
یہ ہے بند شریعت کا، مومن جہاں پناہ ہے پاتا
سکون میں شکر کرتے اور صبر کرتے ہیں اذیت میں
ہوں گے جنت میں داخل جو رکھتے ہیں صبر و شکر روا
قلیچ آزاد ہوا بن سے، اگرچہ کہتا ہے حافظ
کہ عشق آسان نمود اوّل ولی افتاد مشکلہا

بے جا فکرِ اولاد

تشویش نہ کر ماضی و مستقبل کی اے دلِ فہیم
حال پہ رکھ قابو، دنیا میں رکھ امید وبیم
یہ نہ سوچ بعد میرے کیا کریں گے، جائیں گے کہاں
میرے بیٹے اور میری چھوٹی بیٹیاں یتیم
ماں باپ نے چھوڑا تجھے، کیا چھوڑ گئے تیرے لیے
کس طرح ترقی کی تو نے، عزت ملی تجھ کو عظیم
اس طرح اولاد کے لیے تو چھوڑ یا نہ چھوڑ کچھ
تجھ کو اپنے حفظ میں رکھا، وہی رکھے گا انھیں کریم
جو بھی تجھ سے ہو سکے، چھوڑ وہ ان کے لیے
رکھ توکل خدا پہ، جو ہے رازق رب رحیم

جو بھی تجھ سے ہو سکے، تعلیم دے علم و عقل کی
اور ان کو فن سکھا، صحبت سے کر ان کو سلیم
ان کی لیاقت اور قسمت، ان کو، ان کے کام آئے
قسمت، دولت اور ہدایت ہاتھ ہے اس حکیم
ہے بروں کی اولاد نیک، اور اچھوں کی خراب
نوح کا بیٹا اور سگ کہف ہیں مثال عمیم
کیا تیری طبیعت تھی، کیا صحبت تجھ کو ملی قلیچ
آتے ہیں زیرِ اثر تیرے، کئی نعیم و نجیم

ہنر شعر سازی

دھیان کر کے میری شعر سازی دیکھ
دھاگے باریک پہ ترکتازی دیکھ
مثلِ عنکبوت بھاگتا ہوں میں
تار پہ بیٹھ کے کھیلتا ہوں میں
ساحروں کی یہ چشم بندی نہیں
شاعروں کی یہ سر بلندی نہیں
یہ نہ بے باکی جانبازوں کی
یہ ہے چالاکی شعر سازوں کی
ایسا سمجھتا ہے کوئی بازی گر
رخش دوڑاتا ہے جو میدان پر
ہاتھ میں لے کے قلم کا چوگان
مانا کہ بازی جیتوں سرِ میدان

وار جو رکھا ہے سمندر پر
پل صراط ہے یا خیالی راہ گمر
اتفاقاً جو میں سمندر میں گروں
موتی نکال لاؤں میں غواصوں سوں
پرو کے نظم، میں مالا بناتا ہوں
شمار ہوتے ہیں موتی، وہ لاتا ہوں
کبھی ان سے بناتا ہوں چندن ہار
جوہری بیچتا ہے جسے سر بازار
کچھ چھپا کے رکھوں اچھے طریقے سے
''موتیوں سے بھرا ڈبہ☆'' میں جو مشہور ہوئے

روح کی ترقی نہ تناسخ

ترقی روح کی طبعی ہے دراصل حقانی
رہوں میں باقی، جو ہر حال میں ہوں فانی
اوّل جمادی تھا، پھر نباتی ہوا
چھوڑ کے روح نباتی، ہوا میں حیوانی
مرا حیوان ہو کے تو پھر بنا میں انسان
تھی حیوانی روح دراصل، ہوئی وہ پھر انسانی
ڈرتا مرنے سے نہیں کہ ہوتا ہوں بہتر
بشر ہو کے مروں، جب بنوں ملک روحانی

☆ ''موتیوں سے بھرا ڈبہ'': مرزا قلیچ بیگ کی معروف کتاب کا نام۔

اور اُڑتا ہوں جو ملک ہو کے مروں
جو کُلُّ شَیءٍ ہَالِک☆ ہوا امرِ ربانی

وہم میں بھی جو نہ آئے میں وہ بنتا ہوں
فرشتوں کا کروں خود کو میں ثانی

عدم کو جاؤں، جہاں سے آیا ہوں
اِلَیہِ رَاجِعُوْن☆☆ اُس دم ہوا حکم قرآنی

اس طرح کہتا ہے مولوی رومی،
قلیچ کو سن کے یہ ہوئی حیرانی

تھا میں قبلِ ازل، رہوں گا بعد از قبل

حکمِ حق پہ تو میں با وفا بھی رہوں
صاف صوفیوں کی طرح باصفا بھی رہوں

سن کے ان کے قول سناؤں تم کو
نہیں مروں گا میں، دائما بھی رہوں

چاند نہیں ہوں یہ خاقانی کہتا ہے
چمکتے سورج کی طرح رہ نما بھی رہوں

اس سے پہلے بھی میں سو برس سے تھا
سو برس اور میں اس کے سوا بھی رہوں

اس طرح کہتا ہے مولوی رومی
مثلِ سبزے کے بارہا بھی رہوں

☆ "جو کل شئی ہالک": سب نے مرنا ہے۔ ☆☆ خدا کی طرف لوٹ جانا ہے۔

نو سو پچاس میں نے دیکھے قالب
جیسے پہلے تھا میں ویسا بھی رہوں
شمس تبریزی اک مقام پہ ہے کہتا
ابتداء تھا میں، انتہا بھی رہوں
گھاس پیدا ہوئی اک بار اور آدم
میں تو انسان کئی مرتبہ بھی رہوں
جیتا جاگتا احمد جام بھی کہتا ہے
ہو کے قطرہ قلزم سے جدا بھی رہوں
تھا میں جسموں میں، سو ہزار برس
کئی برس اور بے انتہا بھی رہوں
قول منصور کا اس طرح کا ہے
فنا کیسے بنوں، بن کے بقا بھی رہوں
بحر وحدت کا میں وہی قطرہ ہوں
بجا! پہلے تھا، پھر بجا! رہوں ہی رہوں
اور سنائی حکیم بھی یہ کہتا ہے
سب سے پہلے تھا، کہو کہ کیا ہی رہوں
اُلٹی بولی یہ بہلول کی بھی تو سن ذرا!
دو برس میں تو، قبلِ خدا بھی رہوں
نہ تھے ارض و سما اور خدا بھی نہ تھا
تب تو بن کے میں نشوونما بھی رہوں
کہا نبیﷺ نے کہ میں ہوں محمدی نور
ازل سے تھا میں، اور میں سدا ہی رہوں

حق میں حاضر تھا، آدم کی صورت
واصلِ آخر میں تو باخدا بھی رہوں
پیروی ان کی میں کرتا ہے قلیچ
کیوں نہ زندہ سدا، بھلا میں رہوں

''عورت'' کے بارے میں رائے

عورت ہی جانے ہے رنگ اور نیرنگ
صلح کرنا بھی جانے اور جانے ہے جنگ
دوستی میں وہ ہے جان کی راحت
دشمنی میں دنیا بھر کی ہے یہ آفت
باوفا ہو تو بناؤ ہار گردن کا
بے وفا ہے تو ہے مار پیرہن کا
سچی ہو تو اس کو تو آنکھوں میں بٹھا
سر بھی قربان کر، کر جان اس پہ فدا
جھوٹی ہو تو اسے نکالنا یکدم
مار گزیدہ کا نہیں اور کوئی مرہم
صُمٌّ بُکمٌ عُمیٌ، بھی ہے جو گھر والی
لولی، لنگڑی، بوڑھی یا لڑکی ہے بالی
اندھی اس طرح کہ نہ غیر کو دیکھے
سوائے حق کے کوئی نہ ہو گوارا اسے
گونگی ہو ایسی کہ نہ زیادہ بات کرے
شکوہ کرے، گالی دے، نہ ہی طعنہ دے

بہری ایسی کہ وہ کبھی سنے نہ گلا
نہ قصہ سنے کبھی، نہ ہی پیغام غیروں کا
لنگڑی ہو تاکہ نہ نکالے باہر پا
بھوک مرجائے مگر جائے نہ کسی جا
ٹنڈی ہو تاکہ نہ مارے اپنے بچوں کو
خاوند کو بھی ذرا نہ اس پر شک ہو
یعنی اپنے خاوند کی طرح دیکھے اور سنے
اس کی مرضی سے، نہ اپنی منشا سے چلے
اپنے خاوند کی طرح کے خیال اس کو ہوں
قول و افعال اس کے بھی اسی جیسے ہوں
دو قلب اک تن میں جیسے ہیں بادام
بلکہ یکدل ہوں دونوں یک وجود تمام
مل کے دونیم جیسے ایک بنتا ہے سالم
بیوی اور خاوند بھی ہوں اس طرح باہم
ایسی جورو نہ جس کی ہو شباہت ایسی
بھولی بھالی ہو بھلے، بھلا قباحت کیسی
اپنے خاوند کے لیے وہ حور سے کم تو نہیں
گھر اس کا فردوس سے زیادہ ہے کم تو نہیں
وہ خوش بخت دائما دلشاد رہے
اس کی دنیا اور عقبیٰ یوں آباد رہے

میری مناجات

یا الٰہی ہم پہ ہر ساعت
تیری نازل رہے نعمت
فضل ہم پہ تیرا ہمیشہ رہے
شکر تیرا یہ دل ہمیشہ کرے
روز و شب غفلت میں رہتے ہیں ہم
ہوس کے ہی یارب بندے ہیں ہم
اے خداوند، قادر اور قیوم
یہ ہمارا حال تجھ کو سب معلوم
کیا نفس نے ہے برباد مجھ کو
کیا ہے شیطان نے پُرگناہ مجھ کو
عمر گزری ہے سب خطا کرتے
ہم گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہیں پھرتے
ہم نے دل سے نہ تیری عبادت کی
نفس کی ہے ہمیشہ اطاعت کی
ہم ہمیشہ اہلِ ہوس ہی رہے
نہ گناہوں سے توبہ تائب ہوئے
نفس کے پیچھے چلے تباہ رہے
ہم گناہ گار رُوسیاہ رہے
ہوں شرمندہ اور پشیماں میں
کرتا ہوں توبہ دل و جان سے میں

کیسے آؤں تیرے سامنے میں بے چارہ
کیسے دکھلاؤں یہ وجود شرمندہ سارا
ہے نہ کوئی نیکی، ہوں میں ہاتھ خالی
تو ہی وارث ہے میرا، تو ہی ہے والی
میں جاؤں کہاں تیرے در کے سوا
کون پوچھتا ہے دوسرا تیرے بنا
میں گناہ گار ہوں تو تو رحیم ہے
میں سیاہ کار اور تو کریم ہے
میری عادت ہے ہمیشہ گناہ کرنا
معاف کرنا تیری صفت ہے خدا!
گر کرے گا انصاف تو خداوندا!
کیسے چھوٹے گا پھر یہ تیرا بندہ
فضل امید پہ بچ جائیں گے
رحم تیرے سے، نجات پائیں گے
گرچہ ہیں گناہ میرے ہزار
تیری توحید کا تو کرتا ہوں اقرار
اپنی رحمت کے واسطے مولا
اپنی عزت کے واسطے مولا
واسطے اپنے دوست یاروں کے
واسطے اپنے سب پیاروں کے
میری توبہ قبول کر یارب!
میرا مقصد حصول کر یارب!

میرے بُرے کاموں پہ کر نہ نظر
تو اچھا ہے، میرے ساتھ اچھا ہی کر
میرے اندر تو روشنائی دے
قلب میرے کو تو صفائی دے
علم و حکمت نصیب کر مجھ کو
معرفت کی دے نظر مجھ کو
تو نہ دے حرص، مجھ کو دنیا کی
دے شوق مجھ کو، کروں سیر عقبیٰ کی
تیری محبت سے دل رہے معمور
میری زبان پہ ہوں بس ترے مذکور
جیتے جی تیرے محبت سے دل آباد رہے
بعد مرنے کے بھی ساتھ تیری یاد رہے
رزق دے تو حلال کا یارب!
حسن دے تو مال کا یارب!
مجھ کو محتاج نہ دوسروں کا کرنا
تو غیب سے ہمیشہ میری مدد کرنا
قرض و مرض سے فراغت دے
تو قناعت کی رب دولت دے
تاب و طاقت مجھ کو دے اے یزداں
کہ کر سکوں میں قابو نفس و شیطان
مجھ کو رکھنا تو، تندرست و توانا
مجھ کو سکرات کی سختی نہ دکھانا

ماں باپ میرے بخشنا اے خدا!
بہن بھائیوں کو بھی میرے بخشنا سدا
بخش میرے سب عزیز و قریب
مجھ سے پہلے گئے جو دوست حبیب
خوش رکھنا میری تو آل و عیال
کرنا صالح انھیں تو نیک خصال
ہو اچھا نصیب ان کا اور عمر دراز
ہو عزت و شرف کے ساتھ ان کو نیاز
خوش رہیں سب عزیز رکھنا ان کا خیال
اور دوسرے مومنوں کو بھی رکھنا سنبھال
موت اور قبر کا عذاب نہ دے
مجھ کو عقبیٰ کا تو عتاب نہ دے
قیامت میں تو بلانا ساتھ نیکوں کے
اپنے پیاروں اور ساتھ صالحوں کے
کرنا دعا یہ قلیچ کی تو قبول
فضل سے اپنے اور بحق رسول

آج کے دور کی نجی وملکی صورتِ حال

عقل سے پوچھے میں نے سوال جو کل شب
عقل نے مثال دے کے دیے جواب بھی تب
کہا میں نے بحث مولویوں کی کیسی ہے
خواہ مخواہ کی قیل و قال کرتے ہیں کہا سب

کہا میں نے نفس کیسے ہو تابع
عقل بولی کہ اس پہ جوتے پڑیں تب!
زیست کیسی ہے یہ میں نے جب پوچھا
خواب ہے، خیال ہے، مایا ہے یہ سب
مثال دے کے بتا ذرا دنیا کے بارے میں
کرے سنگھار، بوڑھی نار دکھائے چھب
جو میں نے کہا اس کے مکر و فریب بتا
عقل نے مجھ سے کہا جیسے کنجری کے ہوں کرتب
کہا میں نے اس سے خوش کون رہتے ہیں
عقل بولی، کمینے، لچے، لفنگے، بے ادب
کہا میں نے عیال و اطفال کیسے ہیں
کہا اس نے وبال و جنجال ہے یہ سب
آدمی کیسے رہتے ہیں مشغول بتا!
بولا، مال جمع کرنے کا سب کرتے ہیں کسب
خدا کی مخلوق ہے کیسے، میں نے جو پوچھا
عقل بولی کہ کسی کو یاد نہیں ہے اپنا رب
سزا کیا ہے ان کی۔ میں نے اس سے پوچھا
کہا عقل نے ۔ [illegible] وبال، قحط و غضب
میں نے پوچھا بھلا آدمی، دنیا والے
کہا اس نے بندر، سگ و شغال ہیں سب
کہا میں نے کیسے رہتے ہیں آج کے وکیل
گدھ ہوں مردے پہ، یہ ان کا ہے مشرب

میں نے پوچھا پولیس والے کیسے ہیں
کہا پاپی ہیں، چور ہیں، دجال ہیں سب
پوچھا یہ بوڑھے منشی بتا تو کیسے ہیں
کہا جیب کترے ہیں، ڈاکو ہیں، خدا کا غضب
بتا احوال مجھ کو بھلا تھوڑا حکمرانوں کا
عقل بولی کہ رشوت کے رسیا ہیں عجب
کہا میں نے پٹواری بھلا کیا کرتے ہیں
کہا اس نے رشوت کے لیے ہیں جاں بلب
میں نے پوچھا، وڈیروں کا حال مجھ کو سنا
قحط خوردہ ہیں، مقروض ہیں بیچارے سب
میں نے پوچھا میر و پیر کیسے ہیں
"ہر کمال را زوال است" عقل نے سنایا تب
میونسپل کے الیکشن کے بارے میں بتا
شور و غل، نفاق و جدل، غیبت و کذب
کیسے چلتا ہے لوکل بورڈ یہ بھی تو سنا
بیل کولہو کا جس طرح چلتا ہے اسی ڈھب
میں نے پوچھا کیسی ہے مجسٹریٹی بیچ
بولا سرکار کی ڈرامہ سازی ہے کرتب
میں نے پوچھا، کونسل کے ممبر کیا ہیں
نام سے خوش کرتے ہیں بس صاحب
میں نے پوچھا ہوم رول ملے گا کب
کہا اس نے کہ برسوں گزریں گے تب

خبر دے ولایت کی جو میں نے پوچھا
عقل نے مجھ سے کہا رائٹر سے پوچھو سب
میں نے پوچھا دنیا میں جیے کس طرح قلیچ
کہا اس نے خوش خلق، خوش دل، باادب!

چائے کی تعریف

چائے سے ہے زیست میری، چائے میرا خورد و خواب
چائے میری عیش و عشرت، چائے طاقت چائے تاب
ناشتہ ہے چائے میرا، کل وقتی طعام
ٹوسٹ و بسکٹ، کباب چائے ہی کافی شراب
چائے ہی جگائے مجھ کو، لوری دے کے سلائے
چائے ہی دے ہمت، لکھائے چائے، پڑھائے کتاب
چمچہ پکڑوں ہاتھ میں، اک ہاتھ میں تھاموں قلم
بغل میں کاغذ، لبوں پہ پیالی، آنکھوں میں بھی آب
ساسر و کپ، کیتلی، ٹی پاٹ، میرے ساتھ میں
آگ پہ پانی ابلتا میرے کانوں میں رباب
چائے سے ہے چاہ اس کو، تبھی گاتا ہے قلیچ
کوئی چاہے یا نہ چاہے، اچھا کہے کوئی خراب

عید کے موقع پر، خاندان کے بچوں کے بارے میں

بچو! ہوئی عید، ہو سب ہی شاد
اک دوجے سے مل کے دو ذرا مبارک باد

کریں ماں باپ تمھیں بھی دل سے دُعا
خدا تم کو کرے دنیا میں شاد کام و آباد

کھجور کھاؤ، کھیر کھاؤ، سویاں کھاؤ
بھاگو، کودو، جیسے ہیں پنچھی آزاد

خرچو، کھاؤ، مزے اڑاؤ دل بھر
مگر ان فقیروں کو بھی ضرور کرو یاد

تم سب کے اب میں نام لیتا ہوں
تم ہو شاخیں، اک شجر کی بنیاد

نادر، اختر، اسد، ہمایوں بیٹے
بیٹیاں فخر النساء اور دوسری دلشاد

دوسرے بیٹے، افضل، اکمل اور اجمل
ادھم، ارشد، دوسری بیٹی ہے شہزاد

اب نواسوں کے بھی اسم سنو مجھ سے
یہ ہیں فیروز اور وہ دوسرا فرہاد

اور دو ان سے بھی تو چھوٹے ہیں
ایک تو جمشید ہے اور ہے دوسرا شمشاد

منوچہر اول ہے، ان سب بھتیجوں میں
صادق علی میرے بھائی کا ہے یہ داماد

پھر فرخ، پھر سکندر اور پھر حیدر
اور گنواؤں دیگر بھی، اگر ہو ارشاد

سڈنی، اسٹانلی اور یہ تیسرا ایڈورڈ
اور دیگر بھی، نیاز، نثار اور امداد

بھتیجوں کے بیٹے ہیں قیصر اور شوکت
اور فرید بھی آیا ہے، خوش معیاد
ماہ رخ یہ میرے بھتیجے کی بیٹی
ہیں ناصر، آصف بھی میرے خواہرزاد
لالہ رخ، شاہ رخ اور گل رخ ہیں
میری بھتیجیاں نیک دل نیز نیک نہاد
روح افزا ہے اور ایک ہے حسنہ
اور خجستہ بھی، جو بھی خجستہ نژاد
بدر النساء ہے اور یہ قمر النساء بھی ہیں
گر یہی ملاؤں تو پوری ہوگئی تعداد
زاہد، ذاکر و ضامن میرے تینوں پوتے
پوتی شیریں ہے، جو کہ ہے خوش میلاد
زیب النساء اور شرف النساء میری ہیں بہنیں
سات بھائی ہیں ہم جملۂ افراد
مرزا فریدون بیگ ہمارا ایک ہی دادا
ہیں ترپن، جملہ کل، ملا کے اس کی اولاد
بڑا بھائی میرا ہے غلام رضا
دوسرا صادق علی، ہیں دونوں اوتاد
مجھ سے چھوٹا تھا، علی قلی
پھر تھا جعفر قلی جلیع وقاد
اس سے چھوٹا تھا بھائی نجف قلی
پھر تھا حیدر قلی بھی حسن معاد☆

☆ معاد: دنیا کا کاروبار

گھر تو ہیں، مگر خانوادہ بس اک ہے
سارے گھر خدا کرے، رہیں آباد
سب کو دل سے دعا بس یہ کرتا ہے قلیچ
بخت بیدار ہو سب کا اور ہو عمر زیاد
سب کو ہدایت دے اے کاش خدا
دے محبت اور دور کرے فتنہ فساد
یا الٰہی! تو میری دعا کرنا قبول
بہ محمد و آلہ اِلا مجاد

دنیا میں جنت

قید خانہ دنیا ہے مومن کے لیے یار
باغ بستان ہے کافر کے لیے حدیثوں کے انوسار
دوزخ و بہشت دنیا ہے یہ عارفوں کے لیے
ہیں حالات مخالف مگر سب کا اختیار
خلق نیک اور خلق بد ہے دوزخ
ہوا ہے ایسے دنیا میں جنت و جہنم آشکار
غفلت اور خواب ہے دوزخ، اور بیداری بہشت
جہل نار جہنم، علمیت بہشت و بہار
صبر و شکر و قناعت و رضا ہیں بہشت
کچھ ان کے خصائل ہیں جہنم بے شمار
تیرا اختیار کہ جائے جہنم یا جنت کو میری جان
یاں جسم سے، واں روح سے، یہ تیرے ہے اختیار
اندھا جو رہے گا یہاں، وہاں اندھا رہے گا قلیچ
عمل کر!! دھیان دے!! کہتا ہے قرآن یار

گوشہ نشینی اور قناعت

تیری عمر کے دو دن تیرے پاس ہیں باقی
گوشۂ قناعت میں اگر جا کے تو مقام کرے
دو بیل لے اور آباد کر زمین کا قطعہ
میر ایک کا، دوسرے کا وزیر نام کرے
حلال کی روٹی اگر آئے تجھے یوں ہی میسر
خوش دلی سے، محبت سے تو ترک حرام کرے
قبیح اس سے بڑھ کر ہے کہ غیر کے آگے
تو سینے پہ ہاتھ رکھے اور جھک کے سلام کرے

نماز، روزہ، صدقہ وزکوٰۃ

عبادت کرکے خدا کی راہ تو چلتا ہے
حق کا قرب بلاشک میسر ہے ہوتا تجھے
آدھی منزل تک نماز لے جاتی ہے تجھے
اور روزہ تجھے دہلیز تک لے جاتا ہے
گھر میں داخل کرتا ہے تجھے صدقہ
ان سب کو اختیار تو کیوں نہیں کرتا

رباعیات

بچوں کی تکلیف

کرتے ہیں تنگ بچے، پھر بھی میں ان پہ جان دوں
کرتے ہیں خوب شور، میں چھپ چھپ کے سارا سنوں
بجلی کی طرح ناچتے آتے ہیں، تنگ دھڑنگ جو
بنتے ہوئے بادل کی طرح ڈھانپ لوں ان کو

گریہ توبہ

بھاپ بنا دیتا ہے بادل، سمندر یہ سارا
بادل ہی کرتا ہے میٹھا یہ پانی کھارا
ثوابوں میں بدلے گناہوں کو توبہ کا رونا
بارش ہی کرتی ہے سفید ہر بادل کالا

میرا اسلام

اے دل! تو خدا کے زیرِ فرماں نہ رہا
خراب کاموں سے بھی پشیماں نہ رہا
عالم بھی بنا، عابد بھی بنا، زاہد بھی بنا تو
سب کچھ ہے بنا مگر مسلماں نہ بنا تو

دنیا میں اختلاف ہے کفر و دین کا
مقصد ہے اگر ایک تو لڑتے ہیں کیوں بھلا
تب آگ نکلتی ہے جب رگڑتے ہیں دو پتھر
مسجد اور خانقاہ کی لڑائی، مطلب کیا؟
دل تو ہے مومن اور نفس ہے کافر
مومن کو تو کافر کے حوالے نہ کر
ہاتھ ہے تسبیح اور کیا کرتوت ہیں تیرے
قول و فعل پُرتضاد، کچھ تو کر شرم آخر

میری شاعری

مضمون اچھا کوئی گر دیکھوں یا سنوں میں
کرتب باز کی مانند اس پہ شاعری کروں میں
کانوں سے سنوں اور آنکھوں سے جو دیکھوں
وہی بات کرکے منظوم بیان کروں میں

میرا رونا، ہنسنا

میں دنیا میں اپنے آپ کا غم خوار بنا ہوں
خون اپنا پیئوں اور سر بزم اشک بہاؤں
درد نے جھکادی ہے کمر مانند صراحی
روتا ہوں خون آنسو، بلند آہنگ ہنستا ہوں

میری عبادت

تو ہے اپنے نفس کا بندہ، ہے کس قسم کا
جو بھی کرتا ہے تو نہیں ہے عبادت، ہے ظلم
اس عبادت سے تجھے کوئی لذت نہ آئے گی
عبادت تو غذا روح کی ہے اور تو ہے نرا جسم

خدا کا گھر

تو گبر، یہود یا نصارا سے نہ ڈر
جہاں رات ہو جائے، خدا کا ہے وہی گھر
کنیا سے کیا اور مسجد سے کیا مطلب
مالک تو ایک ہی ہے سب ہیں اس کے گھر

شیعہ، سنی

اللہ اور رسول کا مانوں میں فرمان
تن من کرتا ہوں پنج تن پہ قربان
سب یار اور اصحاب عزیز رکھوں میں
کہتا ہے سنی، اس پہ ہے شیعہ کا گمان

آہ وزاری

ڈرتے ہیں گناہوں سے نیر بہائیں
یہ اشک ہیں جو آگِ جہنم کو بجھائیں
آنسوؤں کی بارش سے ملتی ہے جنت
پانی بھرنے والے ہی تو بہشتی کہلائیں

میراج

آج ہے عیدِ حج، لوگ کعبہ کی طرف رواں
وہ کرتے ہیں طواف اپنے رب کا عیاں
تو مجھ کو ملا ہے، اپنے ہی دل میں ہردم
گرد اپنے آپ کے پھرتا ہوں میں رواں

شب خوابی خوب تر

کھلی رکھ تو اپنی آنکھیں، ساری رات عبادت کر
من کی تسبیح پھیر اے بندے کر اس کا ذکر
جاگے ساری ساری راتیں، اک پل نہ سوئیں
ہوتے نہیں پشیمان تم، کیا پنچھی سے بھی ہو کمتر

میرا دفترِ عمل

عقل کے مکتب میں تو بن جا اپنی آپ کتاب
جو بھی سوال حق کا ہو تو اس کا بن جا جواب
لیکھا چوکھا، سیدھا گر تو چاہے کل
اپنے آپ سے دوست میرے آج ہی کر حساب

دو دُکھ

دو باتیں ہیں جو کریں دل کو شاق
کریں دل کو کباب اور موت کو کریں مشتاق
میں تم کو سناؤں، گر سن سکو تم
یہ جوانی کی نایابی اور محبوب کا فراق

آج کل کے دوست

دانتوں کے مثل یار ہوئے آج کے
کچھ وقت رہیں خوش، رہیں کچھ وقت رفیق
تھک کے تجھے چھوڑ جائیں کچھ عرصے بعد
اک اک کرکے دور چلے جائیں وہی رفیق

خاموشی بہتر

دانا ہے وہ جو سوچ سمجھ کے بات کرے
بولے جو غیر ضروری، خطا وہی تو کھائے
مجلس کے جو آداب ہیں وہ سیکھ چلم سے
جب تک نہ پوچھیں، نہ کوئی بات سنائے

میرا مذہب

دیکھتا رہ، بول نہ کچھ، یہ رکھ مذہب
خود کو دوسرے سے سمجھ کمتر یہ رکھ مشرب
بھول اپنے آپ کو، خیر مانگ خلق کی
مانگ نہ کچھ اور دیتا جا، حساب سے کیا مطلب

کارِ روزمرہ

ہر رات جاگتا ہوں درد سے، تا پربھات
ہر روز روتا ہوں کرتا ہوں زخمی ذات
گزرے ہیں ستر برس میرا یہی ہے کام
دن رات کے پیچھے جائے، جائے دن کے پیچھے رات

چشمہ میرا

جاتا تھا پینے پانی بجن پیارا
کہا میں نے چشم رکھتا ہے چشمہ میرا
پیو پانی نہ جاؤ اب، کہا ہنس کے
لب تیرے میٹھے اور پانی ہے بڑا کھارا

میری دعا

خداوندا تو عاصیوں پہ احسان کر
یہ حیوان ہیں ان کو پھر سے انسان کر
کیے گبر بہت مسلمان تو نے تو کیا ہوا
اک اور گبر کو بھی مسلمان کر

میری محنت

وہ تو تیرے ساتھ ہے تو جس کی پوچھے ذات
موجود تجھ میں ذات ہے اس کی، پر نہ ہے صفات
یہ گڑھا خودی کا کھود لو دو تین گز اور
اپنے آنگن ہی میں ملے گا تجھ کو آبِ حیات

میری مختصر سوانح

جب میں دس کے پیٹے میں تھا تو تھا زار زبوں
بیس اور تیس کے پیٹے میں رہا مجھ کو جنوں
چالیس اور پچاس کے پیٹے میں فکر و پریشانی رہی
اب ساٹھ اور ستر کے پیٹے میں ہوں غم سے سرنگوں

بڑھاپا

کمزور ہوئے سب حواس بڑھاپے میں
ہردم رہے فکر لاٹھی اور چشمے کی
اپنی جگہ پہ رہیں آنکھیں اور نہ پاؤں
آنکھیں ہیں جیب میں اور ہاتھ میں لیتا ہوں پاؤں

وزارت سے نفرت

تو دھیان سے دیکھ شطرنج کی چال چلن
چھوڑ دے طمع قبیح، دل میں کر پیدا ہمت
بنو گے گر وزیر تو چلنا پڑے گا ہر سمت
رہو پیادے، چلو سیدھے تو پاؤ عزت

اپنے حال پہ افسوس

ہے ممکن کہ زمانہ چھوڑ دے خراب چلن
ہے ممکن کہ بخت اپنا بھی عروج پائے
کہاں سے آئیں گے وہ جو تھے ہمراز و ہمدم
وہ جو بیت جاتی ہے عمر، وہ کب واپس آئے

میری سیر

جب بھی نیند رکھتا ہوں میں اپنی آنکھوں پہ
کر آتا ہوں بارہا سیر میں ارض و سما پہ
کہتے ہیں لوٹتا نہیں کوئی اُس جہاں سے
ہر روز لوٹ آتا ہوں میں کئی بار گھوم کر

میرا پلٹ آنا

ہیں عالم بالا سے بلاتے مجھ کو
میں مروں گا تو پھر سے جی اٹھوں گا
چوراہے پہ مرتا ہوں، جیتا ہوں مانند شمع
ہیں بجھاتے مجھ کو، میں پھر سے جل اٹھوں گا

میری وصیت

اے میرے بچو قدر پہچانو تم میری
رہے گا نہ ہمیشہ میرا یہاں ٹھکانہ
شوخی سے کبھی کہتا ہوں دل کی بات تمھیں
یہ بھی ہے تم پہ احسان، گر تم نے مانا

میرا مرنا

گرتے ہیں قدیم شجر تو اگتے ہیں نئے
گرتے ہیں درختوں سے پتے تو پھوٹتے ہیں نئے
غم کیا گر بدلتا ہے زندگی کا جامہ
دل مسکراتا ہے جو لباس بنتے ہیں نئے

خاموشی بھلی

خوش دلی سے جو رہنا ہے تو تفکرات چھوڑ دے
"باقی" جو رہنا ہے تو ہو فنا میں غرقاب
راحت جو چاہے اس دنیا میں تو بھائی
خاموشی اختیار کر، اگرچہ ہے نیستی کا باب

اپنے حال پہ افسوس

ہے ممکن کہ زمانہ چھوڑ دے خراب چلن
ہے ممکن کہ بخت اپنا بھی عروج پائے
کہاں سے آئیں گے وہ جو تھے ہمراز و ہمدم
وہ جو بیت جاتی ہے عمر، وہ کب واپس آئے

میری سیر

جب بھی نیند رکھتا ہوں میں اپنی آنکھوں پہ
کر آتا ہوں بارہا سیر میں ارض و سما پہ
کہتے ہیں لوٹتا نہیں کوئی اُس جہاں سے
ہر روز لوٹ آتا ہوں میں کئی بار گھوم کر

میرا پلٹ آنا

ہیں عالم بالا سے بلاتے مجھ کو
میں مروں گا تو پھر سے جی اٹھوں گا
چوراہے پہ مرتا ہوں، جیتا ہوں مانند شمع
ہیں بجھاتے مجھ کو، میں پھر سے جل اٹھوں گا

میری وصیت

اے میرے بچو قدر پہچانو تم میری
رہے گا نہ ہمیشہ میرا یہاں ٹھکانہ
شوخی سے کبھی کہتا ہوں دل کی بات تمھیں
یہ بھی ہے تم پہ احسان، گر تم نے مانا

میرا مرنا

گرتے ہیں قدیم شجر تو اگتے ہیں نئے
گرتے ہیں درختوں سے پتے تو پھوٹتے ہیں نئے
غم کیا گر بدلتا ہے زندگی کا جامہ
دل مسکراتا ہے جو لباس بنتے ہیں نئے

خاموشی بھلی

خوش دلی سے جو رہنا ہے تو تفکرات چھوڑ دے
"باقی" جو رہنا ہے تو ہو فنا میں غرقاب
راحت جو چاہے اس دنیا میں تو بھائی
خاموشی اختیار کر، اگرچہ ہے نیستی کا باب

دکھ اور سکھ

دکھ کے گلے کی جو تجھے عادت سی پڑی ہے
محنت جو کرے رنج میں، راحت بھی بڑی ہے
کوشش کر بہا چند قطرے تو پسینہ
پھر دیکھ عسرت میں عشرت بھی بڑی ہے

میرا واسطہ

دنیا میں خیر و شر بھی میں چاہوں اپنا
کعبہ بھی بناؤں اپنا، کلیسا بھی بناؤں اپنا
رکھوں نہ واسطہ، کسی سے میں اپنے بنا
عاشق بھی بن جاؤں معشوق بن جاؤں اپنا

کثرت میں وحدت

ذرۂ نایاب تھا جو کہ کبھی تھا ذرۂ دریا
آنکھ کھولی جو اس نے تھا پڑا در صحرا
ہے مشہور کہ عنقا ہے چٹانوں کا باسی
پتہ اب ہے لگا کہ، قاف تھا واقع در عنقا

میری آس

اک لحظہ بھی تجھ سے دور نہ رہوں اے کاش
کہیں بھی دوسرا تیرے بنا نہ دیکھوں اے کاش
تجھ بن جو تنفس کا یہ رہے سلسلہ میرا
یا رب میں وہ تنفس بھی نہ لوں اے کاش

فرد یا نظم

شمع کی ریاضت کہ رات بھر بیدار رہے
اک پیر پہ کھڑی ہے وہ روئے اور جلے
عیب نہ نکال، کوئی چیز اچھی ہو کہ بڑی
عیب صنعت میں دیکھنا ہے عیب صنعت گر کا
پا شکستہ کے لیے مشکل ہے کعبۃ اللہ کی طلب
کعبہ قلب کا ہے جو کہ آسان ہے حاصل کرنا
سیاہ ہوا تیرا چہرہ گر گناہ کی سیاہی سے
دھو آنکھ کے آب سے یکدم اس سیاہی کو
عقل تم کو نہیں، بند آنکھوں سے بھی دکھتا ہے
فہم تم کو نہیں، لام بندی بھی ہے گفتگو
خوف شیخ سے میں نے مستی کی ہے اختیار
نہیں تو میخانہ و مسجد کی رہ گزر ایک ہی ہے
پروں کی قوت ہے مطلوب اے پنچھی ہمت کر
ہے بت خانہ سے کعبہ بھی اک پرواز ہی بس

رزق رازق ہی پہنچاتا ہے ہر انسان کو
شکر سے کھا خوب اور کھلا شوق سے مہمان کو

اپنی روزی دوں اوروں کو، ہوں مہمان نواز
دوسرے کھاتے ہیں میرا غم اسی ایک سبب سے

زرد ہے چہرہ میرا اور میرے آنسو ہیں لالہ رنگ
آکے باہم ہوئے میرے پاس یہ خزاں اور یہ بہار

ہماری خاکساری میں ہے ہماری سربلندی نہاں
ہماری زمین جو تو کھودے تو آسمان پائے

بہت ہی مروّت کی مجھ پہ میری نم آنکھوں نے
زیادہ رونے سے مجھے غریقِ رحمت تو کیا

تو اس کو مان اور اطاعت بھی اس کی کر
آدمی سے چھپائے عبادت اپنی جو گناہ سے بڑھ کر

مثالِ مشک، عمر یہ رائیگاں گئی اپنی
ہوئے سفید بال اور قلب سیاہ بھی ہوا

جو گھر میں بے اندازہ مال رکھتا ہے
ہو نہ گھر میں عورت تو وہ مفلس ہے

زاری اور بے خودی طہارت ہے
نفس کا تزکیہ اصل عبادت ہے

جب تک ہے چشم، روتا رہ تو زار زار
لب ہیں جب تک، پڑھتا رہ استغفار

توبہ کو عیب سمجھتا رہا جوانی میں قلیچ
کام تو ایسے کیے تو نے جو گناہ گار نہ کرے

کیا نارِ جہنم میرے دامن کا بگاڑے گی
گر حشر کے میدان میں ہمراہ ہے چشمِ نم

دنیا ہو درپئے آزار تو نہیں عار
کر کوشش کہ دنیا کو آزار نہ دے تو

جو تربیت نہ دے خود کو وہ حیوان ہے بلاشک
آدم تو ہے وہ جو بزرگوں پہ نہ اترائے

رات کو موت کی ہوئی فکر اور ہوشیار ہوئے
اچاٹ ہوئی نیند اور بیدار ہوئے

فلک دشمن، زمانہ بے وفا، یار بے پروا
قلیچ احمق! مجھے تجھ پہ بے حد ہنسی آتی ہے

نہ ہو بیزار شمعِ انجمن پروانوں کے جھرمٹ سے
نہ تو ہی صبح تک ہوگی، نہ یہ صحبت اور نہ میلہ

میرا گریہ شفاعت کرے گا میری
پشیمانی عجب پیغمبری ہے

مجھے کر دیا بیدار مرغِ سحری نے
ملا کی بانگ کا نہیں ذرا احساں مجھ پر

فکرِ پس و پیش کی رخصت کے وقت نہیں
جو اپنا کرے اسباب پہلے سے روانہ

جو حمایت نہ حاصل ہو مجھے یزداں کی طرف سے
وہ کام خدا بن کے میں خود ہی کروں گا

موزوں طبع ہو تو بچہ نہ چاہیے دیگر
دو بیت ہی اچھے ہیں ہزار پسر سے

سجدا کرتی ہے نیاز سے دیکھ صراحی
پانی دیتی ہے سجدے سے ساغر کو

دیدۂ نم، آنسوؤں کے بیج، جبیں کی زمین
دیے ہیں اسباب تم کو، قیامت کی تیاری کر

خدا کا شکر کر ہر روز قلیچ تو ہزار بار
دوا لیتا رہے تو جو، تو نہ رہے اکثر بیمار

اب تو جا کے ہم مرید پیر مغاں کے ہوئے
کیونکہ اس دور کے رہبر بنے رہزن

تیرے ذکر سے خالی نہ ہی لکڑی نہ ہی برتن
اس کے شاہد ہیں دونوں منکا اور اکتارہ

ظلم کا بدلہ یہاں ملتا ہے، غافل نہ ہو ہرگز
جلا کے پروانے، پانی ہوتی ہے خود بھی شمع

گھاس کا تنکا پار لگائے، دریا ڈبوئے ہاتھ پکڑ
تھام دامن درویشوں کا اور بھاگ پرے تو شاہوں سے

ہوا خمیدہ، عقل مندا! اب تو غفلت میں نہ رہ
کج اگر دیوار ہو تو جاں کو خطرہ ہے سوا

فرق ہے صورت اور سیرت میں ورنہ ایک ہیں
خنجر و حنبر، مگر حنبر☆ کٹے خنجر چلے

کارِرواں! تیری عمر کی شام اب تو ہوگئی
اے قلیچ احمق! تو گھومے ہے اب تک نیم روز

☆ حنبر (حلق)

بخدا میں تو کسی سے دشمنی رکھتا نہیں
میرا دشمن ہوتا ہے جو ہوتا ہے دشمنِ خدا

دین و دل، ایمان، عقل و ہوش دلبر کو دے
سرمایۂ ہفتاد سن، چودہ سن نے چٹ کیا

آسان ہے ولایت، پر عاشقی کٹھن ہے
صاحبِ دل ہیں سیکڑوں، بیدل ہوا کوئی

ناز کرتے ہیں یہاں، وہاں وہ ناز کرتا ہے طلب
انجمن میں دوسرا ہے دوست، خلوت میں دگر

پاک گر حسن و عشق ہیں، کیسی پھر شرم و حیا
انجمن میں شمع پروانے سے ہوتی ہے بغل گیر

ہوں چیونٹی سا لیکن، میں رکھتا ہوں سلیمانی ہمت
کرتا ہوں اسیر شکر، خاک کو قناعت کر کے

چار من مطلوب پانی ہے غسل کے واسطے
ایک قطرہ کافی ہے دل کی صفائی کے لیے

فقیروں کی پڑی ٹھوکر تو شاہوں کی طرف بھاگی
ہے دولت تاجِ شاہی، شکل میں کشکولِ درویشاں

لاکھوں آئیں تو سخی بھی بن جاتا ہے بخیل
الف منفق☆ کو بھی منافق بنا دیتا ہے

فرق زاہد و عابد کا بتاؤں تجھے یار
زاہد کا عشق کام، کام عابد کا عشق ہے

☆ منفق میں اگر ایک الف کا اضافہ کیا جائے تو لفظ منافق بن جائے گا۔

پہلے خدا تھا، کچھ نہ تھا کہتے ہیں دانا لوگ
جب کچھ نہ تھا تو خدا کہاں تھا یہ بتا؟

دیکھو نکلا ہے آسمان کا دیوالیہ
دن کو بھی وہ دیا جلاتا ہے

نہ جاؤں گا سفر پر اب میں نے دل میں ٹھانی ہے
وطن میں ہی میسر ہے، مجھے جب سایۂ دیوار

بڑھاپے میں بنا شیریں سخن ہے قلیچ
شیریں دہنوں کے لب جوانی میں چوسے ہیں

قلیچ سخن میں بڑھ کر ہے سب عزیزوں سے
بخت یاور نہیں تو کس کام کا فضل و کمال

بنا کے خوبصورت خود کو، میں اکثر رات کو سوتا ہوں
مبادا خواب میں محبوب آئے اور میں نہ اسے بھاؤں

آنکھوں سے گھورتے ہیں فقط، دیکھتے نہیں
جو دیکھتے ہیں، وہ دیکھ کے، دیکھتے نہیں

نہیں مٹھائی کوئی خاموشی جیسی
جس سے چپک جائیں لب سے لب

نیستی کو میری ہستی تک تو رسائی نہیں
موت ہی مرگئی تھی جس وقت میں پیدا ہوا

ہر ایک کا مقدر خود لکھتا ہے جناب
لکھنے والا اچھا ہے، لکھے نہ خراب

خود کو مٹانے سے ہی آدمی تو بنتا ہے
صفر کا عدد لگاؤ تو ہندسہ دس گنا بڑھتا ہے

اگر دنیا میں رہے تنہا اور پاک رہے
مثل مسیح تو بالائے افلاک رہے

دلوں میں دائمی شادمانی ہے
شب بیداری بھی تو عمر ثانی ہے

جو لوگ خدا کے مرد سچے ہیں
مفلسی میں بھی دل کھول دیتے ہیں

عشق کا داغ نہیں ہے جس دل میں
شمعدان ہے وہ ایسا جس میں شمع نہیں

شعر گوئی بھی ہے اک کار دشوار
خون پیتا ہے اپنا تب بنیں اشعار

کذب بیانی ہے گناہ گفتار میں
مبالغہ آمیزی جھوٹ نہیں اشعار میں

موت سے تو سبھی ڈرتے ہیں
میں واجدؔ زندگی سے ڈرتا ہوں

میرا آج۔ بڑھاپے کے فائدے ونقصان

کچھ خبر بھی ہے تم کو، عمر مری طویل ہوئی کیسے یار
ہوں تندرست، کرتا رہتا ہوں دنیا کے میں کار

دانت سالم ہیں، ابھی سلامت ہیں مری آنکھیں
سیاہ رکھتا ہوں، سفید ہیں گرچہ میرے بال سرکار

چلوں، دوڑوں، چڑھوں، اتروں میں آسان
سنوں، دیکھوں، چباؤں، سنبھالوں گھربار

ستر برس بدن کی اور دل کی عمر سترہ
ہنسی خوشی سے طبیعت دائم رہے سرشار
ابھی نہ لاٹھی تھاموں، نہ سہارا لوں کسی کا
خدا کا شکر بجا لاؤں، اسی لیے صد ہزار
مختصر اس کے سبب بھی تم کو سناتا ہوں میں
پہلا فضل و کرم خاص سناؤں میں یار
اور وہ یہ کہ جوانی میں چلا سنبھل کر میں اکثر
نشے سے رہا گریزاں، کم کھاؤں ہر بار
ٹھیک وقت پر کھاؤں اور سادہ کھانا کھاؤں
سوؤں جاگوں سویرے، جیسے کرتے ہیں ہشیار
ہوسکے تو رہتا ہوں بندگی میں سدا مشغول
دُکھاؤں دل نہ کسی کا، دُکھی کی لوں خبر چار
دوسرا سبب رہیں خوش لوگ اور دیں دعائیں
کہ جیو ہزار برس، پاؤ عمر خضر ہر بار
زبانِ خلق کہتے ہیں ہوتی ہے نقارۂ رحمٰن
اس سے بڑھی عمر میری، راضی ہوا رب ستار
تیسرا یہ کہ رہوں کھلی ہوا میں ہمیشہ
نوکری کی وجہ سے میں بنا محنتی و ہوشیار
صد شکر گو طویل ہے عمر مگر رہتا ہوں خوش
تشویش ہے اولاد کی اور یہ فکر ہے دشوار
ہم خیال دوست و احباب جو تھے سب گئے
نہ صحبتی رہا باقی، سوچ نے دیا ہے مار

بڑھ گئے خرچ، آمدن تھوڑی، رسم و راہ قدیم
قحط نے آگ لگائی ہر سو، مہنگائی ہے قہار

اصل سے زیادہ بھر چکا ہوں بیسے کی قسطیں
ادا کرنی ہوں گی جب تک جینا ہے بیچ سنسار

امانتیں جو جو رکھیں فائدے کے لالچ میں
سود بھرنے کی اب نہ طاقت، کیسے اٹھاؤں بار

طویل عمر کے یہ ہیں، فائدے اور نقصان
جینا اور راضی رہنا دونوں بڑے آزار

صبر و شکر کے دو راستے، ہاتھ ہیں تیرے قلیچ
تھام دونوں، رہ خوش، بیٹھا رب کو پکار

میرے اور میرے خاندان کے متعلق معززین کی آراء

اس باب میں مرحوم مرزا قلیچ بیگ صاحب نے اخبارات اور رسائل میں شایع شدہ مضامین کے علاوہ اپنے ذاتی خطوط (جو کہ انگریزی، فارسی اور سندھی زبان میں تھے) سے اقتباسات دیے تھے اور کچھ عرصے بعد غیر سندھی اقتباسات کا سندھی ترجمہ بھی کیا تھا۔ سندھی سوانح عمری میں انگریزی اور فارسی اقتباسات کو غیر ضروری خیال کر کے، انگریزی و فارسی تحریروں کا سندھی ترجمہ سندھی میں لکھے خطوط کے ساتھ شامل اشاعت کیا گیا۔ اُردو ترجمے میں تمام تر خطوط اور اقتباسات سندھی سوانح حیات سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی اور معلومات کے لیے کہ کون سی تحریر، کس زبان سے ترجمہ ہو کر مرزا قلیچ بیگ کی اُردو سوانح حیات تک پہنچی، اشارات سے مدد لی گئی ہے۔ سندھی خط کے ترجمے کے آخر میں ایک ستارہ، فارسی ترجمے کے نیچے دو ستارے جبکہ انگریزی ترجمے کے خاتمے پر تین ستارے وضاحت کریں گے کہ اصل خطوط کن زبانوں میں لکھے گئے تھے۔

مخزن ''غنچۂ امید'' سے انتخاب۔

رسالہ ''صراط المستقیم''

فروری ۱۹۲۳ء

نہایت مسرت کی بات ہے کہ حکومت نے نئے سال کی خوشی میں جناب مرزا قلیچ بیگ کو ''شمس العلماء'' کا لقب عطا کر کے، مرزا صاحب کی بے پناہ خدمت کے اعتراف کا

ثبوت دیا ہے۔ شاید یہ دوسرے بزرگ ہیں جنھیں اس لقب سے سرفراز کیا گیا ہے۔ جناب مرزا صاحب کا وجود بابرکت درحقیقت نہ صرف اہلِ تشیع بلکہ سندھ کے تمام مسلمانوں کے لیے غنیمت ہے۔ انھوں نے سندھ کی جو علمی خدمت کی ہے اور کررہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ہم اس خوشی کے موقع پر شیعہ برادری کی طرف سے عموماً اور کارکنانِ رسالہ ''صراط المستقیم'' کی جانب سے خصوصاً، ہدیہ مبارک پیش کرتے ہیں۔

''سندھ گزیٹیئر''، والیوم ''ب'' سے انتخاب

ضلع حیدرآباد میں گو کم تعداد میں، مگر بڑے اعلیٰ کردار وعمل کے حامل گرجی افراد ہیں۔ یہ ان تین گرجیوں کی نسل سے ہیں، جنھیں قسمت نے گذشتہ صدی کی ابتداء میں سندھ پہنچایا۔ یہ معززین تھے، مرزا خسرو بیگ، مرزا محمد باقر بیگ اور مرزا فریدون بیگ۔ یہ سب طفلس شہر کے باشندے تھے جو کہ بچپن میں ایران اور روس کی جنگ کے دوران، کچھ رحم دل ایرانیوں کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ ان کے والد مارے گئے۔ اور یہ بعد میں سندھ کے میروں کے وکیلوں کے حوالے ہوئے، جنھوں نے انھیں سندھ پہنچایا۔ میروں نے ان کی قدر کی اور اعلیٰ مرتبے سے نوازا۔ ابتداء میں تو مرزا خسرو بیگ میروں کی جانب سے انگریز سرکار کے پاس وکیل بن گئے تھے جبکہ مرزا محمد باقر کے متعلق ڈاکٹر برنس کہتے ہیں کہ وہ میر مراد علی کے دست راست تھے۔ مرزا خسرو بیگ کا انتقال ۱۸۶۰ء میں ٹنڈو ٹھوڑو میں ہوا۔ انھیں میروں کے مقبروں کے قریب دفنایا گیا۔ ان کے بڑے بیٹے نے انگریز سرکار کے پاس بحیثیت اسسٹنٹ کمشنر ملازمت کی اور پھر ان کا پوتا بھی اس عہدے پہ فائز ہوا۔ مرزا فریدون بیگ جو دراصل عیسائی تھے اور ان کا نام ''سڈنی'' تھا، انھوں نے مرزا خسرو بیگ کی بیٹی سے شادی کی اور سات بیٹوں کے باپ بنے۔ ان میں سے ایک مرزا قلیچ بیگ ہیں جو ''تاریخ سندھ'' اور دیگر کئی کتابوں کے مشہور مصنف ہیں۔ یہ پورا خاندان، سندھ کے تمام خاندانوں میں اپنی علمیت اور فضیلت کی بناء پر مکرم ومحترم ہے۔ (☆☆☆)

سالانہ رسالہ ''گلدستہ'' کراچی

۱۹۲۱ء

مرزا قلیچ بیگ، مرزا فریدون بیگ کے سات بیٹوں میں سے ایک ہیں۔ مرزا فریدان بیگ، بچپن میں سندھ آئے، قسمت انھیں سندھ کے حاکم میر کرم علی کے پاس لائی جن کے زیر سایہ انھوں نے پرورش پائی اور بڑے ہوکر اسلام قبول کیا۔ حیدرآباد کے قریب ایک اسکول اور بمبئی کے الفنسٹن کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مرزا قلیچ بیگ نے سرکاری ملازمت حاصل کی۔ وہ عام اسکول ٹیچر سے ڈپٹی کلکٹر بنے اور اسی عہدے سے ۱۹۱۰ء میں ریٹائر ہوئے۔ انھیں ''قیصرِ ہند'' کا تمغہ اور حسن کارکردگی کی بناء پر وائسرائے کی طرف سے سرٹیفکیٹ بھی عطا ہوا۔ ان کی ان تھک محنت کی عادت، علم و ہنر کا شوق اور اپنے دیس سندھ کے لیے سچائی سے خدمت کا جذبہ، ان کی ساٹھ سالہ زندگی میں لکھی گئی تقریباً دو سو کتابوں سے عیاں ہے۔ یہ ایک بڑا مشکل اور شاندار کام ہے۔ کسی اور مصنف کو یقیناً اس قدر کام کرنے کے لیے ایک صدی درکار ہے۔ ہر ایک کی خواہش ہے کہ ہندوستان کے ہر حصے میں ایسے جوہر قابل ہوں جو ہندوستانی زبانوں کا سرمایہ بڑھائیں۔ مرزا قلیچ بیگ اس وقت ۶۸ سال کے ہیں، ان کے سات بیٹے ہیں جن میں سب سے بڑا نادر بیگ کراچی میں بحیثیت بیرسٹر مصروف ہے۔ (☆☆☆)

کلکتہ

۵، اپریل ۱۸۶۶ء

مشفق، مہربان من، مرزا فریدون بیگ!

سلامت۔

مجھے آپ کے تین خط وصول ہوئے۔ دو بمبئی اور ایک مدراس میں۔ میں فوراً ان کا جواب دینے سے قاصر تھا مگر جو کچھ آپ نے فرمایا، اس کے متعلق فوری

طور پر متعلقہ اہل کاروں کو لکھ دیا۔ مجھے یقین ہے کہ سر الیگزینڈر گرانٹ نے اس معاملے کے متعلق ایجوکیشنل انسپکٹر سندھ کو ضرور لکھا ہوگا۔ اور سچ پوچھیں تو میری اپنی خواہش ہے کہ آپ کے بیٹے بمبئی جا کر تعلیم حاصل کریں۔ میں آپ کے خط کا جواب فارسی میں نہیں دے سکتا مگر آپ مجھے ہمیشہ فارسی میں خط لکھیے گا کیونکہ آپ کی خوبصورت تحریر میں بغیر کسی دقت کے پڑھ لیتا ہوں۔ امید ہے کہ میں بذریعہ آگبوٹ، براستہ سندھو دریا اس مہینے کی چدرہ تاریخ کو ملتان کے راستے سے آؤں گا۔ اس وقت دہلی اور شملہ کا پروگرام ہے۔

آپ کا دوست

جی۔ ایف۔ گولڈسمتھ

(☆☆☆)

لائق صد تحسین، مرزا فریدون بیگ!

سدا خوش رہیں۔

آپ کے مورخہ ۱۹، ستمبر ۱۸۷۰ء کے تحریر کردہ خط کے حوالے سے جواب عرض ہے کہ میں واقعی دو سال کی رخصت پر بیرونِ ملک جانے والا ہوں۔ امید ہے کہ جو صاحب بھی محکمۂ تعلیم کا قلم دان سنبھالیں گے وہ آپ کے بیٹوں کی لیاقت و شرافت کو نظر میں رکھیں گے۔ اس معاملے میں آپ تسلی رکھیں۔

دستخط ہیڈ منشی

منجانب۔ جی۔ مور،
اسسٹنٹ کمشنر اور ایجوکیشنل انسپکٹر

(☆☆)

محکمہ تعلیم

نمبر ۷۰

۱۱، فروری ۱۸۶۴ء

قابل صد احترام مرزا فریدون بیگ صاحب!

سدا خوش رہیں۔

انگلش میڈیم اسکول کے استاد مسٹر وشنو گھنشام (حیدر آباد) کی رپورٹ کے ذریعے صاحب کو علم ہوا کہ آپ نے صاحب بہادر مہربان کرنل گولڈ سمتھ صاحب کے مشورے اور تجویز کے مطابق، اپنے دونوں فرزندوں کو بغرضِ تعلیم بمبئی بھیجنا قبول کیا ہے۔ اس بات کی خبر سنتے ہی صاحب نے بہت مسرت کا اظہار کیا کہ جس تجویز کا آپ نے خیر مقدم کیا ہے وہ بڑی فائدہ مند ثابت ہوگی۔ امید ہے کہ آپ جلد ہی اس کارِ خیر کی برکتوں سے فیض یاب ہوں گے۔ یہ خط آپ کی اطلاع کے لیے لکھا جا رہا ہے۔

آپ کی خدمت میں،

خداداد بخشی

اسسٹنٹ کمشنر

اور

ایجوکیشنل انسپکٹر

(☆)

ساؤتھ ویلس

۱۸، اپریل

میرے پیارے مرزا صادق علی بیگ!

یہ دو تین سطریں آپ کو بمبئی یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کرنے پر بطور مبارک باد لکھ رہا ہوں۔ آپ پہلے سندھی مسلمان ہیں جسے یہ عزت ملی ہے۔ آپ قابل مبارک باد اس

لیے بھی ہیں کہ ایک بار ناکام ہونے کے بعد، ہمت ہارے بغیر دوبارہ کوشش کی اور کامیابی حاصل کی۔ امید ہے کہ زندگی کی اس اہم کامیابی کے بعد دیگر کامیابیاں یکے بعد دیگرے آپ کی زندگی میں آئیں گی۔ مجھے امید ہے کہ اس ڈگری کے ساتھ آپ نے ایک بڑی تبدیلی کی بنیاد رکھی ہے جس کی تقلید اور پیروی دیگر مسلمان بھی کریں گے۔ آپ کے بھائی کو جو اپنی محنت کے باعث لائق تعریف ہیں، میرا سلام عرض کیجیے۔ امید ہے کہ اگلے موسم سرما میں، میں آپ کو دیکھنے آؤں گا۔

جی۔ مور

(☆☆☆)

۱۱ جولائی ۱۸۶۷ء

مرزا فریدون بیگ صاحب، زادلطفہ!

بخدمت فیض درجت، مہربان، عالیشان، بلند مکان

بعد از نیاز و سلام، عرض یہ ہے کہ جولائی کی ۱۳ تاریخ، ہمارے اسکول کے طلباء کے لیے تقریب تقسیم انعامات منعقد کی جا رہی ہے، جس میں کلکٹر صاحب اور جج صاحب بھی تشریف لائیں گے۔ امید ہے کہ آپ بھی، اس دن، چار بجے تشریف لا کر، مجلس کی رونق بڑھائیں گے۔

واسن۔ آبا جی۔ موڈک

(☆☆☆)

چہار باغ
بمبئی
۳، ستمبر ۱۸۷۴ء

پیارے مرزا قلیچ بیگ!

میں نے آج آ کر تمھارا خط دیکھا ہے۔ افسوس کہ ابھی تک بیماری نے تمھارا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔ میری صلاح ہے کہ تم میری پاس آؤ تا کہ میں تمھیں کوئی مناسب مشورہ دے سکوں ورنہ میں خود تمھیں کل صبح کالج آ کر ملوں گا۔

مرزا حیرت
(☆☆)

بمبئی
۲۳، جون ۱۸۸۰ء

میرے پیارے قلیچ بیگ!

میں تمھارے لکھے گئے چودہ تاریخ والے خط کے لیے نہایت مشکور ہوں اور یہ جان کر از حد خوش ہوں کہ تم نے مجسٹریسی کا امتحان پاس کرلیا ہے اور محکمہ روینیو میں ملازمت کی امید ہے۔ پرنسپل ہاتھارن تھویت کو میں نے تمھارے سلام پہنچادیے ہیں جواباً وہ بھی تمھیں سلام کہتے ہیں۔ تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ انھوں نے ڈائریکٹر صاحب کو تمھارے لیے سفارشی رقعہ لکھا ہے۔ امید ہے کہ وہ پُر اثر ثابت ہوگا۔ مجھے ہمیشہ تمھاری خوشی اور فتح یابی کا سن کر خوشی ہوگی۔

مرزا حیرت
(☆☆☆)

بمبئی

۱۸، اپریل ۱۸۸۱ء

میرے پیارے قلیچ بیگ!

مجھے تمھارا پہلی تاریخ کا لکھا خط ملا مگر مصروفیت اور بیماری کے باعث جلد جواب دینے سے قاصر رہا۔ مجھے ستار، خود اپنے لیے چاہیے۔ میری اس خواہش کے باعث جو تکلیف تم نے برداشت کی ہے، اس کے لیے میں تمھارا مشکور ہوں۔ میں نے تمھارے سلام پروفیسر ہاتھارن تھوبت اور آغا خان کو پہنچائے، انھوں نے بھی جواباً تمھیں سلام بھیجنے کے لیے کہا۔ شاید تم سن کر رنجیدہ ہو کہ اسی دن، ہز ہائینس آغا خان نے وفات پائی۔ زیادہ تفصیل اگلے خط میں لکھوں گا۔ ہمارے جتنے بھی دوست، تم سے ملیں، انھیں مری طرف سے سلام کہنا۔

مرزا حیرت

(☆☆☆)

بمبئی

۷، مارچ ۱۸۸۵ء

پیارے مرزا قلیچ بیگ!

تمھارا خط ملا۔ مہربانی۔ سرکاری طور پر اسسٹنٹ پروفیسر کی پوسٹ کے لیے سردست میرے پاس کوئی خبر نہیں۔ اس کے متعلق تم پرنسپل ورڈز ورتھ یا ڈائریکٹر کو براہ راست لکھ سکتے ہو۔ اس طرح تمھیں مطلوبہ معلومات حاصل ہو جائے گی۔ اگر اس معاملے میں مجھ سے کچھ پوچھا گیا تو میں بخوشی تمھاری مدد کروں گا۔

مرزا حیرت

(☆☆☆)

ایلفنسٹن کالج، بمبئی

۲۵، مارچ ۱۸۸۵ء

پیارے مہربان مرزا قلیچ بیگ!

اس کالج میں بطور فارسی اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہونے کا زیادہ امکان نہیں اور نہ ہی میں نے اس قسم کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ ابھی میں نے دو فیلوز کی تقرری کروائی ہے۔ ان میں سے ایک لازماً بی۔اے فارسی ہوگا جو یقیناً پروفیسر حیرت کی مدد کر سکے گا۔

ڈبلیو۔ ورڈز ورتھ

(☆☆☆)

نارفوک

۲۸، دسمبر ۱۸۸۸ء

میرے پاس یعقوب

تمھارا ۴، دسمبر کا لکھا خط ملا۔ پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ تمھاری چھوٹی بہن زلیخا کی شادی ہو رہی ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ وہ مجھے اپنی نرم مزاجی کے باعث کتنی عزیز تھی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ ایک اعلیٰ، صاحب حیثیت شخص کے ساتھ بیاہی جا رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ ایک اچھا، شریف النفس اور نرم دل شخص ہوگا اور وہ دونوں شادی کے بعد ایک اچھی، خوش و خرم ازدواجی زندگی گزاریں گے۔

یہ بھی پُر مسرت امر ہے کہ مرزا قلیچ بیگ نہایت تعلیم یافتہ شخص ہے اور مجھے قوی یقین ہے کہ وہ ضرور کسی اعلیٰ مقام پر فائز ہوگا۔ صرف ایک بات ہے جس کی وجہ سے طبیعت غمزدہ ہے کہ اگر میرے دوست، زلیخا کے والد زندہ ہوتے اور زلیخا کو اپنے ہاتھ سے رخصت کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ اکثر وہ مجھ سے زلیخا کی شادی کے متعلق ذکر کرتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ زلیخا کا رشتہ کسی اچھی جگہ طے ہو جہاں وہ سکھی رہے۔ خدا آپ سب کو خوش و خرم رکھے۔

میجر جنرل

جی۔ ڈبلیو۔ ہیول

(☆☆☆)

صاحب، مہربانِ من، جی، ڈبلیو، بیول

جو خط آپ نے مسٹر محمد یعقوب کو لکھا، اس خط کے لیے میں اور میری بیگم زلیخا جسے اب ہم "خیر النساء" کہتے ہیں، کی طرف سے شکریہ قبول کیجیے۔ میری بیگم کہہ رہی ہیں کہ "بچپن میں آپ نے جو مجھ پر مہربانیاں کیں، وہ مجھے اب تک یاد ہیں اور اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ ناکافی ہیں۔" جب آپ نے اسے دیکھا تھا، تب وہ ایک چھوٹی بچی تھی مگر اب وہ اٹھارہ سال کی جوان عورت بن چکی ہے۔ طبیعتاً بہت فرمانبردار اور نیک طبع ہے اور ہر طرح سے میری زندگی کی ساتھی بننے کے لائق ہے۔ مجھے امید ہے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہماری محبت اور دوستی وخوشی بڑھتی جائے گی اور اس دنیا میں ایک اچھی زندگی گزار جائیں گے۔ زلیخا آج کل انگریزی سیکھ رہی ہے، امید ہے کہ جلد ہی آپ کو انگریزی میں خط لکھنے کے قابل ہو جائے گی۔

آپ کا نیاز مند

قلیچ بیگ

(☆☆☆)

کلکٹر حیدرآباد کا خط کمشنر صاحب کے لیے

۱۹ جون، ۱۸۹۹ء

میں یہ درخواست اور ضروری کاغذات آپ کو بھیج رہا ہوں۔ درخواست گزار کے والد مرزا فریدون بیگ نے دوسرے مسلمانوں کے لیے مثال بن کر، اپنے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم سے نوازا ہے۔ اور ان کے بیٹوں نے اعلیٰ سرکاری ملازمتیں حاصل کی ہیں۔ لہٰذا میری سفارش ہے کہ آپ انھیں تعلقہ سکرنڈ یا بدین میں پندرہ سو ایکڑ زمین کے مالکانہ حقوق عطا کریں۔ قابلِ احترام مسٹر جیمس نے جو جواب عرض داروں کو ان کی درخواست پر دیا ہے، اس کے آخری فقرے کی بنیاد پر یہ سفارشی رقعہ آپ کو لکھا جا رہا ہے۔

ایچ۔ ایل۔ میولس

(☆☆☆)

کلکٹر کراچی کا خط کمشنر صاحب کی جانب

کراچی

۳۰ اکتوبر ۱۹۰۹ء

مرزا بیگ کی ریٹائرمنٹ کے بعد انھیں زمین کے مالکانہ حقوق دینے کے سلسلے میں، آپ کو ضروری کاغذات بھجوا رہا ہوں۔ آپ تو مرزا صاحب اور ان کی ملازمت سے بخوبی واقف ہیں۔ میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ میں کافی عرصے سے انھیں جانتا ہوں۔ وہ ایک باکردار، محنتی اور ایماندار افسر رہے ہیں۔ انھیں ''قیصرِ ہند'' کا تمغہ بھی مل چکا ہے۔ مجھے ان کی گوناگوں ضروریات کا ادراک ہے۔ ان کے ذرائع آمدنی محدود ہیں۔ چونکہ انھوں نے بہت دیانتداری سے ملازمت کی ہے لہٰذا وہ آپ کی خاص مہربانی وانعام کا مستحق ہیں۔

ایچ۔ ایل۔ میولس

(☆☆☆)

۲۸ اگست ۱۸۸۷ء

میرے عزیز مرزا قلیچ بیگ!

میرے لکھنے پڑھنے میں ذرا دیر لگ رہی ہے، اس کے باوجود آپ کے ظرافت آمیز خطوط پڑھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ آپ کے طرزِ حیات پر رشک آتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ میں بھی آپ کی طرح شہروں کے شور شرابے سے دور کوئی گوشہ آباد کرلوں اور آس پاس کا علاقہ اپنی جاگیر سمجھوں۔ لیکن اس کے باوجود بھی ہم نہیں چاہتے کہ آپ اپنی جوانی اور طاقت جنگل میں ضایع کردیں۔ بہرحال آپ کا فلسفہ قابلِ قدر ہے کہ قناعت اور توکل پر بھروسہ کرکے خوش رہنا چاہیے۔

آپ کی کتاب ''دل آرام'' پڑھ کر دل بہت خوش ہوا۔ بڑی پُر اثر اور درد بھری داستان ہے۔ عبارت بہت خوبصورت اور صاف ہے۔ آپ کی کتاب ''لیلیٰ مجنوں'' آپ

کے بھائی مرزا علی قلی نے گا کر سنائی۔ اگر اس پر ناٹک بنایا جائے تو عوام بہت پسند کریں گے۔ آپ کی تازہ شاعری مرزا جعفر قلی سے لے کر پڑھوں گا۔ ڈرامہ شکنتلا کا ترجمہ سندھی زبان میں کیوں نہیں کرتے؟

ہیرانند

(☆☆☆)

کراچی

۲۷، جولائی ۱۸۷۲ء

مرزا قلیچ بیگ کو، کچھ عرصے کے لیے ہائی اسکول حیدرآباد میں فارسی پڑھانے کے لیے چالیس روپے ماہانہ پر استاد مقرر کیا جاتا ہے۔

اے۔ایم۔ایچ۔ فلٹن
ایجوکیشنل انسپکٹر سندھ

(☆☆☆)

کراچی

۳۱، دسمبر ۱۸۷۲ء

میٹرک پاس کرنے کے ساتھ ساتھ ایلس پرائز جیتنے پر تمھیں بہت بہت مبارک باد۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ تم نے ایلفنسٹن کالج میں داخلہ لیا ہے اور امید کرتا ہوں کہ تم بھی اپنے بھائی مرزا صادق علی کی مانند اچھی تعلیم سے بہرہ مند ہو گے۔ مجھے تمھاری خیر و عافیت کی خبر سے ہمیشہ خوشی ملتی ہے۔ میں نے اپنی سرکاری حیثیت سے بھی ایک خط تمھیں ارسال کیا ہے، جس میں عندیہ یہ ہے کہ تمھیں ۲۰ روپے ماہوار کی سندھ اسکالرشپ ملتی رہے۔

اے۔ایم۔ایچ۔ فلٹن

(☆☆☆)

بمبئی، ایلفنسٹن کالج

۲۲، اپریل ۱۸۷۲ء

پیارے مسٹر صادق علی

آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں کہ کالج کے اساتذہ کی رائے کے مطابق، آپ کے بھائی مسٹر قلیچ خان کا چال چلن اور تعلیمی کارکردگی قابلِ اطمینان ہے۔ اس کے علاوہ اس کی حاضری بھی قابلِ تعریف ہے۔

ڈبلیو ورڈ زورتھ

پرنسپل

(☆☆☆)

کتاب کے متعلق کمیٹی کی رائے

حیدرآباد

۲۷، مئی ۱۸۷۹ء

ہم نے مرزا قلیچ بیگ کی کتابیں "مقالات الحکمت" اور بیکنس ایسیز (Bacon's Essay) کا ترجمہ اچھی طرح دیکھا ہے۔ مترجم نے ایک نہایت مشکل کام بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ہے۔ ترجمہ قابلِ تعریف ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تراجم شایع ہونے کے لائق ہیں۔

ریورنڈ۔ جی۔ شرٹ

غلام علی آخوند

تاراچند شوقی رام

(☆☆☆)

۱۱، اگست ۱۸۹۱ء

پیارے قلیچ بیگ!

لیمبس ٹیلس (Lamb's Tales) کا جو ترجمہ آپ نے کیا ہے وہ مجھے بے حد پسند آیا ہے۔ برائے مہربانی مجھے بتایئے کہ کیا اس کتاب کے حقوق چھ سو روپوں کے عوض حکومت کو فروخت کرنا پسند کریں گے یا نہیں؟

ایچ۔ پی۔ جیکب

(☆☆☆)

۱، ستمبر ۱۸۸۱ء

پیارے قلیچ بیگ!

مجھے آپ کی مختصر کتاب "لیئر آ ورس" ملی۔ جب آپ کی شاعری "سندھ نیوز" اور دیگر اخبارات میں شایع ہو رہی تھی، تب میں تازہ واردانِ کالج تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان اشعار میں سے، بہت سے میں اخبارات میں پڑھ چکا تھا مگر ان دنوں یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ آپ کی شاعری ہے۔ یہ بہت عمدہ شاعری ہے۔ سندھ کو آپ پر فخر ہونا چاہیے۔ کبھی کبھار میرے دل میں بھی خواہش ہوتی ہے کہ انگریزی میں شاعری کروں۔ مگر کسی دوست نے کہا کہ شاعری انسان صرف اپنی مادری زبان میں ہی کر سکتا ہے لہٰذا میں اس طرف نہیں آیا۔ سندھی بولی میں ایک مصرعہ مرتب کرنے کا بھی وقت نہیں ملتا اور سچ پوچھیے تو سندھی شاعری کے عروض کی بابت بھی کچھ نہیں جانتا۔ گویا سخن فہم ہوں سخن ور نہیں۔

دیارام گدومل

(☆☆☆)

ریورنڈ جارج شرٹ کی میرے بارے میں رائے

حیدرآباد

۱۶، ستمبر ۱۸۸۰ء

میں مرزا قلیچ بیگ اور ان کے خاندان کو گذشتہ دس برس سے جانتا ہوں۔ میں نہ صرف قلیچ بیگ بلکہ اس کے پورے خاندان کے چال چلن کی ضمانت دے سکتا ہوں۔ میں ان کی ترقی کے بارے میں بھی پوری طرح باخبر رہا ہوں۔ انھوں نے سندھ سے میٹرک پاس کرکے "ایلس پرائز" حاصل کیا بمبئی سے بی۔اے کیا مگر اس کا علمی قد کاٹھ ان ڈگریوں سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ ایک اعلیٰ کردار کے حامل، شریف اور ذہین انسان ہیں۔

جارج شرٹ

(☆☆☆)

ریورنڈ شیلڈن کی میرے بارے میں رائے

کراچی

۱۷، ستمبر ۱۸۸۰ء

میں بڑی مسرت سے یہ اظہار کرتا ہوں کہ میں مرزا قلیچ بیگ کو گذشتہ دو برس سے جانتا ہوں اور اس کی خاندانی شرافت اور اچھے چال چلن کی ضمانت دے سکتا ہوں۔ اس کے مستقبل کی فتح یابی کی نوید سن کر میں بہت خوش ہوں گا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ نہ صرف ذہین ہے بلکہ محنت کی شاندار عادت کا مالک ہے جو اسے اعلیٰ عہدوں کے قابل بنائے گی۔

جی۔ شیلڈن

(☆☆☆)

ایجوکیشنل انسپکٹر کا کمشنر صاحب کی جانب خط

۱۵اکتوبر ۱۸۸۰ء

یہ درخواست کمشنر صاحب کی قابل قدر توجہ کے لیے بھیجی جارہی ہے۔ درخواست گزار ایک تعلیم یافتہ اور شریف شخص ہے۔ اس نے محکمۂ تعلیم کی ملازمت کے دوران کراچی ہائی اسکول میں نو مہینے فارسی پڑھائی ہے۔ اس نے اپنا کام بہت خوش اسلوبی سے کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ محکمۂ ریوینیو کے لیے ایک سرمایہ ثابت ہوگا۔ واضح رہے کہ وہ مجسٹریٹی کا امتحان پاس کرچکا ہو۔

ٹی۔ ہارٹ ڈیویز

(☆☆☆)

کلکٹر کرنل والس کی رائے، میرے بارے میں

کراچی

۱۷ستمبر ۱۸۸۰ء

میں تقریباً گذشتہ ایک برس سے مرزا قلیچ بیگ کو جانتا ہوں۔ وہ ایک اعلیٰ گھرانے کا فرد ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ، شریف، خاندانی شخص ہے۔ اس نے مجسٹریٹی کا امتحان کامیابی سے پاس کیا ہے۔ اس کے علاوہ چودہ یا پندرہ ماہ کراچی کے مختلف مختیارکاروں کی آفیسوں میں کام سیکھنے کے لیے جاتا رہا ہے۔

کرنل آر۔ والس

کلکٹر کراچی

(☆☆☆)

اسسٹنٹ کمشنر کا خط، بنام کلکٹر شکارپور

کراچی

۲، نومبر ۱۸۸۰ء

میں جناب مرزا قلیچ بیگ کا آپ سے تعارف کروانا چاہتا ہوں یہ وہی صاحب ہیں، جن کے بارے میں کمشنر صاحب نے آپ کو سرکاری طور پر لکھا ہے میں سمجھتا ہوں کہ آپ ان کی شائستگی کی بناء پر انھیں پسند کریں گے اور کچھ عرصے کے لیے انھیں ''ہیڈ منشی'' کا کام سیکھنے کا مناسب موقع دیں گے۔ وہ ایک بہتر پوسٹنگ چھوڑ کر یہاں آ رہے ہیں اور ان سے وعدہ کیا گیا ہے کہ اگر وہ جلد کام میں مہارت حاصل کر لیں گے اور اچھی کارکردگی دکھائیں گے تو انھیں مختیار کار کی حیثیت سے کہیں تعینات کیا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بہت کم شرفاء اس عہدے کے لیے ہمیں مل سکتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شخص اور اس کے رشتہ دار شریف اور خاندانی ہیں۔

ا۔س۔ک۔آلیونٹ

(☆☆☆)

کراچی

۳۰، اگست ۱۸۸۳ء

مس قاسیٹ کی کتاب ''دستور المعاش'' کے ترجمے پر نظر ثانی کے لیے میں آپ کا شکرگزار ہوں۔ یہ ایک مشکل کام تھا جو آپ نے بخوبی کر دکھایا۔ مجھ سمیت کمیٹی کے دیگر ممبران کی یہ رائے ہے کہ جس طرح آپ یہ مشکلات حل کرتے ہیں، اس طرح کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ غلطیاں اور عیب گنوانا آسان ہے مگر ہماری خواہش تھی کہ آپ مسودہ آخری بار ضرور دیکھ لیں۔ اب چوں کہ آپ اس مرحلے سے گزر چکے ہیں تو ہم آپ کے شکرگزار ہیں۔ آپ نے یہ مشکل کام بہت ہوشیاری سے کیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف سندھی زبان کی کتب کی تعداد بڑھائے گی بلکہ دیگر کئی اسباب کی بناء پر بھی اہم سمجھی جائے گی۔

ایچ۔پی۔جیکب

(☆)

اسسٹنٹ کلکٹر، روہڑی کی رپورٹ سے انتخاب

۱۸۸۸ء

گھوٹکی کے مختیار کار مرزا قلیچ بیگ کی تعریف لکھتے ہوئے مجھے بہت خوشی محسوس ہورہی ہے۔ اس نے ایک بڑا تعلقہ بڑی خوش اسلوبی سے چلایا اور مجسٹریٹ کی حیثیت سے نام کمایا ہے۔ اس کا ثبوت، اس کے حل شدہ کیس ہیں۔ مجھے لوگوں کی طرف سے کئی عرضیاں وصول ہوئیں ہیں، جن میں انھوں نے یہ خواہش کی ہے کہ ان کے کیس مرزا قلیچ بیگ کے پاس حل کرنے کے لیے بھیجے جائیں۔

آر۔ ای۔ ایل مور

(☆☆☆)

کراچی

۲۸، اگست ۱۹۱۱ء

میرے پیارے مرزا قلیچ بیگ!

بیرسٹر مسٹر نارٹن (جو آج کل میر صاحبان کا کیس دیکھ رہے ہیں) کی خواہش کہ آپ انھیں اپنی تصنیف ''سندھ کی تاریخ'' تحفتاً بھجوائیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ ایک نسخہ خریدنے کی یقیناً استطاعت رکھتے ہیں لیکن ان کی خواہش ہے کہ مصنف خود یہ کتاب انھیں بطور تحفہ بھجوائے۔ میں نے انھیں کہا ہے کہ میں مرزا صاحب کو اس بارے میں خط لکھتا ہوں۔ مہربانی کرکے آپ انھیں کتاب بھجوایئے اور اس پر اپنی طرف سے تحفتاً بھیجے جانے کے کلمات بھی ضرور لکھئے۔

ہرچند رائے وشنداس

(☆☆☆)

کراچی

۱۱، ستمبر ۱۹۱۱ء

صاحب مہربان من!

آپ کی مہربانی کہ آپ نے اپنی تصنیف ''سندھ کی تاریخ'' کی دو جلدیں مجھے بطور تحفہ عطا کیں۔ میروں کے کیس کے سلسلے میں ان کتابوں نے قابلِ قدر مدد کی۔ میں نے اس میں سے جو کچھ ابھی تک پڑھا ہے وہ بہت پسند آیا ہے۔ بے شک یہ آئندہ بھی میرے کام آئے گی کتاب کے پہلے صفحے پر آپ کی تحریر دل پذیر نے اس کتاب کی قیمت کئی گنا زیادہ بڑھادی ہے۔

اردلی مارٹن

(☆☆☆)

کنڈیارو

۲۴، فروری ۱۸۹۹ء

آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ آپ خواتین ٹریننگ کالج کی ترقی و بہبود کے لیے کاؤنسل کے ممبر ہیں، جس کا کام ایجوکیشنل انسپکٹر کی مدد کرنا ہے۔ جتنا زیادہ کام آپ اس سلسلے میں کر سکیں، اتنا ہی ہمارے لیے بہتر ہوگا۔ جن خاص خاص باتوں پر غور و خوض کی ضرورت ہے، امید ہے کہ آپ ان پر خاص توجہ کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ اس معاملے میں آپ کی مدد ہمارے ساتھ رہے گی۔

ایس۔ ایچ کورٹن

ایجوکیشنل انسپکٹر

(☆☆☆)

میرے پیارے مرزا قلیچ بیگ!

تمھیں ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ سنبھالنے کی بہت بہت مبارک باد۔ یہ خبر سن کر میں بہت خوش ہوا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ افسران جنھوں نے میری طرح تمھاری سفارش حکام بالا کو بھجوائی تھی، شرمندہ نہیں ہوں گے۔

آر۔ جائلس

(کمشنر)

(☆☆☆)

۱۷، جنوری ۱۸۹۸ء

آپ کو اطلاعاً لکھا جارہا ہے کہ آپ کی تصانیف "چچ نامہ" اور "سندھ کی تاریخ" کے بارے میں سن کر ہمیں بہت خوشی ہوئی ہے۔ ہم بخوشی یہ کتابیں سرکاری چھاپہ خانے سے مفت چھپوائیں گے اور صرف پچاس نسخے افسران کو بھیجنے کے لیے اپنے پاس رکھیں گے۔

ایچ۔اے۔ایم۔جیمس

کمشنر

(☆☆☆)

میں تمھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ تم اپنا فارغ وقت ایسے اہم کام میں صرف کرتے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تمھارے برابر عہدے والے افسر کے پاس فرصت کے لمحات کس قدر مختصر ہوتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ دوسرے بھی تمھاری تقلید کریں گے۔

ایچ۔اے۔ایم۔جیمس

(☆☆☆)

پیارے قلیچ بیگ!

سرکار کے حکم پہ جو کمیٹی بنائی جا رہی ہے، کیا آپ اس میں ممبر بننا پسند کریں گے؟ اس بارے میں آپ کی رائے جاننے کا حکم ملا ہے۔ برائے مہربانی جلد از جلد بتایئے کہ کیا آپ اس کمیٹی کے ممبر بن کر حکومت کی مدد کرنا چاہیں گے یا نہیں؟

اے۔ جاکس
ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن

(☆☆☆)

برائٹن

۱۲، دسمبر ۱۹۰۲ء

پیارے قلیچ بیگ!

نئے سال کی مبارک باد لکھتے ہوئے، دعا کر رہا ہوں کہ تم ایسی بے شمار ساعتیں دیکھو۔ امید ہے کہ تم اپنے رشتے داروں اور دوستوں کے ہمراہ خوش و خرم اور صحت مند زندگی گزار رہے ہوں گے۔

کرنل الفریڈ میھو

(☆☆☆)

۸، جنوری ۱۹۰۶ء

پیارے مرزا قلیچ بیگ!

نئے سال کے آغاز سے ہی جو نام و مقام تمھیں ملا ہے، اس کے لیے مری مبارک باد قبول کرو۔ عام طور پر سندھ کے نصیب میں ایسی کامرانیاں و مرتبے نہیں ہوتے۔ مگر مجھے اس لیے بہت خوشی ہے کہ تم ان بہت کم خوش بختوں میں سے ایک ہو۔

ایچ۔ ایل۔ میولس

(☆☆☆)

کراچی

۵، جنوری ۱۹۰۶ء

میرے پیارے مرزا قلیچ بیگ!

"قیصرِ ہند" کا لقب ملنے پر میری مبارک باد قبول کریں۔ میرے ایک دوست نے کہا کہ مرزا صاحب نے "عمر خیام" کی رباعیات کا جو ترجمہ کیا ہے، صرف اسی کارنامے پر بھی وہ اس اعزاز کے مستحق تھے۔ باقی تصانیف بے شک نہ شمار کریں۔ میں آپ کو نئے سال کی مبارک باد دینے کے ساتھ ساتھ یہ دعا کرتا ہوں کہ جو عزت شہنشاہ ہند نے آپ کو عطا کی ہے، پروردگار اس میں مزید اضافہ کرے۔

ڈبلیو۔ این۔ رچرڈسن

(☆☆☆)

کراچی

۱۰، نومبر ۱۸۸۲ء

میرے پیارے مرزا قلیچ بیگ!

آپ کے خط کے حوالے سے مجھے بشپ کا جواب ملا ہے۔ وہ خط میں آپ کو بھجوا رہا ہوں برائے مہربانی اسے فوراً واپس بھجوائیے گا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ شادی کبھی نہیں ہو سکتی، کسی بھی طرح۔ مزید اس خط کو دیکھیے۔ زیادہ سلام۔

جی۔ بیمرج

(☆☆☆)

بشپ کے خط کا عکس

لاہور

میرے پیارے مسٹر بیمرج!

جو خط آپ نے مجھے بھیجا ہے، اسے لوٹا رہا ہوں۔ اس جیسا دل دکھانے والا خط میں نے اس سے قبل کبھی نہیں پڑھا۔ اس میں حضرت عیسیٰؑ کی خدائی، دائم قائم بادشاہت اور چرچ کے قوانین کی بڑی توہین اور بے ادبی کی گئی ہے۔ جو شخص حضرت یسوع مسیحؑ کو خدا کا بیٹا اور ہر شے کا والی نہیں مانتا، اس سے شادی کا تعلق، گویا کہ کسی کافر سے تعلق کے مصداق ہے۔ یہ ایک بے ایمانی کا کام ہے۔ کوئی بھی پادری جان بوجھ کر یا غفلت سے ایسی شادی نہیں کرنے دے گا۔ یہ محض دل کی خوشی یا ناخوشی کی بات نہیں بلکہ ایسا کرنا درحقیقت خدا کی بادشاہت کے دائم و قائم قوانین کو توڑنا ہے۔ پادریوں کو اس بارے میں سخت رویہ اپنانا ہوگا۔ ایسے نازک قانون کو توڑنا ایسا ہی گناہ ہے جیسا کہ زنا کرنا۔

(☆☆☆)

ریورنڈ شیپرڈ کا خط میر عبدالحسین کے نام

حیدرآباد

۱۴، اکتوبر ۱۸۸۲ء

یور ہائینس!

آپ کے خط کے جواب میں تحریر ہے کہ یہ سوال کہ مسلمان اور عیسائی کی شادی ہو سکتی ہے یا نہیں؟ کچھ عرصہ قبل اٹھایا گیا تھا۔ میری جگہ پر جو پادری صاحب تھے، ان کا حکم تھا کہ ایسی شادی کی منظوری نہ دی جائے۔ اگر آپ کا دوست اور وہ عورت جس سے وہ شادی کا خواہش مند ہے، اسلامی شرع کے مطابق نہیں بلکہ کرسچن رسم کے مطابق شادی کرنا چاہیں تو حیدرآباد کے کلکٹر کے سامنے سول نکاح کر سکتے ہیں۔

ٹی۔ سی شیپرڈ

(☆☆☆)

۲۶، جنوری ۱۸۸۵ء

پیارے مسٹر قلیچ بیگ!

آپ کا ۲۱، مارچ کا لکھا خط، مجھے کل ملا۔ اس خط کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں مجھے افسوس ہے کہ آپ اپنی پسند کی شادی کرنے میں کامیاب نہیں ہو پائے۔ جس لڑکی سے آپ کو اس قدر محبت تھی، اسے چھوڑنے سے آپ کو کتنی اذیت ملی ہوگی۔ اس کے باوجود اتنا ضرور کہوں گا کہ مسٹر مری جیسے سسر کے ساتھ گزارا بہت مشکل ہوتا۔ امید ہے کہ جلد ہی ہماری ملاقات ہوگی۔

والسلام

آپ کا دوست

جارج شیپرڈ

(☆☆☆)

سورت

۱۰، دسمبر ۱۹۰۶ء

پیارے قلیچ بیگ!

اللہ نے تمھیں جو صلاحیت ودیعت کی ہے اور تم نے جو اس سے بے مثال کام لیا ہے وہ مجھے شرمندہ کرتا ہے۔ میں بھی اپنے فرصت کے لمحات مثبت کام میں لگانا چاہتا ہوں مگر تمھارے جتنا کام کرنا ممکن نہیں۔ اس بات میں تم سب سے بازی لے گئے ہو۔ خدا کرے تم اپنے لیے اور اپنے دیس کے لیے لمبی عمر پاؤ۔ لیکن اگر تم مجھ سے پہلے چلے گئے تب بھی میں تمھاری محنت کا پھل دنیا کے سامنے ضرور رکھوں گا۔

دیارام گدومل

(☆☆☆)

لندن سوسائٹی کا خط میرے نام

لندن

۱۱، جولائی ۱۹۰۷ء

لندن کی سوسائٹی آف آرٹس کی جانب سے، یہ خط آپ کو اس لیے تحریر کیا جا رہا ہے تا کہ آپ سے رائے لی جا سکے کہ کیا آپ پسند کریں گے کہ آپ کا نام لندن سوسائٹی آف آرٹس کے مددگاروں کی فہرست میں شامل کیا جائے؟ اگر آپ سوسائٹی کی مدد کرنا پسند کریں تو مجھے اطلاع کریں تا کہ آپ کے انتخاب کا مناسب بندوبست کیا جا سکے۔

ایچ۔ ٹرومن ووڈ

سیکریٹری

(☆☆☆)

لندن

۱۱، جولائی ۱۹۰۷ء

میرے پیارے قلیچ بیگ!

آپ کا ۱۲، جون کا تحریر کردہ خط مجھے ملا۔ آپ کا شکریہ۔ میں اب بھی ہندوستان کے مسلمانوں کی بہتری و ترقی کے متعلق لکھنے میں مصروف ہوں۔ اس کام میں مجھے بہت وقت لگ گیا کیونکہ میں صرف فرصت کے لمحات میں ہی لکھ پاتا ہوں۔ فی الحال میں "شرع محمدی" کی دوسری جلد کے تیسرے ایڈیشن کی تیاریوں میں ہوں کیونکہ یہ کتاب اب مارکیٹ میں دستیاب نہیں۔ اسے مکمل کرنے کے بعد میں ایک تاریخی واقعہ پر کام شروع کروں گا۔

آپ کا خیر خواہ امیر علی

(☆☆☆)

۱۹۰۶ء

بادشاہ سلامت کی آخری سالگرہ والے دن کراچی میں، سرکاری رہائش گاہ پر ایک جلسہ منعقد ہوا تھا۔ اس جلسے میں مسٹر ینگ ہسبنڈ کمشنر نے اپنے افسران کو وہ تمغے عطا کیے جو انھیں گذشتہ نوروز کے موقع پر ملے تھے۔ تقریر کے دوران کمشنر صاحب نے ہمارے دو نامور مرزا صاحبان کے بارے میں کہا کہ، "اس کے بعد، میں کوٹری کے ڈپٹی کلکٹر، مرزا قلیچ بیگ کا نام پیش کرتا ہوں جنھیں قیصر ہند کا تمغہ ملا ہے۔ وہ قابل، ایماندار اور تجربہ کار سرکاری ملازم ہیں اور شاید علمیت کے معاملے میں وہ اس سے بھی زیادہ نامور ہیں (تالیاں)۔ ان کی ذاتی تصانیف بھی ہیں اور اس کے علاوہ انھوں نے کئی قدیم فارسی کتب بھی ترجمہ کی ہیں جن میں سے ایک "سندھ کی تاریخ" ہے۔

مرزاؤں کا خاندان اصل میں جارجیا کا ہے۔ ان کی ایک عجیب تاریخ ہے۔ وہ اپنی عزت وشان آج کی نسل تک برقرار رکھتے چلے آرہے ہیں۔ ان میں سے، میں فقط دو کا ذکر کروں گا، جنھیں آج تمغے ملیں گے۔ دوسرے ان کے بھائی مرزا صادق علی ہیں جو ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر تھے اور کچھ ہی عرصہ پہلے ریٹائر ہوئے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ پہلے سندھی تھے جنھوں نے بی۔اے کی سند حاصل کی اور ان کی کوششوں سے سندھ کی تعلیم میں کافی بہتری اور اضافہ ہوا۔ یہ کس قدر دل شکنی کی بات ہے کہ مرزا صادق علی بیگ جیسا شخص جو نہایت قابل ہے اور جس نے بڑی محنت سے ملازمت کی، اسے فقط "خان صاحب" کا لقب ملے اور ان سے کہیں کم لیاقت والے افراد کو "خان بہادر" اور "رائے بہادر" کے القاب دیے جائیں۔ مقابلہ بازی نفرت کو جنم دیتی ہے مگر کبھی کبھی اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔" (☆☆☆)

شملہ

۱۰، اپریل

میرے پیارے مرزا!

"برنس فارن بائبل سوسائٹی" کا سیکریٹری آپ کے لیے تازہ شائع شدہ "بائبل" کا ایک نسخہ بھیج رہا ہے۔ امید ہے کہ آپ قبول کریں گے۔ آپ نے "انجیل" کے ترجمے میں جو مدد کی ہے یہ اس احسان مندی کے جذبے کی ایک معمولی نشانی ہے۔ "بائبل سوسائٹی" مناسب انعام یا معاوضہ بھی دینا چاہتی ہے۔ امید ہے کہ آپ قبول فرمائیں گے۔ لیکن اگر علم اور مذہب کے حوالے سے، آپ نے یہ کام بلا معاوضہ کیا ہے تو سوسائٹی، اس کار خیر کی قدر دانی کرتے ہوئے شکر گزار ہوگی نیز آپ کی خوشیوں اور خیر و عافیت کے لیے دعا گو۔

جوزف ریڈمن

(☆☆☆)

ایجوکیشنل انسپکٹر کا خط میرے نام

حیدرآباد

۲۰، ستمبر ۱۹۰۸ء

پیارے مرزا!

میں آج کل ایک اہم سرکاری کام کے سلسلے میں حیدرآباد میں ہوں اور اگلے ہفتے تک یہیں رہوں گا۔ مجھے آپ سے ملنے کی خواہش ہے۔ کیا آپ کسی دن وقت نکال کر مجھ سے ملنے آسکتے ہیں یا نہیں۔ جس قدر جلدی ممکن ہو، اتنا اچھا۔ اگر آپ ملاقات کے لیے آسکیں تو برائے مہربانی مجھے اپنے آنے کا دن اور وقت قبل از وقت بتائیے گا تاکہ میں آپ کے لیے منتظر رہوں۔

اے۔ جی رائیف

(☆☆☆)

آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ حکومت نے آپ کو نویں جماعت کی سندھی نصابی کتابوں کی اصلاح کرنے والی کمیٹی کا ممبر مقرر کیا ہے۔ میں ڈائریکٹر صاحب کی جانب سے آپ کو شکریہ کا خط تحریر کر رہا ہوں کیونکہ آپ نے بلا معاوضہ یہ کام کرنے کی ذمے داری اٹھائی ہے۔

اے۔ جی رائیٹ

(☆☆☆)

''سندھ گزیٹیئر'' جلد ''الف'' سے انتخاب

حکومت کے تعاون سے سندھ میں انگریزی زبان کی تعلیم شروع ہونے کے بعد نصاب کے لیے کئی طرح کی کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ کچھ کتابیں انگریزی سے سندھی زبان میں ترجمہ ہوئیں اس کے علاوہ سنسکرت اور فارسی کتابوں کے ترجمے بھی سندھی میں ہوئے جو بہت فائدہ مند ثابت ہوئے۔ اس طرز پر مرزا قلیچ بیگ نے بہت سی کتابیں لکھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ''چچ نامہ'' اور ''سندھ کی تاریخ'' کو انگریزی کے قالب میں ڈھالنے سے، ان لوگوں پر جو سندھی زبان سے نابلد ہیں، بڑا احسان کیا ہے۔ (☆☆☆)

کراچی سے شائع ہونے والی ایک اخبار سے انتخاب

ہمیں انگریزی شاعری کی ایک کتاب ملی ہے، جو نصیر آباد کے مختار کار مرزا قلیچ بیگ نے لکھی ہے۔ مسٹر مرزا کی یہ قابلیت قابل تعریف ہے کہ وہ روینیو اور مجسٹریٹی جیسی اہم ذمہ داریوں میں مصروف ہونے کے باوجود شاعری کے لیے وقت نکالتے ہیں۔ جو اشعار اس

کتاب میں موجود ہیں، ان سے ان کی تخیل پرواز اور نازک خیالی کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ اگر انھیں شاعری کے لیے فرصت مل پائے تو یقیناً بہت عمدہ اشعار کہیں گے۔ ان کی سندھی شاعری میں اس قدر مٹھاس، روانی اور جادوئی اثر ہے کہ سندھی عوام نہ صرف اسے بہت پسند کرتے ہیں بلکہ اس کی قدر بھی کرتے ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی کافیاں اور بیت بالائی سندھ میں اس قدر معروف ہیں کہ قصبوں، دیہاتوں کے عوام انھیں شوق سے گاتے ہیں۔

مرزا قلیچ بیگ کو فارسی، انگریزی اور سندھی زبانوں پر مکمل عبور حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان جیسا تعلیم یافتہ اور روشن خیال فرد شاید ہی کوئی دوسرا اہلِ سندھ ہو اس کے باوجود بھی یہ عجیب بات ہے کہ مسٹر ارکسن کمشنر کو شبہ تھا کہ مسٹر قلیچ بیگ انگریزی پوری طرح نہیں جانتے۔ اس کا سبب بھی واضح ہے اور وہ یہ کہ مرزا قلیچ بیگ میں بناوٹ نہیں۔ وہ ایک صاف مزاج اور آزاد طبع شخص ہیں اور خوشامدیوں سے سخت نالاں۔ ان میں وہ عادت و کمزوریاں نہیں جو کہ سرکاری ملازمین میں عام ہوتی ہیں اور جن کی وجہ سے وہ اپنے بالا افسروں کی توجہ کا مرکز رہتے ہیں اور فائدے بٹورتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مرزا قلیچ بیگ کو ایسی جگہ پر چھوڑ دیا گیا ہے جہاں وہ گمنام رہے جبکہ ان کے دوسرے ہم مذہب جو اہلیت میں ان سے کمتر اور لالچی مزاج ہیں، ان پر حکومت کی نوازشات رہتی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ صاحب ارباب و اختیارات اس عالم و فاضل، قابلِ قدر مرزا صاحب کی سچی محنت اور لیاقت کی قدردانی کریں گے۔ (☆☆☆)

کراچی سے شایع ہونے والے ''سندھ گزیٹ'' اخبار سے انتخاب

ایک فاضل یوروپین نامہ نویس کا کہنا ہے کہ ''عمر خیام'' کی رباعیات کا جو انگریزی ترجمہ ''فٹز جیرالڈ'' نے کیا ہے، اس کی قدردانی دیکھ کر، مرزا قلیچ بیگ نے کچھ فارسی شعراء کی رباعیوں کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ جو لوگ ایران سے واقف ہیں، ان کے علم میں ہوگا کہ اہل ایران کی اکثریت نے تو عمر خیام کا نام تک نہیں سنا۔ البتہ ''سعدی'' اور ''حافظ'' کے علاوہ کچھ

اور شعراء کے نام عام ہیں۔ اس بات سے یہ اندازہ نہیں لگانا چاہیے کہ مرزا قلیچ بیگ نے تمام قدیم شعراء کا کلام انگریزی میں منظوم ترجمہ کیا ہے کیونکہ ایسا کرنے کے لیے انھیں باقاعدہ ایک کتب خانے کی ضرورت پڑے گی۔ اگرچہ انھوں نے کم فارسی شعراء کا ترجمہ کیا ہے مگر اس کے باوجود بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے سچے ہیرے جواہر جمع کیے ہیں۔ کہیں کہیں روانی ذرا کم ہے مگر بعض اوقات فٹز جیرالڈ والی تجلی بھی دکھائی دیتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ منظوم ترجمہ بھرپور اور رواں ہے۔ بہت کم مقامات پر رواجی ترجمہ محسوس ہوتا ہے مگر اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزی زبان و اعلیٰ شاعری میں وہ کامل ہے۔ پرائی زبان میں ایک مسلمان سرکاری افسر اس پائے کی شاعری کرے، اس سے ایک ثبوت اور ملتا ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے بارے میں یہ رائے کہ وہ بہت قابل یا ذہین نہیں، غلط ہے۔

''فینکس'' اخبار سے اقتباس

۱۹۱۳ء

سندھ کے تعلیم یافتہ افراد نے سندھی بولی کی ترویج یا کتابیں لکھنے کی جانب توجہ کرنے میں بڑی کوتاہی برتی ہے۔ اور افسوس کہ اب تک بیداری کی کوئی علامت نہیں۔ اس بات کا بہت افسوس ہے۔ ان میں صرف ایک شخص منفرد و یکتا ہے، اور وہ ہے مرزا قلیچ بیگ، سٹی ڈپٹی کلکٹر۔ دوران ملازمت بھی وہ مسٹر وٹ کی مانند، آفیس کے کام کاج سے فراغت کے بعد کتابیں لکھنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اب جب کہ اس قدر تھکانے والی ملازمت کے بعد آرام کے لمحات میں ہیں، جس کے وہ حقدار بھی ہیں، تب بھی علمی کام کرنے کی وہی لگن و جستجو ہے۔ کئی سندھی کتابیں تصنیف کر چکے ہیں، بڑا نام کمایا ہے اور کمال یہ ہے کہ جوں جوں عمر بڑھ رہی ہے، شوقِ تصنیف بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ اس لیے ہمیں امید ہے کہ وہ ابھی مزید کئی کتابیں لکھیں گے۔ ان کی آخری تصنیف ایک مختصر کتاب ہے، جس کا نام ''آرام بعد از آزار'' ہے۔ یہ ایک ہی مصنف کی دوسری کتاب ہے جو مرزا صاحب نے ترجمہ کی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ مرزا صاحب کی یہ کتاب لوگ بہت شوق سے پڑھیں گے۔ (☆☆☆)

حکومتِ بمبئی کا میرے نام خط

بمبئی

۲۴، جولائی ۱۹۱۴ء

پیارے مرزا!

بموجب ہدایات، یہ سرکاری حکم آپ کو آج کی ڈاک سے روانہ کر رہا ہوں۔ یہ دراصل اطلاع ہے کہ آپ کو "گورنر ان کاؤنسل" (جس کا کام سندھ میں مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں غور وخوض کرنا اور تجاویز دینا ہے) کا ممبر مقرر کیا گیا ہے۔

جی ایل ریو

سیکریٹری

(☆☆☆)

"نیو ٹائمس" اخبار کراچی سے انتخاب

۳۱، جولائی ۱۹۱۷ء

عصر حاضر کی سندھی شعراء میں سے مرزا قلیچ بیگ نے ہمیں کچھ اشعار دیے ہیں جن میں سچے شعراء والی قوت موجود ہے۔ ڈرامہ نگاری شاید ان کے مزاج کے موافق نہیں۔ ان کے تحریر کردہ ناٹک زیادہ تر تراجم میں جن میں مختلف جگہوں پر شاعری بھی شامل کی گئی ہے۔ ان کے کئی اشعار میں قدیم صوفی شعراء والی خوشبو موجود ہے۔ محبت کی جدا جدا صورتوں کو بیان کرتے ہوئے، نہایت عمدہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں، وہ صرف لفظیات کے ماہر نہیں بلکہ سوز دروں کے مالک بھی ہیں۔ خود محبت کے اسیر رہے ہیں اور سخت دل محبوب سے خیالی اڑان کے ذریعے تصوراتی ملاقاتیں بھی کی ہیں۔ (☆☆☆)

"انجمن اسلام" لاڑکانہ کی جانب سے میرے اعزاز میں کی گئی تقریر

مدرسہ ہال

۸، نومبر ۱۹۱۵ء

ہم جناب صدر اور ممبر "انجمن اسلام" لاڑکانہ کی جانب سے اس شہر کے مسلمانوں کی طرف سے آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہمیں یہ موقع دیا کہ ہم شہر کے معززین کے ساتھ مل کر آپ کی تعریف و توصیف کریں اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل و دماغ کو جو عجیب قوتیں عطا کی ہیں، اور جنھیں آپ نے خلق خدا کے فیض و فائدے کے لیے استعمال کیا، اس کے لیے آپ کو شکریہ کہیں۔ حالانکہ آپ کو گوشہ نشین رہتے ہوئے علمی مصروفیت میں مشغولیت پسند ہے، اس کے باوجود بھی ہمیں علم ہے کہ آپ نے حکومت کے مختلف محکموں میں کئی سال نوکری کی ہے اور پھر باعزت ریٹائر ہوئے ہیں۔ اپنے کردار و کارناموں کے ذریعے آپ نے حکومت اور سندھ کے عوام سے جو محبت و احترام حاصل کیا ہے وہ طویل عرصے تک زندہ رہے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی بھی قوم کی ترقی، اس کی زبان پر منحصر ہوتی ہے یا اس سے تعلق رکھتی ہے، اس لیے سندھ کے سرمایہ کو بڑھانے کے لیے کتابیں تصنیف کرنے کا جو کارنامہ آپ نے سرانجام دیا ہے اس کی قدردانی اور شکر گزاری ہم پر واجب ہے۔ ہم امید کرتے ہیں اس بنیاد پر سندھ میں علمی کام بہتر سے بہتر ہوتا جائے گا۔ آج کل کے تحرک کے زمانے میں، جب خاموشی سے محنت کرنے کی سخت ضرورت ہے، ہماری خواہش ہے کہ آپ ہماری کاؤنسل کی ممبرشپ قبول کریں تا کہ آپ کے تجربے و صلاحیتوں سے لوگ اور حکومت مستفیض ہوں۔ ہم آپ کی طویل عمری وصحت وسلامتی کے لیے دعاگو رہتے ہیں کہ آپ کی ذات سے خلق خدا کا بھلا ہو رہا ہے۔

آپ کے دوست اور خیر خواہ
انجمن کے پریزیڈنٹ اور دیگر

(✩)

پیارے مرزا قلیچ بیگ!

''سندھ کرسچن لٹریچر کمیٹی'' کی جانب سے توریت کی ''کتاب پیدائش'' کا جو آپ نے سندھی ترجمہ کیا ہے، اس کے لیے ہم آپ کے شکرگزار ہیں۔ آپ نے جس کشادہ دلی سے یہ علمی مدد کی ہے، اس کے لیے ہم آپ کی دل سے قدر کرتے ہیں۔

آپ کا سچا دوست

ٹی۔ مسکانی

(☆☆☆)

دیوان ٹیکچند۔ آئی۔ سی۔ ایس کے لیکچر سے انتخاب
(سندھی زبان کے ماخذ کے متعلق)

آپ تمام افراد کو چاہیے کہ سندھی زبان سے محبت کریں۔ کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی مادری زبان کی ترقی و ترویج کے لیے کام کریں۔ مرزا قلیچ بیگ کی پیروی کریں، جس نے سرکاری ملازمت کے دوران بھی تین سو سے بھی زیادہ کتابیں تحریر کیں۔ جن میں سے کچھ تو یادگار رہیں گی۔ (☆☆☆)

وائسرائے ہند کا شہنشاہِ برطانیہ کی جانب سے میرے لیے سرٹیفکیٹ

۱۲، دسمبر ۱۹۱۱ء

ہز ایکسیلنسی وائسرائے اور گورنر جنرل کے حکم سے یہ سرٹیفکیٹ شہنشاہِ ہندوستان جارج پنجم کے نام دربارِ دہلی میں، مرزا قلیچ بیگ کو دیا جاتا ہے۔ جنھوں نے سندھی زبان میں کتابیں لکھ کر ہماری اہم مدد کی ہے۔ (☆☆☆)

کراچی

۲۷، جولائی ۱۹۲۳ء

پیارے مرزا!

آپ نے رسالے "ہندوستان غریب ہو رہا ہے کیا؟" کا سندھی زبان میں جو ترجمہ کیا ہے، اس کے لیے کمشنر صاحب آپ کے بہت ممنون ہیں۔

اے۔ سی۔ گرین

اسسٹنٹ کمشنر

(☆☆☆)

کمشنر صاحب کا میرے لیے خط

کراچی

۱۶، فروری

پیارے مرزا!

"امن سبھا" کے لیے کتابیں لکھنے اور مرتب کرنے میں آپ نے جو قابلِ قدر مدد کی ہے، اس بارے میں کمشنر صاحب آپ سے بے حد خوش ہیں۔ وہ دربار میں یہ آفرین نامہ اور سونے کی گھڑی آپ کو بطور تحفہ دینا چاہتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ آئندہ بھی آپ اس سلسلے میں معاون و مددگار ثابت ہوں گے۔

جی۔ ایل۔ ریو

کمشنر

(☆☆☆)

میر فیض محمد خان والیٔ خیرپور کا میرے لیے فارسی زبان میں تحریر کردہ خط

جانِ بہادر!

سدا سلامت رہو۔

عالیجاہ، رفیع جائگاہ، مخلص و مہربان مرزا قلیچ بیگ

اپنے معتبر خدمتگار غلام رسول کے ذریعے آپ کی سچائی اور مروت کی بہت تعریف سنی ہے۔ مجھے سن کر حیرت اس لیے نہیں ہوتی کہ میں جانتا ہوں کہ آپ آباؤ اجداد کے زمانے سے اس خاندان کے خیرخواہ ہیں۔ اب اس شخص کے ہاتھوں، میں یہ خط آپ کو بھیج رہا ہوں۔ یہ جو کچھ کہے اسے میرا زبانی پیغام سمجھئے گا۔ جس کام کے لیے کہے، کوشش کر کے کر دیجیے۔ میں عمر بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔

والسلام بندۂ خدا

فیض محمد

(☆☆)

مرزا قلیچ بیگ خان!

سلامت۔

عالیجاہ، رفیع جائگاہ، دوست مہربان، خیرخواہ از آباء و اجداد

آپ دوستوں کو اچھی طرح علم ہے کہ ہم نے عالیجاہ، خان بہادر، قادر داد خان کو حکومت سے اپنی وزارت اور رعایا کی آسائش کی غرض سے حاصل کیا تھا۔ مگر اب اس ریاست کی رعایا ان سے ناراض اور افسردہ ہے۔ اس مرحلے پر آپ کو اس خاندان کا خیرخواہ سمجھتے ہوئے بطور مشورہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا آپ اس مہربان۔ یا اسی شخصیت خان بہادر کی معرفت "وزیر" کے عہدے پر فائز ہونے کے لیے تیار ہیں؟ نہ معلوم آپ یہ پیش کش قبول کریں گے یا نہیں۔ برائے مہربانی اپنی رائے سے آگاہ کریں۔

والسلام

بندۂ خدا

فیض محمد

(☆☆)

دوست، مہربان، خیر خواہ قدیم، مرزا قلیچ بیگ صاحب!

سلامت۔

معتبر ملازم غلام رسول کو آپ کی خدمت میں، آپ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بھیجا جارہا ہے۔ برائے مہربانی اپنی خیر و عافیت کی اطلاع دیں تاکہ اطمینان رہے۔ اس کے علاوہ جو بات بھی وہ آپ سے کہے، اسے درست سمجھیے گا۔

زیادہ خیر

بندۂ خدا و آل عبا

فیض محمد

(☆☆)

اخبار ''الحق'' سکھر

۲۹، جولائی ۱۹۱۱ء

اخبار ''الحق'' میں ایک خط شایع ہوا ہے جس میں شکایت کی گئی ہے کہ پڑھے لکھے لوگ اور شاعر حضرات خوانخواہ ''عشق'' کے موضوع پر قلم فرسائی کرتے رہتے ہیں لیکن مولانا حالیؔ کی طرح قوم کی تنزلی کی حالت زار اور اس کی ترقی کے لیے لوگوں کو بیدار کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ایسے پڑھے لکھے لوگ اور شاعر ''حیوان ناطق'' کے لقب سے پکارے گئے ہیں۔ غلطی سے محترم مرزا قلیچ بیگ کا نام بھی دیگر قابلِ احترام ناموں کے ساتھ اس یادداشت میں شامل ہے۔ اس حوالے سے میں یہ بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنی قوم کی دینی و اخلاقی ترقی کے لیے جتنی کتابیں اپنے مصروف ترین وقت سے، فرصت کے لمحات نکال کر، مرزا قلیچ بیگ صاحب نے تحریر کی ہیں، اتنی سندھ میں کسی اور نے تحریر نہیں کی ہوں گی۔ اس موضوع پر مرزا صاحب نے نہ صرف نثر میں بلکہ نظم میں بھی ایک قابل قدر کام کیا ہے۔ بلاشبہ عشق کے متعلق شعر بھی اپنے کسی خاص لمحے میں گرفتِ قلم سے آزاد ہوا ہوگا مگر یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ

محض اس بے مقصد موضوع پر مرزا صاحب نے شاعری کی ہے۔ کچھ ہی عرصہ قبل مرزا صاحب نے مولانا حالی کے اس مضمون کا ترجمہ بھی کیا تھا جو مسٹر دہلوی صاحب نے شایع کیا اور کئی لوگوں نے اسے پڑھا بھی ہوگا مگر شاید ہمارے نامہ نگار کی نظر سے نہیں گزرا۔ سردار محمد یعقوب صاحب کے کہنے پر بھی ایک نظم شایع کی گئی ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ، اس مضمون کے سوا بھی مرزا صاحب نے خاصی شاعری کی ہے۔ (☆)

اخبار ''الحق''، سکھر
۵،اکتوبر ۱۹۱۲ء

عالیجاہ مرزا قلیچ بیگ صاحب کو سندھ کے باسیوں سے متعارف کروانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ان کی مرنجانِ مرنج طبیعت، خوش خلقی، راست بازی و دیانت داری نے انھیں جو اعلیٰ مقام عطا کیا ہے، اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ ہمارے ہم وطن ہندو بزرگ بھی انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس بزرگ کی قابلیت اور علم دوستی کی بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ سندھ میں آج تک کوئی ایسا شخص پیدا نہیں ہوا، جس نے مرزا صاحب جتنی تصانیف یا تراجم کر کے اہلِ سندھ کو اس قدر فائدہ پہنچایا ہو۔ اس کی تصانیف مقبولِ عام اور تراجم شہرۂ آفاق ہیں۔ سندھ میں ایسا ایک بھی مسلمان نہیں، جس کی لکھی یا ترجمہ کی ہوئی کتابیں تعلیم یافتہ ہندوؤں نے بھی پسند کی ہوں، مطالعہ کیا ہو اور اپنے خرچ پہ شایع کروائی ہوں۔ یہ شرف اگر کسی مسلمان کے حصے میں آیا ہے تو وہ صرف مرزا صاحب ہی ہیں کوئی دوسرا نہیں۔ ہمیں ایسے بزرگ پر فخر ہے۔ مرزا صاحب کی چار تازہ شایع شدہ کتابیں، تبصرے کے لیے ''پریمیر پریس'' کے لائق مالک اور مہتمم کے ذریعے ہمارے پاس پہنچی ہیں۔ المختصر، سندھ ایسے قابل اور جفاکش سپوت کے ہونے پر جتنا فخر اور ناز کرے اتنا کم ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ اس شخص سے اتنی زیادہ محنت کس طرح ہو پاتی ہے کہ اپنا آرام کا وقت بھی اس نے ملک و قوم کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی عمر میں برکت دے کہ ابھی ملک کو ایسے مخلص لوگوں کی شدید ضرورت ہے۔

اخبار ''الحقیقت'' لاڑکانہ

۱۶، دسمبر ۱۹۳۲ء

فخر سندھ مرزا قلیچ بیگ کے نام نامی و اسم گرامی سے کون غیر واقف ہوگا؟ اس بزرگ اور سندھی زبان کے استادِ کامل کے جوہر لیاقت کی بناء پر سندھ کے طول و عرض سے ''آفرین آفرین'' اور ''جزاک اللہ'' کی آوازیں سندھ کا سر بلند کیے ہوئے ہیں اور سندھ بھی اپنی اس علمی دولت پر نازاں ہے۔ مرزا صاحب کے قلم اور طرز تحریر میں قدرت نے ایک خاص کشش رکھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی کتابیں پڑھنے والے کو اپنی جانب اس طرح کھینچتی ہیں جس طرح مقناطیس لوہے کو۔ مرزا صاحب کی کتابیں ہندو و مسلمان نہ صرف پسند کرتے ہیں بلکہ عزت و محبت کے جذبے سے دیکھتے اور پڑھتے بھی ہیں لہٰذا مرزا صاحب کی کتابوں پر تبصرہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے سورج کے آگے چراغ جلانا۔ مرزا صاحب کی کتب پر مرزا صاحب کا نام ہی سب سے بڑا تبصرہ ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے مرزا صاحب کی مندرجہ ذیل کتابیں تبصرے کے لیے موجود ہیں۔

''بچوں کی تعلیم''، ''اسلامی تعلیم''، ''ورزش نامہ''، ''نصیحت نامہ''، ''تعلیم نامہ''، ''بیوی کے فرائض'' اور ''ایک سگھڑ بیوی'' یہ کتابیں شائع ہونے کے ساتھ ہی مقبولیت و شہرت حاصل کر چکی ہیں لہٰذا ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟

بمبئی گورنمنٹ ہاؤس

۱، جنوری ۱۹۳۳ء

پیارے شمس العلماء!

بحکم گورنر صاحب، میں آپ کو ''شمس العلماء'' کا لقب ملنے پر مبارک باد دیتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ رب العزت آپ کو عمر خضر عطا فرمائے تاکہ آپ خلق خدا کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں۔

سی۔ جی۔ ایڈم

پرائیویٹ سیکریٹری

(☆☆☆)

وائسرائے کے سیکریٹری کا خط

۴، جنوری ۱۹۲۴ء

میرے پیارے مرزا صاحب!

وائسرائے صاحب بہادر کی جانب سے جو قابلِ عزت لقب آپ کو ملا یعنی ''شمس العلماء'' اس کے لیے میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔ مجھے اچھی طرح وہ دن یاد ہیں جب ہم فارسی اور سندھی ادب کے متعلق تبصرے کرتے تھے۔ نیا سال مبارک ہو۔

آپ کا دوست

ح۔ کریرار

(☆)

سندھ کے کمشنر صاحب کی طرف سے تار

۲، جنوری ۱۹۲۴ء

جس لقب سے آپ سرفراز کیے گئے ہیں، آپ واقعی ہر اعتبار سے اس کے لائق ہیں میری طرف سے آپ کو یہ اعزاز حاصل کرنے پر دلی مبارک باد۔

جی۔ ایل۔ ریو

(☆☆☆)

پیارے مسٹر مرزا!

برائے مہربانی میری طرف سے اس ایوارڈ کے ملنے پر مبارک باد قبول کریں۔ آپ ہر طرح سے اس اعزاز کے لائق ہیں۔

ای۔ سی۔ گرین

اسسٹنٹ کمشنر

کراچی

۳، جنوری ۱۹۲۴ء

پیارے مرزا قلیچ بیگ

میں آپ کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ کو ''شمس العلماء'' کا خطاب ملا۔ مجھے ''گزٹ'' سے اس بابت علم ہوا۔ میرا خیال ہے کہ یہ لقب کسی اور شخص کو ابھی تک نہیں ملا ہے۔ آپ نے سندھی زبان کے لیے بڑا کام کیا ہے اس لیے آپ اس عزت کے مستحق تھے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خاص لقب آپ کو اپنے دیگر القاب سے زیادہ پسند آئے گا۔

ایس۔ ایچ۔ کورٹن

کلکٹر حیدرآباد

(☆☆☆)

عمر کورٹ

۴، جنوری ۱۹۲۴ء

جو لقب آپ کو ملا ہے میری طرف سے اس کی مبارک باد وصول کیجیے۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے تا کہ ایسے کئی اعزاز حاصل کریں اور عزت کمائیں۔ سندھی بولی کی جو خدمت آپ نے کی ہے، اس کے لیے یہ ایک قابلِ قدر انعام ہے۔

آپ کا حامد علی

کلکٹر تھرپارکر

(☆☆☆)

کراچی

۱، جنوری ۱۹۲۲ء

جو اعلیٰ لقب آپ کو دیا گیا ہے اس کے لیے میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ پورے سندھ میں آپ سے زیادہ اس عزت کا مستحق کوئی اور نہیں۔ خدا آپ کو لمبی عمر دے تاکہ اس انعام کی عزتیں آپ کو ملتی رہیں۔ نئے سال کی مبارک باد بھی قبول کریں۔

ڈبلیو۔ ایچ۔ رچرڈسن

سٹی مجسٹریٹ

(☆☆☆)

ہارپر آباد

۴، جنوری ۱۹۲۲ء

پیارے مرزا!

میں آپ کو اس نئے اعزاز کے ملنے پر مبارک باد دیتا ہوں۔ آپ اس اعزاز کے ہر طرح لائق ہیں۔ نیا سال مبارک ہو۔

ڈی۔ ایس۔ ہارپر

پادری حیدرآباد

(☆☆☆)

"شمس العلماء" کا لقب جو آپ کی لیاقت کے پیش نظر آپ کو عطا کیا گیا ہے، اس کے لیے میری دلی مبارک باد وصول کریں۔ امید ہے کہ آپ صحتمند ہوں گے۔

سید محمود شاہ

سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ تھرپارکر

(☆☆☆)

میرے پیارے مرزا صاحب!

آپ کی لیاقت و قابلیت کے پیش نظر آپ کو شمس العلماء کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ آپ سے زیادہ اس لقب کا کوئی مناسب امیدوار نہیں اس لیے دل و جان سے آپ کو مبارک باد پیش کرنا چاہوں گا۔ میں اس لقب کے بارے میں سن کر بے حد خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ یہ آپ کو ملا اگرچہ دیر ہوئی۔ میری دلی تمنا ہے کہ آپ ایک عرصے تک جئیں تاکہ یہ لقب بھی سرفراز رہے۔

شیخ محمد قادر

وزیر خیرپور ریاست

(☆☆☆)

ڈیارام جیٹھمل سندھ کالج کراچی

۴، جنوری ۱۹۲۳ء

پیارے مرزا قلیچ بیگ!

مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی ہے کہ آپ کو شمس العلماء کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ بے شک یہ اعزاز آپ کو اس سے قبل ہی مل جانا چاہیے تھا۔ آپ نے سندھی زبان و علم کی اتنی خدمت کی ہے کہ آپ کا نام علم و ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ وہ نسلیں جو ابھی دنیا میں نہیں آئیں وہ بھی آپ کا نام سن کر فخر محسوس کریں گی۔ پروردگار آپ کی عمر دراز کرے۔ یہی میری دعا ہے۔

ایچ۔ ایم۔ گربخشانی

سیہون

۲، جنوری ۱۹۲۳ء

میرے پیارے مرزا صاحب!

میں بہت خوش ہوا ہوں کہ آپ کو اتنا شاندار لقب ملا جس کے ہر آپ طرح لائق ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی عمر عطا کرے تاکہ عزت، خوشی دوستی راحت کو زیادہ سے زیادہ دیکھ پائیں۔

گوبند رام

سپرنٹنڈنٹ آف سروے پنشن

شکارپور

۳۰، جنوری ۱۹۲۳ء

میرے پیارے مرزا!

یہ پڑھ کر کہ آپ کو "شمس العلماء" کا لقب ملا ہے دلی خوشی ہوئی ہے۔ سندھ میں آپ سے زیادہ اس لقب کے لائق کوئی اور نہیں۔ میں اس کے لیے آپ کو دل کی گہرائی سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ لمبی عمر پائیں گے۔ خوش رہیں تاکہ اس ملک کو علمی حوالے سے زیادہ سے زیادہ مضبوط کر سکیں۔

نارائن داس

پنشن ڈپٹی کلکٹر

(☆☆☆)

گورنر بمبئی کا تار

بمبئی

۴، جنوری ۱۹۴۳ء

جو عزت آپ کو ملی ہے وہ آپ کو بہت پہلے ملنی چاہیے تھی۔ میرے طرف سے دلی مبارک باد۔

گورنر۔ بمبئی

پیارے مرزا صاحب!

نئے خطاب پانے والوں کی فہرست میں آپ کا معزز نام دیکھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ یقیناً پورے سندھ کے لوگوں کو ہوئی ہوگی۔ آپ کی ذات میں اتنی خوبیاں وخاصیتیں ہیں کہ سب لوگ آپ سے پیار کرتے اور آپ کی تعریف کرتے ہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے حوالے سے آپ کی لیاقت کے لیے کسی نہ کسی گوشے کی مدح کرتا ہے۔ خدا معلوم مزید کتنے جوہر آپ کی ذات میں پوشیدہ ہوں گے جن کے بارے میں ہم لاعلم ہیں وہ خدا کو ہی معلوم ہوں گے۔

آپ کی طبیعت میں عام لوگوں کو پسند کرنے کی جو خاصیت ہے وہ اللہ کے لیے اعلیٰ وصف کی ترجمان ہے۔ ہم آپ سے محبت کرتے فخر محسوس کرتے ہیں۔ اللہ آپ کو سندھ کے لیے لمبی مہلت دے۔ جس حجاب سے میں آپ کو لکھتا ہے، اس کے لیے مجھے معاف کیجیے گا۔ نئے سال کی ڈھیروں مبارک باد۔

امداد علی، امام علی چشتی

ڈسٹرکٹ جج خیرپور

(☆☆☆)

مخزن ''غنچہ امید'' ماہِ جنوری

مرزا قلیچ بیگ کو سرکار نامدار نے شمس العلماء کا خطاب عنایت فرمایا ہے اس اہل قلم کی قدر شناسی پر اہلِ سندھ نہایت خوش ہوئے ہیں۔ ایک حوالے سے دیکھا جائے تو ہر روز ہی لقب بانٹے جاتے ہیں مگر اس فخر سندھ اور زندہ شاعر کو اس کی قابلیت پر جو لقب ملا ہے، اس سے پڑھے لکھے طبقے کے دل باغ و بہار ہو گئے ہیں۔ صاحب موصوف کے لیے دیوان دیارام گدومل کہتے تھے کہ ''اصول سیکھو تو مرزا صاحب سے سیکھو، جو کبھی تو محض گھنٹہ آدھا گھنٹہ لکھتے ہیں مگر اصول نہیں توڑتے۔ اسی وجہ سے سینکڑوں کتابیں لکھ چکے ہیں۔''

دیہاتوں میں مرزا صاحب کی کافیاں اہلِ دیہات خوب گاتے ہیں اور شہروں میں بھی ان کی غزلیں ہر خاص و عام گنگناتا ہے۔ قلم کے زور پر مرزا صاحب ''مسخر اند بگریاند جہان را۔''

ہم حکومت وقت کو مبارک باد دیتے ہیں کہ اس نے عوام کے جذبات کے احترام میں یہ اہم کام کیا۔

تصویر کے نیچے محمد ہاشم ''مخلص'' کا یہ شعر لکھا ہوا ہے۔

کیا رتبہ رکھتا ہے سندھ میں مرزا قلیچ بیگ
فاضل فصیح، علم میں یکتا قلیچ بیگ
ہوئی نظم و نثر اس کی دلآویز، دلپسند
ہم پایہ حکیم اور سودا قلیچ بیگ
چشمِ جہاں، پایا نہ اس کا کوئی نظیر
بے مثل، بے عدیل ہوئے دانا قلیچ بیگ
سرکار نے خوب قدر شناسی کی ان کی
ہوئے زیب ور بھی ''شمس العلماء'' قلیچ بیگ

(☆)

سلسبری

۲۱، فروری ۱۹۴۴ء

میرے پیارے مرزا صاحب!

ابھی میں نے کراچی کے ایک اخبار میں پڑھا ہے کہ آپ کو سرکار نے ''شمس العلماء'' کا لقب عطا کیا ہے۔ میں مبارک باد کا ایک جملہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کافی مدت سے میں اس امید میں تھا کہ آپ کو یہ عزت ملے گی اور اب یہ سوچ کر خوش ہوا ہوں کہ میری امید بر آئی۔ جو لقب دیے جاتے ہیں ان میں بہت کم افراد آپ کی مانند اہل ہوتے ہیں۔ اس لیے میں آپ کو تہ دل سے مبارک باد دیتا ہوں۔ امید ہے کہ جب ہندوستان لوٹ کر آؤں گا تب آپ مجھے بالکل تندرست حالت میں ملیں گے۔

آئی۔ ایچ۔ سٹیٹن

کلکٹر

(دستخط)

میری زندگی میں رونما ہونے والے اہم واقعات ترتیب وار

۱۔	میری پیدائش	۱۲۷۰ھ	۱۸۵۳ء
۲۔	میرے والد صاحب کا وصال		۱۸۷۱ء
۳۔	ہائی اسکول حیدرآباد میں بحیثیت فارسی استاد تقرری		۱۸۷۲ء
۴۔	میٹرک کے امتحان میں کامیابی		۱۸۷۲ء
۵۔	بمبئی ایلفنسٹن کالج میں داخلہ		۱۸۷۳ء
۶۔	میری والدہ صاحبہ کی وفات		۱۸۷۶ء
۷۔	بحالت بیماری بمبئی چھوڑنا اور ہندوستان گھومتے گاؤں پہنچنا		۱۸۷۶ء
۸۔	دو سال کراچی میں رہائش اور فارسی استاد کی حیثیت سے ملازمت		۱۸۷۸ء
۹۔	مختارکاری کی ذمہ داریاں سیکھنا اور مجسٹریٹی کا امتحان پاس کرنا		۱۸۷۹ء
۱۰۔	تعلقہ ''ٹنگو'' میں بحیثیت مختیارکار پوسٹنگ		۱۸۸۰ء
۱۱۔	تعلقہ ''ٹنگو'' میں بحیثیت مختیارکار پوسٹنگ		۱۸۸۱ء
۱۲۔	تعلقہ ''میہڑ'' میں بحیثیت مختیارکار پوسٹنگ		۱۸۸۲ء
۱۳۔	تعلقہ ''جوہی'' میں بحیثیت مختیارکار پوسٹنگ		۱۸۸۳ء
۱۴۔	تعلقہ ''وارہ'' یا ''نصیرآباد'' میں بحیثیت مختارکار پوسٹنگ		۱۸۸۷ء
۱۵۔	ملازمت سے چھٹی لے کر شادی کرنا		۱۸۸۸ء
۱۶۔	تعلقہ ''گھوٹکی'' میں بحیثیت مختیارکار پوسٹنگ		۱۸۸۹ء
۱۷۔	تعلقہ ''روہڑی'' میں بحیثیت مختیارکار پوسٹنگ		۱۸۹۰ء
۱۸۔	ڈپارٹمنٹل امتحان میں کامیابی		۱۸۹۱ء

۱۹۔	(ایکٹنگ ڈپٹی) تعلقہ "شکارپور" میں بحیثیت ڈپٹی مجسٹریٹ تعیناتی	۱۸۸۸ء
۲۰۔	دوبارہ "روہڑی" تبادلہ	۱۸۹۰ء
۲۱۔	دوبارہ لاڑکانہ میں بحیثیت ڈپٹی کلکٹر تبادلہ	۱۸۹۳ء
۲۲۔	کراچی اور تھرپارکر میں گھر بنوانا	۱۸۹۴ء
۲۳۔	تعلقہ سیہون میں بحیثیت ڈپٹی کلکٹر پوسٹنگ	۱۸۹۵ء
۲۴۔	جیکب آباد (سرحد سندھ) میں ڈپٹی کلکٹر حیثیت سے کام کرنا	۱۸۹۶ء
۲۵۔	حیدرآباد میں گھر بنوانا	۱۸۹۸ء
۲۶۔	ڈپٹی کلکٹر تھرپارکر کی حیثیت سے ملازمت کرنا	۱۸۹۸ء
۲۷۔	ڈپٹی کلکٹر نوشہرو فیروز بننا	۱۸۹۸ء
۲۸۔	حیدرآباد میں بیٹھک بنوانا	۱۹۰۰ء
۲۹۔	ضلع کوٹڑی میں بحیثیت ڈپٹی کلکٹر کام کرنا	۱۹۰۱ء
۳۰۔	ٹھٹھہ اور سجاول میں ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے جانا	۱۹۰۳ء
۳۱۔	میری پہلی بیوی کی وفات	۱۹۰۴ء
۳۲۔	"قیصر ہند" کا تمغہ ملا	۱۹۰۶ء
۳۳۔	میری دوسری شادی	۱۹۰۷ء
۳۴۔	میری دوسری بیوی کی وفات	۱۹۰۸ء
۳۵۔	میری تیسری شادی	۱۹۰۹ء
۳۶۔	کراچی ڈویژن سے دورانِ ملازمت چھٹی لینا	۱۹۰۹ء
۳۷۔	ریٹائرمنٹ	۱۹۱۰ء
۳۸۔	میرے بڑے بیٹے نادر بیگ کا بیرسٹر بننا	۱۹۱۲ء
۳۹۔	کراچی میں چار مہینے گزارنا	۱۹۱۵ء
۴۰۔	دوبارہ کراچی میں چار ماہ کے لیے جانا	۱۹۲۰ء
۴۱۔	آج تک حیدرآباد میں رہائش	۱۹۲۳ء

مری تحریر کردہ کتابوں کی سال بہ سال علاقہ وار یادداشت

۱۔ ۱۸۷۰ء فارسی اور سندھی میں ابتدائی شاعری کا آغاز۔ حیدرآباد۔

۲۔ ۱۸۷۲ء جواہر اللسان، فارسی۔ حیدرآباد۔

۳۔ ۱۸۷۴ء فارسی گرامر و فارسی عروض کا انگریزی میں ترجمہ۔ بمبئی۔

۴۔ ۱۸۷۷ء اشتقاق فارسی انگریزی زبان میں اور مقالات الحکمت۔ بمبئی۔

۵۔ ۱۸۷۸ء "قصہ ہرنی کا" شاعری۔ کراچی۔

۶۔ ۱۸۸۰ء لیلیٰ مجنون (ناٹک) سومل رانو (شاعری) راہ نجات اور ہدایت النسواں۔ کراچی۔

۷۔ ۱۸۸۵ء احوال شاہ عبداللطیف بھٹائی انگریزی اور سندھی میں۔ ڈاڑھیارے پہاڑ کی سیر۔ نصیرآباد یا وارہ۔

۸۔ لیئیر آورس (انگریزی شاعری) کافیاں اور خورشید ناٹک۔ نصیرآباد۔

۹۔ ۱۸۸۸ء علم اخلاق۔ صحت النساء، علم دستور المعاش، تاریخ محمدی، رستم پہلوان، علامات القرآنی، دل آرام اور مفتاح القرآن (فارسی)۔ نصیرآباد۔

۱۰۔ ۱۸۹۰ء دلپسند لطائف، روہڑی۔ زینت (ناول) دلپسند قصے (دوسرا حصہ)، شکارپور۔ تعلیم حکمت (پہلا حصہ)، نصیرآباد۔

۱۱۔ ۱۸۹۱ء تعلیم حکمت (دوسرا اور تیسرا حصہ)، موتی، مخزن القوافی (فارسی اور اردو)، نصیرآباد۔

۱۲۔ ۱۸۹۴ء بکاؤلی (ناٹک)، ٹھگ اور لالچی (ناٹک)، اسلامک تھیوسوفی یا کیمیائی سعادت (انگریزی)، عمرکوٹ۔

۱۳۔ ۱۸۹۵ء آبادکاری کا علم و ہنر، باغ اور باغبانی، عالم آبی، حشرات الارض یا کیڑے مکوڑے، سانپ اور دوسرے رینگنے والے جانور۔ لاڑکانہ۔

۱۴۔ ۱۸۹۶ء نور جہاں اور جہانگیر (ناٹک)، شکنتلا (ناٹک)، نیم طبیب یا نیم ملا (ناٹک)، جانور۔ جیکب آباد۔

۱۵۔ ۱۸۹۷ء نادر شاہ (ناٹک)، حسنہ اور ولدار (ناٹک)، انکوائری آفیسر (ناٹک)، گاؤں کے وڈیروں کے لیے مشورہ اور احوالِ شاہ عبداللطیف بھٹائی۔ جیکب آباد۔

۱۶۔ ۱۸۹۸ء پرندے۔ جیکب آباد۔

۱۷۔ ۱۹۰۰ء عجائب غرائب، شاہ الیا (ناٹک)، شیخ چلی (ناٹک)، ثابت علی شاہ اور ان کے مرثیے (پہلا حصہ)، فارسی زبان کی تاریخ، چچ نامہ انگریزی میں اور سودائے خام (پہلا حصہ)، نوشہرو فیروز اور حیدرآباد۔

۱۸۔ ۱۹۰۱ء کیمیائی سعادت (پہلا اور دوسرا حصہ)، سندھ کی تاریخ (انگریزی)، خودیاوری۔ کوٹری، حیدرآباد یا کراچی۔

۱۹۔ ۱۹۰۲ء کیمیائی سعادت (تیسرا حصہ)، اسلامی رسالہ۔ کوٹری، حیدرآباد یا کراچی۔

۲۰۔ ۱۹۰۳ء لطیفہ معرفت۔ کرامات الاولیاء۔ کوٹری۔ حیدرآباد یا کراچی۔

۲۱۔ ۱۹۰۴ء سندھ کی تاریخ با تصویر۔ اسلامی درجہ وار چار کتابیں، جواہر الاخلاق، تہذیب الاخلاق، گلشن اخلاق، اخلاق القرآن و الحدیث، اخلاق النساء، اخلاق صوفیہ، فرائض انسانی اور ضمان الفردوس۔ کوٹری، حیدرآباد یا کراچی۔

۲۲۔ ۱۹۰۵ء حقائق الارواح، عالمِ خواب، رسالہ کریمی، لغاتِ لطیفی، حالات الاولیا۔ مقالاتِ اولیاء، رباعیاتِ عمرِ خیام، فیروز دلفروز (ناٹک)،
کوٹری، حیدرآباد یا کراچی۔

۲۳۔ ۱۹۰۶ء مقناطیس حیوانی، طاقت مندی بذریعۂ حاجت مندی، صداقت الاسلام، زادالآخرۃ، ابکار الافکار عربی، فارسی اور اُردو، ثابت علی شاہ کے مرثیے (دوسرا حصہ) فلالاجیکل کیوریا اور عجائب الاشتقاق (انگریزی)۔
کوٹری، حیدرآباد یا کراچی۔

۲۴۔ ۱۹۰۷ء نصیحت نامہ امام غزالی، میراث المسلمین، مجالس الشہداء، انجیل، عالم ارواح۔ کوٹری، حیدرآباد یا کراچی۔

۲۵۔ ۱۹۰۸ء اسرارِ حکمت، رد تثلیث، شمشاد، مرجانہ (ناٹک)، سندھی بولی کی تاریخ۔
کوٹری، حیدرآباد یا کراچی۔

۲۶۔ ۱۹۰۹ء یوسف اور فاطمہ، تُرکی نامہ، عزیز اور شریف (ناٹک)، گلزار اور گلنار (ناٹک)، اشعار القرآن۔ کوٹری، حیدرآباد یا کراچی۔

۲۷۔ ۱۹۱۰ء سوادی خام (نیا ایڈیشن) کوٹری، حیدرآباد یا کراچی۔

۲۸۔ ۱۹۱۱ء حاجی بابا اصفہانی، نیکی اور بدی (ڈرامہ)، حرکت میں برکت (ناٹک)، سُرسُنی کی شرح، پھولوں بھری ٹوکری، شرلاک ہومز (دو حصے)، فارسی جواہر (منظوم انگریزی میں) (تین حصے)۔
حیدرآباد۔

۲۹۔ ۱۹۱۲ء تین گھر (دو حصے)، آرام بعد از آزار، علم تصوف، لطیفی لات، تعلیم صحت (پہلا حصہ)، برطانوی شہنشاہیت، سچا سکھ اور تحفۃ النسواں۔
حیدرآباد۔

۳۰۔ ۱۹۱۳ء بچھی، الحیات بعد الممات، سُر سسی کی شرح، شاہ کا رسالہ، علم ادب، طبیعی الہام، جولین ہوم اور ایرک۔ حیدرآباد۔

۳۱۔ ۱۹۱۴ء اسلامی پانچویں کتاب۔ زنوبیہ، راحیل، لُوسی، یا بادل، سرکٹا جسم، شرانہ یا شیطان کی نانی، شیطان کا مرید، عجیب طلسم، عجیب الماس، سچی محبت، سندھی شاعری کی تاریخ کیوں اور کیا؟ موتیوں سے بھرا ڈبہ اور ایمرسن کے عجیب نکات۔ حیدرآباد۔

۳۲۔ ۱۹۱۵ء شرح محمدی، جوانی کی اکسیر، چندن ہار (پہلا حصہ) سندھ کی مختصر تاریخ، علمی گلدستہ، حسن میں تاثیر، امید شاہ اور شراب دیو، دو چھوٹے انسان (تینوں ڈرامے پرہیز یا ٹیمپرنس سوسائٹی کے لیے) حیدرآباد یا کراچی۔

۳۳۔ ۱۹۱۶ء عورت کے فرائض، دل کا آرام یا عجیب دوا، ایک تکھڑ بیوی، کادمبری، رعیت نامہ، جنگ نامہ، علم نحو (سندھی) سُر سُریراگ کی شرح اور اسلامی تحفہ۔ حیدرآباد۔

۳۴۔ ۱۹۱۷ء اچھے خیالات کی کرامت، مصیبت کے مارے، جار جیا یا گر جستان، سنہری خیال، عجیب جواہر (شاعری)، تحفہ امامیہ (شاعری)، نصیب اپنے ہاتھ، لالہ رُخ (شاعری)، جمشید اور حمید (ناٹک)، مشک کا شکار (ناٹک)، مختار ثقفی، رواجی حکمت، در نجف اور کشف، اعجاز یا گلشن راز (شاعری)، حیدرآباد۔

۳۵۔ ۱۹۱۸ء شاہ کے رسالے کی کنجی، غلامی سے آزادی، پرہیز نامہ، گلزار تعلیمی، بچوں کی پھلواری، سیرت النبی ﷺ (پہلا حصہ)، قدیم چینی اخلاق، اکلانٹس، عالم کا استاد، گناہوں کو قبول کرنا، دو خط، دو بھائی، دو بہنیں، ایک اندھی شریف عورت، شریفہ بیگم، عاقل اور فاطمہ (چھ عدد زنانہ تعلیم کے متعلق پُر اثر تحریریں)، حیدرآباد۔

۳۶۔ ۱۹۱۹ء مولویوں کے لیے نصیحت نامہ، عقل حیوانی اور اس کی مثالیں، عجیب باتیں، مستقبل کا زمانہ، بدایع الوقائع، انجیل، توریت، زبور (منظوم)، یسوع مسیح کی سوانح عمری (نثر و نظم دونوں میں)، ہندوستان کی مقامی کہانیاں، زنانہ چھ کتابیں (درجہ بدرجہ) اور بچوں کی تعلیم۔ حیدرآباد۔

۳۷۔ ۱۹۲۰ء بیش بہا موتی (شاعری) (پہلا حصہ)، ورزش نامہ، سلیس صرف نحو، علم بدیع، علم عروض، فوائد الاخلاق، لطائف الطوائف، روحوں سے بات کرنے کا طریقہ، سبزیاں پکانے کی ترکیبیں، بیماری کے سچے اور جھوٹے اسباب، ملک کی مفلسی اور اسبابِ قرض، زینت النسواں، مقدس کلام، نصیحت المسلمین، اخلاق المعصومین اور سنہری خیال۔ حیدرآباد اور کراچی۔

۳۸۔ ۱۹۲۱ء سندھی گرامر، خصائص القرآن، سندھ کے قدیم شہر اور ان کی مشہور شخصیات۔ حیدرآباد۔

۳۹۔ ۱۹۲۲ء سندھ کا مختصر جغرافیہ، تاریخ تصوف، دیوان گل کی شرح، اسلامی حق نامہ، تقریریں اور تحریریں، یادیں، حجتہ الشیعہ، محبت آل عبا، عقود اللالی، اصلاح نامہ، چیستانہ یا بچوں کا کھیل، ہزلیات، مومل راتو کی شرح، اسلام کے ۷۳ فرقے، ریاست خیرپور کی تاریخ، تحفہ اسماعیلیہ، اسلامی تعلیم، سعادت نامہ (شاعری)، روشنائی نامہ (شاعری)، عبادت نامہ، تحفۃ السالکین، جیسا خیال ویسا حال، سیٹرڈ فرڈ اور مرٹن، گلیور کا سفر، رابنسن کروسو، خان بہادر حسن علی آفندی کی سوانح عمری، حقیقت الربی۔ حیدرآباد۔

۴۰۔ ۱۹۲۳ء شہزادہ بہرام یا ہیملٹ (ناٹک)، اسلام بمطابق اصول تھیا سوفی (فارسی) استادوں کے قدموں میں، چچ نامہ (سندھی)، قدیم سندھ کے ستارے یعنی مصنف اور شاعر، کریسس، تاریخ القرآن والحدیث، لغات قدیم سندھی، طلب العلم فی الاسلام، شیخ بوعلی سینا، چندن ہار (شاعری، دوسرا حصہ) بیش بہا موتی (شاعری، دوسرا حصہ)، موتیوں سے بھرا ڈبہ (شاعری، دوسرا حصہ)، سودائے خام (شاعری، دوسرا حصہ)، میری سوانح حیات برگ سبز یا قرطاسِ سیاہ، شیریں فرہاد (منظوم ڈرامہ)، شطحیات صوفیہ، امام محمد غزالی کی سوانح عمری، حکیم ناصر خسرو علوی کی سوانح عمری۔ حیدر آباد۔

۴۱۔ ۱۹۲۴ء طب مطبوع اور مخزن (منظوم)، مثنوی ترکیب الانسان (شاعری)، شاہ شاہنامہ والے شاہ، وامق اور عذرا، سائنس کے عجائب وغرائب، علم رمل، مفتاح الرمل، میرا عجیب گھر، خواب اور تعبیر (دو رسالے)۔ حیدر آباد۔

۴۲۔ ۱۹۲۵ء منتخب المعلومات بہتری کا آغاز، ریاضی (تین حصے)، حیدر آباد۔

۴۳۔ ۱۹۲۶ء علمی مذہب، مصرنامہ، کامل انسان، مجمع المذاہب، چین اور چینی باشندے، شرح دیوانِ قاسم اور فاضل، پیدائشِ انسان (۷ رسالے)، حیدر آباد۔

۴۴۔ ۱۹۲۷ء بابل اور نینوا، حضرت سلیمان، سچی مردانگی، گلدستہ حمد وثنا، لسان الغیب، خطبے، مثنوی مطلع الانوار، مثنوی مخزن الاسرار، بدر منیر اور بے نظیر، شلع گل، دنیا میں پیدا نہ ہونے والے افراد کی روحیں (دو رسالے)، فقہ کے کچھ مسائل، انسان خود اپنا طبیب، انسان کے محافظ، حیات بعد از موت اور عالمگیر مذہب۔

۳۵۔ ۱۹۲۸ء دیکھو اور سنو، کافیاں، دنیا کی مختصر تاریخ، دیوانِ قلیچ، باب اور بابی، مولانا جلال الدین رومی، تالپروں کا عروج (انگریزی میں)، خزینہ زرینہ فارسی، خزینہ سیمیں فارسی، کامل انسان، (دوسرا حصہ)، زیب النساء بیگم، سلطان علاء الدین اور رانی پدمنی، اولاد زرینہ کا حصول، علم موسیقی، حسن وعشق اوراس کے کرشمے (دو حصے)، حسینہ۔

نوٹ: میری بہت سی کتابوں پر مختلف رسائل واخبارات میں تبصرے شایع ہو چکے ہیں۔ فارسی اور سندھی شعراء نے بھی مجھ پر خاصی شاعری کی ہے جو شایع بھی ہوئی ہے۔ اس شاعری میں مری مدح کے علاوہ شعراء کی مہربانی اور حسن ظن بھی شامل ہے۔ تعریفی اشعار یہاں شایع کرنا مناسب نہیں لگتا، اس کے علاوہ، یہ تبصرے یا شاعری یہاں شایع کرنے سے یہ دفتر زیادہ طویل ہو جائے گا۔

مختلف مواقع پر قلمبند تحریروں و تقاریر کی تفصیل

تقاریر

۱۔	۱۹۰۷ء	کراچی میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں سندھی لٹریچر کے موضوع پر تقریر۔
۲۔	۱۹۱۴ء	حیدر آباد میں "سندھی ساہت سوسائٹی" کے جلسے میں "سندھی شاعری" پر تقریر۔
۳۔	۱۹۱۴ء	حیدر آباد میں تو دو یالیہ کی آس پاس کی زبان والے جلسے میں "پرہیز" کے موضوع پر تقریر۔
۴۔	۱۹۱۴ء	شکار پور میں "ٹمپرنس کانفرنس" میں منشیات کے متعلق تقریر۔
۵۔	۱۹۱۵ء	کراچی میں "انسانیت" کے موضوع پر تقریر۔
۶۔	۱۹۱۵ء	لاڑکانے میں "منشیات اور پرہیز" کے متعلق تقریر۔
۷۔	۱۹۱۶ء	حیدر آباد میں "پرہیز" کے متعلق تقریر۔
۸۔	۱۹۱۸ء	کراچی میں اُردو زبان کی ترقی کے متعلق تقریر۔
۹۔	۱۹۱۹ء	خیر پور میں "اُردو" کے متعلق تقریر۔
۱۰۔	۱۹۱۹ء	سکھر میں عربی و فارسی کی تعلیم کے متعلق تقریر۔
۱۱۔	۱۹۱۹ء	خیر پور میں عربی و فارسی علم کے متعلق تقریر۔
۱۲۔	۱۹۲۰ء	کراچی میں مسلمانوں کے ایک عجیب تاریخی واقعے کے متعلق تقریر۔
۱۳۔	۱۹۲۰ء	کراچی میں پردے کے متعلق تقریر۔
۱۴۔	۱۹۲۰ء	کراچی میں زنانہ تعلیم اور اخلاق کے متعلق تقریر۔

۱۵۔ ۱۹۲۰ء شاعری کے علم وفن کے متعلق تقریر۔
۱۶۔ ۱۹۲۱ء حیدرآباد میں ''انجمن امامیہ'' کے جلسے میں مذہبی تقریر۔
۱۷۔ ۱۹۲۱ء حیدرآباد میں تصوف کے موضوع پر تقریر۔
۱۸۔ ۱۹۲۲ء حیدرآباد، ''سندھی ساہت سوسائٹی'' کے زیرِ اہتمام تقریر۔
۱۹۔ ۱۹۲۲ء حیدرآباد میں سندھی زبان وادب کے متعلق تقریر۔
۲۰۔ ۱۹۲۲ء شاہ عبداللطیف بھٹائی کی علمیت پر تقریر۔
۲۱۔ ۱۹۲۲ء لاڑکانہ میں شاعری کی شان وشوکت کے متعلق تقریر۔
۲۲۔ ۱۹۲۳ء صوفیوں کی مجذوبی کیفیت اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کی علمیت کے متعلق کراچی میں تقریر۔
۲۳۔ ۱۹۲۴ء حیدرآباد میں اسلام میں علم کی تلاش کے موضوع پر تقریر۔
۲۴۔ ۱۹۲۵ء آدمی کسے کہا جائے اور کس طرح بنا جائے؟

تحریریں

۱۔ ۱۹۰۵ء ''سیوا سدن منڈلی'' کے چار پرچے، زندگی کی امانت، انسانی فرائض اور اس کے متعلق شاعروں کے تصورات۔
۲۔ ۱۹۱۵ء ''جپ صاحب'' کی کتاب پر تقریظ۔
۳۔ ۱۹۱۶ء سندھ کے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق۔
۴۔ ۱۹۱۶ء کچھ کورس کے متعلق۔
۵۔ ۱۹۱۸ء فوری طبی علاج کا دیباچہ۔
۶۔ ۱۹۲۱ء آزادی (سوراج) کے متعلق۔
۷۔ ۱۹۲۱ء پبلسٹی کمیٹی کے لیے پرچے۔
سوراج اور سودیشی تحریک، مقصد ایک راستے جدا، قطع تعلقات کا مدعا اور نتائج، مہاتما گاندھی کا سوراج، سخت مزاجی سے نرم مزاجی تک، سرکار اور مسلمان۔

۸۔ ۱۹۲۲ء راگ کے متعلق۔
۹۔ ۱۹۲۴ء کاشت کاری کے علم و ہنر کے متعلق۔

میری کتابوں کے پبلشرز اور پریس مالکان

۱۔ پیسہ اخبار، لاہور پریس۔
۲۔ اسلامیہ پریس، لاہور۔
۳۔ الحق پریس، سکھر۔
۴۔ قیصریہ پریس، حیدرآباد۔
۵۔ پریمیئر پریس، حیدرآباد۔
۶۔ اسٹینڈرڈ پرنٹنگ پریس، حیدرآباد۔
۷۔ فیض پریس، خیرپور۔
۸۔ سندھ کالج ڈرامیٹک سوسائٹی۔
۹۔ سرکاری محکمہ تعلیم۔
۱۰۔ کمشنر پریس، کراچی۔
۱۱۔ بائبل مشن سوسائٹی۔
۱۲۔ مسٹر پوکرداس، شکارپور۔
۱۳۔ مسٹر ہری سنگ، سکھر۔
۱۴۔ مسٹر گوبل تلسی داس، حیدرآباد۔
۱۵۔ محمد یوسف حاجی ہارون، کراچی۔
۱۶۔ بھارت واسی پریس، حیدرآباد۔
۱۷۔ تھیاسوفیکل سوسائٹی، حیدرآباد اور کراچی۔
۱۸۔ مدرسۃ الاسلام، کراچی۔

۱۹۔ مسٹر شیرازی بھائی۔

۲۰۔ شیخ عبدالرحیم، حیدرآبادی۔

۲۱۔ منشی موسن، سکھر۔

۲۲۔ میاں محمد ہاشم خواجہ، حیدرآبادی۔

۲۳۔ منشی موسن، سکھر۔

۲۴۔ میاں محمد ہاشم خواجہ، حیدرآبادی۔

۲۵۔ سندھی ساہت سوسائٹی، حیدرآباد اور کراچی۔

۲۶۔ دیس مترا، حیدرآباد۔

۲۷۔ جو دیتا مل کوآپریٹو سوسائٹی۔

۲۸۔ جو کتابیں میں نے خود شایع کروائیں: بلوچستانی پریس، حیدرآباد۔

کتابوں کی فہرست، مضامین کے اعتبار سے

۱۔ انگریزی سے ترجمہ:

توریت یا قدیم عہد نامہ، انجیل یا نیا عہد نامہ، زبور اور حضرت داؤدؑ (منظوم)، یسوع مسیح کی سوانح حیات (منظوم)، یسوع مسیح کا احوالِ زندگی (منظوم)، علم اخلاق، مقالات الحکمت، خود یاوری، دلپسند قصے، علم دستور المعاش، برطانوی شہنشاہیت، طاقت مندی بذریعۂ حاجت مندی، آرام بعد از آزار، جیسا خیال ویسا حال، نصیب اپنے ہاتھ، اسٹنڈفرڈ اور مرٹن، گلیور کا سفر، رابنسن کروسو، تین گھر، ایرک، جولین ہوم، گلزار اور گلنار، عزیز اور شریف، جمشید اور حمید، شمشاد اور مرجانہ، شک کا شکار، شاہ الیا، نیکی اور بدی، حسنہ اور دلدار، شرح محمدی، رواجی حکمت، ہندوستان کی مقامی کہانیاں، دل بہلانے والی باتیں، شرلاک ہومز، پھولوں بھری ٹوکری، سچے خیال کی کرامت، مصیبت مارے، لالہ رخ (منظوم)، سنہری خیال، عجیب جواہر (شاعری)، حاجی بابا اصفہانی، فیروز دلفروز (ناٹک)، سچی محبت، کاشتکاری کا علم و ہنر، باغ و باغبانی، تہذیب اخلاق، مخلوقات (پانچ حصے)، فرائض انسانی، تعلیم حکمت (تین حصے)، مقناطیس حیوانی، انکوائری آفیسر، اٹلانٹس، مستقبل کا زمانہ، تھیاسوفی، غلامی سے نجات، ایمرسن کے عجیب نکات، سات وادیاں، بہائی مذہب کی تعلیم، عالم کا استاد، اسلام بموجب اصولِ تھیاسوفی اور استاد کے قدموں میں۔

۲۔ انگریزی میں تحریر کردہ:

سندھ کی تاریخ (۲ جلدیں)، جواہر فارسی (شاعری، ۳ جلدیں)، زبانوں میں عجیب موافقت، فرصت کے لمحات (شاعری، دو حصے)، کیمیائی سعادت، علم عروض فارسی، فارسی گرامر کا شجرہ، اشتقاقِ فارسی، عجیب جواہر (دو حصے)، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا احوال، مرزا خسرو بیگ کی سوانح عمری۔

۳۔ سندھی زبان میں مذہب، فلسفے اور اخلاق کے موضوعات پر تحریر کردہ:

مفتاح القرآن فارسی، سیرت النبی ﷺ، خصائص القرآن، اشعار القرآن، اخلاق القرآن والحدیث، حالاتِ اولیاء، مقالات اولیاء، کراماتِ اولیاء، اسلامی رسالہ، راہِ نجات، مجالس الشہداء، کیمیائی سعادت، حقائق الارواح، لطیفہ معرفت، زاد الاخرۃ، ضمان الفردوس، میراث المسلمین، عالم ارواح، عالم خواب، مقدس کلام، علم تصوف، تصوف کی تاریخ، نصیحت المسلمین، مقالات الحکمت، رد تثلیث، یوسف اور فاطمہ، گلشن اخلاق، جواہر الاخلاق، تہذیب اخلاق، فوائد الاخلاق، نئی اور پرانی اسلامی کتابیں (سات)، تحفۃ السالکین، تحفۃ اسماعیلیہ، حجۃ الشیعہ، محبت آل عبا، عقود اللآلی، صداقت الاسلام، قدیم چینی اخلاق، اخلاق النساء، اخلاق صوفیہ اور اخلاق المعصومین۔

۴۔ ناٹک:

خورشید، نور جہاں، نادر شاہ، شکنتلا، بکاؤلی، ٹھگ اور لالچی، شیخ چلی، حرکت میں برکت، نیم طبیب اور نیم ملا۔

۵۔ قصے اور ناول:

زینت، زنوبیہ، بابا دل، بچھی، عجیب طلسم، عجیب الماس، راحیل، شیطان کا مرید، شیطان کی نانی، عجیب باتیں، کاڈمبری، وامق اور عذرا۔

۶۔ تعلیمی اور علمی کتابیں:

سندھی زبان کی تاریخ، سندھی شاعری کی تاریخ، احوالِ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے رسالے کے کچھ سُروں کی شرح، دیوانِ گل کی شرح، مولِ رانو کی شرح، مصارع الامثال فارسی، شاعر ثابت علی شاہ اور اس کے مرثیے، شاہ کا رسالہ، سندھی گرامر سلیس، سندھی گرامر ثقیل، علم نحو، علم بدیع، سندھ کی طویل تاریخ، سندھ کی مختصر تاریخ، سندھ کا جغرافیہ، تعلیم نامہ، ورزش نامہ، نصیحت نامہ، عبادت نامہ، قدیم سندھ کے مشہور شہر اور افراد، قدیم سندھ کے ستارے، چچ نامہ (سندھی) کریمیں۔

۷۔ زنانہ تعلیم کی کتابیں:

زنانہ درجہ بدرجہ کتب، اخلاق النساء، ہدایت النسواں، صحت النساء، زنانہ تعلیم کی باتیں، عورت کے فرائض۔

۸۔ شاعری کی کتب:

زبور، یسوع مسیح کی سوانح عمری، عجیب جواہر، لالہ رخ، تحفۃ امامیہ، لیلیٰ مجنون، کشف اعجاز، رباعیات عمر خیام، موتیوں سے بھرا ڈبہ (دو حصے)، چندن ہار (دو حصے)، بیش بہا موتی (دو حصے)، سودائے خام (دو حصے)، ہزلیات، چیستانا، روشنائی نامہ، سعادت نامہ، طب طبعی، مثنوی جام جم، مثنوی تحفۃ الاحرار، مثنوی ترکیب الانسان اور شیریں فرہاد۔

۹۔ متفرقہ:

عجائب غرائب، علمی گلدستہ، الحیات بعد الممات، کیوں اور کیا، جوانی کی اکسیر، جنگ نامہ، رعیت نامہ، جارجیا یا گرجستان، ڈاڑھیارے پہاڑ کی سیر، بدائع الوقائع، سبزیوں کی ترکیبیں، عقل حیوانی اور اس کی مثالیں، سیوا سدن کے پرچے، تقریریں وتحریریں، یادیں، خان بہادر حسن علی آفندی کی سوانح عمری، حقیقت الربٰی، میری سوانح حیات، تاریخ القرآن والحدیث، لغاتِ قدیمی سندھی، طلب العلم فی الاسلام، شیخ بوعلی سینا اور امام محمد غزالی۔

مرزا صاحب کی ڈائری یا روزنامچے سے انتخاب

(نوٹ: مرحوم مرزا صاحب کی آخری ڈائری ۱۹۱۴ء سے ۱۰، جون ۱۹۲۹ء تک ہے۔ اس میں سے کچھ انتخاب یہاں شایع کیا جارہا ہے۔ واضح رہے کہ مرزا صاحب نے بتاریخ ۳، جولائی ۱۹۲۹ء کو وفات پائی)

۱۹۱۴ء

۱۱، اپریل: رات کو سڈنی بیگ کے بیوی بچے، مائی مہلی، مائی حرمت اور خدا بخش (ملازم و ملازمائیں) اور ہم سب خیر پور گئے۔ وہاں فجر کے وقت پہنچے۔ وہاں بہت طرح رہے۔ رات کے کھانے کے بعد، ایک ڈرامہ (جو کہ ہمیں دکھانے کے لیے تیار کیا گیا تھا) دیکھا۔ اور پھر "فیض محل" گئے۔

۱۱، اپریل: میاں پیر بخش، عبدالرحمان پیرزادہ، مسٹر عبدالغفور اور مسٹر ویرول سے ملے۔ شام کو شکار پور گئے۔ مسٹر پوکرداس، میر علی نوار خان اور دیگر افراد اسٹیشن پر ملنے آئے۔ رات ڈاک بنگلے میں گزاری، اور دن کو شہر گھومنے کے لیے گئے۔ شام کو پھر خیر پور لوٹے۔ بال بچے کار میں "فیض محل" دیکھنے گئے اور دوسرے دن سکھر گئے، جہاں سے شام کو واپس لوٹ آئے۔ میں رانی پور، دراز ا اور گمبٹ کی طرف گیا اور زیارت کی۔ پیر صاحب اور فرید صاحب سے ملا۔ شام کو واپسی ہوئی۔

۱۸، اپریل: شام کو کار میں واپس آ گئے۔ خیر پور میں نادر بیگ والے بھی ہم سے ملے تھے۔

۱۶، مئی: مسٹر پربھداس اور بول چند، نوودیالیہ (ہائی اسکول استاد) مجھے آس کی ٹولی (Band of Hope) والوں میں انعام تقسیم کرنے کے لیے لے گئے۔ وہاں کافی افراد تھے۔ سیکریٹری صاحب نے میری بہت تعریف کی اور مسٹر پربھداس نے بھی میرے متعلق بہت اچھے کلمات کہے۔ مجھے ایک میڈل دیا گیا اور ہار پہنایا گیا۔ کھیل وغیرہ ختم ہوئے تو میں نے بچوں کو انعامات دیے اور ایک مختصر سی تقریر بھی کی۔ کچھ اشعار لکھ کر لے گیا تھا، وہ بھی حاضرین کو سنائے۔ پھر دودھ کے گلاس سے تواضع کی گئی، آخر میں مجھے گاڑی پر گھر چھوڑنے آئے۔

۱۲، اگست: دو دن سے دریا میں بڑی طغیانی ہے۔ طغیانی کے سبب پچھلی والا بند ٹوٹ گیا اور گاؤں میں پانی بلا روک ٹوک آ گیا۔ ساتھ ہی ریلوے والا بند بھی ٹوٹ گیا۔ ایسا سیلاب آیا کہ گاؤں میں بھٹیوں کے گھر بہہ گئے چاروں طرف پانی کے جھاگ کی سفیدی نظر آ رہی تھی۔ اسی لیے ہم بال بچوں سمیت شام کے وقت گاؤں سے نکل کر محمد سلیمان صاحب والے گھر میں چلے گئے۔ دیگر مرزا صاحبان بھی گاؤں چھوڑ گئے۔

۲۰، اگست: شام کو واپس لوٹ کر اپنے گھر آئے۔

۲۴، اگست: آج عید الفطر ہے خیر سے تیس روزے پورے رکھے۔ عید کی نماز اپنے گاؤں والی مسجد میں پڑھی، جس کی تازہ مرمت ہوئی ہے۔ دن خیر و خوبی سے گزرا۔

۴، ستمبر: مسٹر آدرجی، میرے کالج کے دوست، چالیس سال بعد، یہاں وہاں کی سیاحت کرتے، سندھ آ کر مجھ سے ملے۔ کوئٹہ سے مجھے لکھ کر اپنے آنے کی خبر

دی تھی۔ مسٹر سوپاری والے کے پاس ٹھہرے تھے۔ انھیں کھانے پر بلایا، سڈنی بیگ (مرزا صاحب کے بھتیجے اور داماد) بھی ساتھ تھے۔ مسٹر ٹیکچند، سابق پبلک پراسیکیوٹر جو کالج کے دوستوں میں سے تھے وہ بھی دعوت پر مدعو تھے۔

۵، ستمبر: بوقت فجر میں مسٹر آڈوانی کے پاس گیا اور انھیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر میروں کے مقبرے دکھانے لے گیا واپسی میں مسٹر ٹیکچند کے پاس بھی گئے۔ مسٹر لیلا رام سنگ، جو کالج کے زمانے کے ساتھی تھے وہ بھی وہاں ملے۔ بیٹھے، خوب باتیں کی، چائے پی، میوے کھائے اور پھر مسٹر آڈوانی کو واپس پہنچایا کیونکہ انھیں کراچی کے لیے نکلنا تھا۔

۶، ستمبر: بروز اتوار، میں، سڈنی بیگ اور ناصر علی (مرزا صاحب کا بھانجا) پیدل ''گنجو ٹکر'' گھومنے گئے۔ وہاں ولاور پنہور اور ان کے بھائی، کھانا لے کر آئے جس میں جس میں مکھن اور شکر بھی شامل تھی، کھا کر تازہ دم ہوئے اور پھر واپس ہوئے۔ نہایت تھکے ہوئے تھے۔

۷، ستمبر: میں دیہہ نصرت (نواب شاہ)، اپنی زمین پر گیا۔ رات نواب شاہ میں گزاری شام کو اپنے کھیتوں کی طرف گئے۔ سکندر بیگ (مرزا صاحب کا بھتیجا) وہاں پہلے سے موجود تھا۔

۱۸، ستمبر: بروز جمعہ، اسد بیگ کی پہلی سالگرہ تھی، شادی کی تقریب جیسی عمدہ دعوت کی۔ آس پاس کے گھروں میں بھی کھانا بانٹا۔ بچوں کو اپنے گھر میں بلا کر بسکٹ، کیک، میوہ جات وغیرہ کھلائے، ہار پہنائے۔ میں نے اور سڈنی نے باہر اوطاق (بیٹھک) میں کھانا کھایا۔ اچھا وقت گزارا۔

۱۹، اکتوبر: ''سندھی ساہت سوسائٹی'' کا سالانہ جلسہ دو دن چلا۔ مجھے وہاں صدارت کے لیے بلایا گیا تھا۔ بہت سے لوگ آئے تھے۔ بہت اچھا پروگرام رہا۔

۳۱، اکتوبر: کل بروز جمعہ حج تھا اور آج عید الضحیٰ ہے۔ اختر بیگ (مرزا صاحب کے فرزند)۔ خیر پور سے اور سڈنی بیگ کراچی سے آئے ہوئے تھے۔ ہم باہر کہیں نہیں گئے۔ روزانہ بیٹھک میں شام کو نو دس بجے تک بیٹھتے تھے۔ مرزا علی شرف، مرزا علی اکبر، ناصر علی اور کئی دوسرے افراد آتے رہے۔ محرم کی آٹھ تاریخ کو مرزا امداد علی کی دعوت پر، منبر والی مجلس میں جا کر شریک ہوا۔

۵، دسمبر: آج اپنی زمین (دیہہ نصرت، نواب شاہ) گیا اور گندم کی کٹائی کروائی۔

۱۱، دسمبر: سرکاری پینشن کے آٹھ ہزار روپے ملے جو بینک میں رکھوائے۔

۲۷، دسمبر: اپنے بال بچوں، اختر اور ہمایوں کے ساتھ کراچی کی طرف گیا۔ خیر پور کے اسٹیٹ بنگلے میں رہے کیونکہ ابھی تک ہمارا اپنا بنگلہ خالی نہیں ہو سکا ہے۔

۱۹۱۵ء

۱، جنوری: خیر پور والے اسٹیٹ بنگلے سے سامان اٹھا کر، سینٹرل ہوٹل کے برابر والے بنگلے میں جا کر رہنے لگے۔ اختر بیگ اور ہمایوں واپس چلے گئے۔

۲۴، جنوری: مسٹر سورابجی، ان کی بیگم اور بچے شام کے وقت ہمارے پاس آئے۔ چائے وغیرہ ساتھ پی۔

۱۷، اپریل: مسٹر غلام علی چھاگلا، یوسف علی بھائی، غلام حسین قاسم، میر ایوب خان اور ڈاکٹر محمدی کو رات کے کھانے پر بلایا۔ صبح گھر والوں کو "ہوا بندر" گھمانے لے کر گئے۔ واپسی میں مسٹر غلام علی چھاگلا کے گھر سے بھی ہوتے آئے۔ اس سے قبل، ایک مکمل دن مسٹر غلام علی چھاگلا کے کلفٹن والے بنگلے میں گزارا۔ ایک دن مسٹر سورابجی اور کھمباتا کی دو بیٹیاں بھی ہمارے گھر آئی تھیں اور ہم بھی ان کے گھر بال بچوں سمیت گئے۔

۲۹، اپریل: ہم سب حیدرآباد پہنچے۔ سڈنی بیگ بھی اگلے روز کراچی سے حیدرآباد پہنچے کیونکہ اس کا تبادلہ سکرنڈ ہوگیا ہے۔

۱۹، جون: میں نبی بخش (ملازم) کو ساتھ لے کر رات والی گاڑی سے نواب شاہ گیا۔ سڈنی بیگ سے بھی وہاں ملاقات ہوئی۔ صبح زمین دیکھنے گئے۔ نیاز حسین (مرزا صاحب کا بھتیجا) بھی ہمراہ تھے۔ اتوار کا دن زمین پر گزار کر سڈنی اپنی منزل کی طرف گئے۔ شام کے وقت ہم بھی نواب شاہ سے واپس آگئے۔ سڈنی بھی وہاں ملے۔ ہم رات والی گاڑی سے واپس حیدرآباد پہنچے۔

۳، جولائی: کمشنر صاحب کا حکم ملا کہ مجھے سندھی زبان کا امتحان لینے کے لیے انگریزی افسروں کا ممتحن بنایا گیا ہے۔ میں امتحان لینے کراچی پہنچا اور ۷، جولائی کو واپسی پر حیدرآباد لوٹا۔ کراچی میں خیرپور اسٹیٹ بنگلے میں رُکا۔

۲۶، جولائی: بمطابق ۱۳، رمضان ۱۳۳۳ھ۔ بروز پیر، تین بج کر سات منٹ پر خدا نے ایک بیٹی سے نوازا۔ بچی کا نام ''شہزاد بیگم'' رکھا۔

۲، ستمبر: سندھ محمڈن ایجوکیشن کمیٹی کا اجلاس (جو سندھ کالج میں منعقد ہوا)، میں شرکت کے لیے کراچی گیا۔ ۴، ستمبر پھر حیدرآباد لوٹ آیا۔

۲، اکتوبر: عیدالضحیٰ کی عید تھی۔ سڈنی بیگ بھی آئے، دن عافیت سے گزرا۔

۷، نومبر: لاڑکانہ گیا۔ دن کو تین بجے وہاں پہنچا۔ لاڑکانہ کے بہت سے ہندو اور مسلمان مجھ سے ملنے کے لیے وہاں پہنچے۔ بڑی محبت سے ملے۔ مجھے ایک جلوس کی شکل میں لاڑکانے لائے۔ میں سرائی گوہر خان کے بنگلے میں رہا۔ مسلسل کانفرنس میں مصروف رہا۔ محمڈن ایسوسی ایشن والوں کے دیے ہوئے پتہ کے مطابق میں نے مدرسہ دیکھا۔ وہاں سے ۹ تاریخ کی شام۔ حیدرآباد

کے لیے روانہ ہوا۔ ہندو اور مسلمان مل مجھے اسٹیشن پر الوداع کہنے آئے۔ ۱۰ تاریخ کی صبح حیدرآباد اپنے گھر خیریت سے پہنچا۔

۱۹۱۶ء

۲۱، جنوری: میں گذشتہ دسمبر کی ۲۹ تاریخ کو نمونیا میں مبتلا ہو گیا۔ سول سرجن کو بتایا تھا۔ اللہ پاک نے مہربانی کی اور میں ٹھیک ہو گیا۔ آج ۲۱ تاریخ کو پہلی بار اپنی بیٹھک سے نکل کر کچھ چلا پھرا ہوں۔ میری بہن کا انتقال ۹، جنوری کو ہوا مگر چونکہ میں بیمار تھا اس لیے گھر والوں نے مجھے یہ اطلاع نہیں دی اور آج جب مجھے علم ہوا ہے، میں بہت صدمے میں ہوں۔ سدنی بیگ دوبارہ چھٹی لے کر مجھے دیکھنے آئے۔ ایک بار نادر بیگ بھی آئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے دوست احباب مجھے دیکھنے آئے۔

۱۳، فروری: بروز اتوار میں کراچی گیا اور دو دن تک وہاں رہا۔ مسٹر غلام علی چھاگلا کی معرفت اپنا پہلا بنگلہ ڈاکٹر خوبچند کو چالیس ہزار روپے میں بیچ دیا۔ ۱۶ تاریخ کے دن گاڑی میں واپس حیدرآباد آ گیا۔

۴، مئی: ایجوکیشن کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لیے کراچی گیا۔ تین دن کراچی رہ کر لوٹ آیا۔

۱۹۱۷ء

۱۰، جنوری: میں کراچی گیا۔ بمبئی کے گورنر صاحب کے پاس ڈیپوٹیشن کے کاغذات جانے تھے۔ اسٹیٹ بنگلے میں مسٹر بھرگڑی پہلے سے رہائش پذیر تھے لہٰذا میں نادر بیگ کے پاس رہا۔ مسٹر جہانگیر کرتواں، دستور اور ڈاکٹر ڈھلاس سے بھی ملاقات ہوئی۔ ۱۴، مارچ کراچی سے حیدرآباد لوٹ آیا۔

۷، مارچ: شام مسٹر حامد علی آئے۔ کھانا ساتھ کھایا۔ انھوں نے کل اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی لہٰذا میں انھیں حیدرآباد اسٹیشن پر لینے پہنچا۔

۱۲، مارچ: آج میں خیرپور میرس گیا۔ دو دن وہاں رہا۔ بھائی محمد ابراہیم کے ساتھ گاڑی میں ہوا خوری اور سیر کرنے گئے۔ ایک رات وہاں کے معزز افراد کی دعوت میں شرکت کی۔

۱۵، مارچ: ہم خیرپور سے بذریعہ گھوڑا گاڑی سکھر گئے۔ بھائی محمد داؤد اور قاضی عبدالقیوم بھی ہمراہ تھے۔ اسٹیٹ بنگلے میں پہنچے۔ دوپہر کے بعد مسلمانوں کی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت میرے ذمے تھی۔ میں نے مسلمانوں کی علمی و ادبی ترقی کی بابت ایک تقریر کی۔ مزید دو دن وہیں رہے کیونکہ صبح و شام کانفرنس میں شریک ہونا تھا۔ بہت اچھی کانفرنس رہی۔ بہت سی تقاریر اور اشعار پڑھے گئے۔ لوگوں نے عطیات بھی دیے بلکہ یوں لگ رہا تھا گویا روپوں کی برسات ہو رہی ہو۔ ہم ۱۷ تاریخ کی شام کو وہاں سے روانہ ہو کر حیدرآباد لوٹ آئے۔ دوستوں نے شکارپور چلنے اور مزید ایک روز سکھر گزارنے پر اصرار کیا مگر میں نہ رک سکا اور حیدرآباد واپس آ گیا۔

۱۸، مارچ: عبداللہ (ملازم) کو ساتھ لے کر کراچی گیا۔ کینٹ اسٹیشن پر نادر بیگ ایک اور صاحب کے ساتھ ملے۔ ہم ساتھ اسٹیشن تک آئے جہاں استقبال کرنے کے لیے ہندو و مسلمانوں کا اچھا خاصہ گروپ کراچی سے پہنچا ہوا تھا۔ انھوں نے ایک عمدہ ہار میرے گلے میں ڈالا۔ پھر ہم اسٹیٹ بنگلے پہنچے۔ دوسرے دن ''اردو کانفرنس'' تھی۔ جس کی صدارت میرے ذمے تھی۔ بہت زیادہ لوگ تھے۔ میں نے تقریر کی۔ مسٹر بھرگڑی بھی اسٹیٹ بنگلے میں میرے ساتھ تھے۔

۲، اپریل: شام کو کمشنر صاحب کی پارٹی میں جانے کے باعث رات کو دیر سے پہنچا۔ بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔

۳، اپریل: کراچی سے حیدرآباد، پھر حیدرآباد سے میرپور خاص گیا۔ مسٹر عبدالقادر اور محمد حسین بھی میرپور خاص تک ساتھ تھے۔ ۶ تاریخ کو سڈنی بیگ بھی ایک ہفتے کی چھٹی پر آئے اور گیارہ تاریخ کی شام واپس چلے گئے۔

۵، مئی: بذریعہ ٹرین میرپور خاص سے حیدرآباد پہنچے۔ مرزا علی حسینی اور اختر ہمراہ تھے۔ مرزا علی اکبر اسٹیشن پر لینے آئے تھے۔ خیر سے گاؤں واپس پہنچے۔ معلوم ہوا ہمارے جانے کے بعد کمروں سے پندرہ عدد مردہ چوہے نکالے گئے ہیں۔ ڈاکٹروں کے مشورے سے کمروں میں دوائیوں کا چھڑکاؤ کر کے کمرے صاف کروائے گئے۔

۷، جولائی: شام کو بھائی محمد ابراہیم، مسٹر غلام حسین، مسٹر ضیاء الدین اور مسٹر آخوند کی دعوت کی۔ مسٹر بھرگڑی اپنی بیماری کے باعث شریک نہ ہو سکے۔

۱۱، جولائی: بروز جمعرات رمضان کی عید ہوئی۔ خیر سے رمضان کے تیسوں روزے رکھے۔ گاؤں والی مسجد میں عید نماز پڑھی۔ سید محمد شاہ نے نماز اور خطبہ پڑھایا۔ سارا دن خیر و خوبی سے گزرا۔

۱۰، اگست: شام کو کھیم پریتم داس کی پارٹی میں گیا۔ ہوم رول کانفرنس والے لوگ بھی مدعو تھے۔ مسز سروجنی نائیڈو، مسٹر غلام علی چھاگلا، یوسف علی بھائی اور دیگر بھی پارٹی میں موجود تھے۔

۱۵، ستمبر: آج سیشن جج کی دعوت پر ان کے بیٹے کی آمد کی خوشی میں ہونے والی پارٹی میں شرکت کی۔ واپسی میں مسٹر منیرام مجھے گھر تک چھوڑنے آئے۔

۱۷، ستمبر: بروز منگل عیدالضحیٰ تھی۔ گاؤں والی مسجد میں نماز پڑھی۔

۵، اکتوبر: مسٹر پربھداس کے کہنے پر، اپنی بیسنت ہال میں ڈاکٹر ہرنامداس کے لیکچر میں بطور صدر شریک ہوا۔ مجھے لینے اور واپس ڈراپ کرنے کے لیے گاڑی کی سہولت دی گئی۔

۱۹۱۸ء

۸، اپریل: میں اور سڈنی بیگ بال بچوں کے ساتھ، شام والی ٹرین میں، اپنے گاؤں کے اسٹیشن سے سوار ہو کر میر پور خاص گئے۔

۹، مئی: میر پور خاص سے لوٹ کر حیدرآباد آئے۔ سڈنی بیگ والے وہیں رہے۔ میر پور خاص میں میر صاحبان سے بھی ملاقات رہی۔ ''کاہو جوڈرو'' بھی گھومنے گئے۔

۲۵، مئی: ۳ شعبان ۱۳۳۵ھ مجھے بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام افضل بیگ رکھا۔

۲۹، مئی: شام کو افضل بیگ کی چھٹی تھی۔ مٹی کا طوفان ایسا آیا کہ دن رات میں بدل گیا۔ جب یہ طوفان تھما تو خوب برسات آئی جس کے سبب کوئی بھی دعوت میں نہ پہنچ سکا۔ اس کے باوجود بھی ہم نے بتاشے اور مٹھائی وغیرہ بانٹے۔ دوسرے دن خواتین ملنے آئیں۔

۲۸، ستمبر: آج جمعہ ہے اور عیدالضحیٰ۔ گاؤں والی مسجد میں عید نماز پڑھی۔ دوسرے دن بکرے کی قربانی کی اور اس کا گوشت بانٹا۔ وقت خیر وخوبی سے گزر گیا۔

۶، اکتوبر: مطابق ۱۸ ذوالحج۔ بروز ہفتہ عید غدیر تھی۔ انجمن امامیہ کی دعوت پر مقبروں والی مسجد میں جا کر نماز پڑھی۔ نادر بیگ بھی وہیں آ کر مجھے ملے۔ ان کے ساتھ شہر تک آیا کیونکہ انھیں کراچی لوٹنا تھا۔

۱۷، اکتوبر: آج کا سوئم تھا شام کو حسب دستور نذر و نیاز دلوایا۔ ۱۹، اکتوبر سڈنی بیگ نے بذریعہ خط بتایا کہ دلشاد بیمار ہے۔ میں نے تار بھیجا۔ شام کو مرزا فیض احمد کی

عیادت کے لیے گیا کیونکہ وہ بیمار تھے۔ رات کو آٹھ نو بجے ان کی وفات ہوگئی۔ ناصر بیگ چھٹی پر آئے ہوئے تھے وہ خیر پور روانہ ہوئے۔ میں فیروز بیگم کی بیماری کی وجہ سے زمین پر نواب شاہ اور خیر پور نہ جاسکا۔

۱۲، نومبر: میں مسٹر بھرگڑی کے پاس ان کی بیگم کے انتقال پر تعزیت کے لیے گیا۔ مقبروں کی زیارت کی۔ ایجوکیشنل انسپکٹر کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ مسٹر گبسن سے بھی ملا۔ آج جرمنی سے بھی ایک تار آیا۔

۳، دسمبر: سڈنی بیگ کے خط سے معلوم ہوا کہ شمشاد کو پیٹ کی تکلیف کی وجہ سے سول سرجن نے آپریشن کا مشورہ دیا ہے لہٰذا مجھے کراچی آنے کے لیے کہا ہے۔ میں سید احمد شاہ (ملازم) کے ساتھ کراچی گیا اور سات تاریخ کو پھر واپس حیدرآباد پہنچا۔ شمشاد میرے کراچی پہنچے والے دن سے ہی خود کو بہتر محسوس کررہا تھا لہٰذا ڈاکٹر بولچند نے آپریشن کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس اچھی خبر سے زیادہ فکر اور انتظار کی زحمت سے بچ گئے۔ اچھا وقت گزرا۔ مسٹر آخوند بھی وہیں تھے۔ مسٹر بھرگڑی نے بھی آکر ملاقات کی۔

۱۹۱۹ء

۵، فروری: آج میں کراچی گیا کیونکہ بمبئی کے گورنر کے پاس مسلمانوں کی ڈیپوٹیشن کے سلسلے میں ملنا تھا۔ پانچ دن وہاں رہ کر، دس تاریخ کو وہاں سے لوٹ کر حیدرآباد پہنچا۔ اچھا وقت گزرا۔ پارٹی میں بھی شرکت کی۔ خیر پور کے اسٹیٹ بنگلے میں ٹھہرا جہاں سڈنی بیگ اور نادر بیگ بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔

۲۹، مارچ: سوسائٹی نے میلۂ مویشیاں کروایا تھا جہاں میں بھی ممبر تھا۔ مسٹر کرک پیٹر نے شام کو پارٹی دی۔ مجھ سمیت کئی معزز افراد شریک ہوئے۔

۳۰، اپریل: شام کو مرزا محمد حسین کی شادی مرزا علی یار کی صاحبزادی سے انجام پائی۔ دس بجے مرزا اشرف بیگ نے نکاح پڑھایا۔ میں وکیل بنا جبکہ مرزا حیدر قلی اور مرزا احمد حسین گواہ بنے۔ رات کو بارہ بجنے میں بیس منٹ باقی تھے کہ مجھے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ دائی پھلو اور اس کی بیٹی موجود تھیں۔ بچے کا نام اکمل بیگ رکھا گیا۔

۳۰، جون: رمضان المبارک کی عید آج پیر والے دن ہوئی۔ نماز اور خطبہ مرزا علی اشرف نے پڑھایا۔ شکر کہ وقت خیریت سے گزرا۔

۶، ستمبر: آج عید الضحیٰ تھی۔ سڈنی بیگ صبح سکھر سے پہنچے۔ اختر بیگ کراچی سے آئے۔ عید کی نماز گاؤں والی مسجد میں ادا کی۔ مرزا علی اشرف بیگ نے نماز اور خطبہ پڑھایا۔ بکرے کاٹ کر قربانی کی۔ شام کو آغا لطف علی شاہ اور مرزا دوست محمد خیرپوری وغیرہ عید ملنے بیٹھک پہنچے۔

۱۱، ستمبر: شام کو میں منوچہر بیگ (مرزا صاحب کے بھتیجے) کے کہنے پر ان کے ساتھ کھنڈرا گیا۔ پانچ دن وہاں رہنے کے بعد سترہ تاریخ کی دوپہر لوٹ کر حیدرآباد آیا۔ وہاں صبح و شام گھومنے پھرنے کے لیے جاتے تھے۔ منوچہر بیگ نے مجھے بہت آرام و آسائش سے رکھا اور بہت خدمت کی۔

۲۰، ستمبر: رات کو میل سے خیرپور گئے جہاں بھائی محمد یوسف کی چھوٹی بیٹی کی شادی میر مقبول خان سے ہوئی تھی۔ ۲۴ تاریخ تک خیرپور میں ٹھہرے۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ سندھ اور دیگر علاقوں کے معزز افسران شادی میں شریک تھے۔ سب سے ملاقات رہی۔ گویے پیارے خان نے راگ سنایا۔ بہت اچھا وقت گزرا۔ پچیس تاریخ کو بذریعہ کار سکھر گیا۔ دن سڈنی بیگ کے پاس گزرا شام کو واپس خیرپور آ گیا جہاں سے بذریعہ ٹرین حیدرآباد آئے اور ۲۶ تاریخ کو گھر پہنچے۔ مسٹر اور مسز حامد علی، صاحبزادہ محمد خان، سید محمود شاہ اور دیگر بہت سے افراد ملنے آئے۔ ستمبر کی ۲۶ تاریخ کو محرم کی پہلی تاریخ ہوئی۔

عیادت کے لیے گیا کیونکہ وہ بیمار تھے۔ رات کو آٹھ نو بجے ان کی وفات ہوگئی۔ ناصر بیگ چھٹی پر آئے ہوئے تھے وہ خیر پور روانہ ہوئے۔ میں فیروز بیگم کی بیماری کی وجہ سے زمین پر نواب شاہ اور خیر پور نہ جاسکا۔

۱۲، نومبر: میں مسٹر بھرگڑی کے پاس ان کی بیگم کے انتقال پر تعزیت کے لیے گیا۔ مقبروں کی زیارت کی۔ ایجوکیشنل انسپکٹر کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ مسٹر گبسن سے بھی ملا۔ آج جرمنی سے بھی ایک تار آیا۔

۳، دسمبر: سڈنی بیگ کے خط سے معلوم ہوا کہ شمشاد کو پیٹ کی تکلیف کی وجہ سے سول سرجن نے آپریشن کا مشورہ دیا ہے لہٰذا مجھے کراچی آنے کے لیے کہا ہے۔ میں سید احمد شاہ (ملازم) کے ساتھ کراچی گیا اور سات تاریخ کو پھر واپس حیدرآباد پہنچا۔ شمشاد میرے کراچی پہنچنے والے دن سے ہی خود کو بہتر محسوس کررہا تھا لہٰذا ڈاکٹر بولچند نے آپریشن کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس اچھی خبر سے زیادہ فکر اور انتظار کی زحمت سے بچ گئے۔ اچھا وقت گزرا۔ مسٹر آخوند بھی وہیں تھے۔ مسٹر بھرگڑی نے بھی آکر ملاقات کی۔

۱۹۱۹ء

۵، فروری: آج میں کراچی گیا کیونکہ بمبئی کے گورنر کے پاس مسلمانوں کی ڈیپوٹیشن کے سلسلے میں ملنا تھا۔ پانچ دن وہاں رہ کر، دس تاریخ کو وہاں سے لوٹ کر حیدرآباد پہنچا۔ اچھا وقت گزرا۔ پارٹی میں بھی شرکت کی۔ خیر پور کے اسٹیٹ بنگلے میں ٹھہرا جہاں سڈنی بیگ اور نادر بیگ بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔

۲۹، مارچ: سوسائٹی نے میلہ مویشیاں کروایا تھا جہاں میں بھی ممبر تھا۔ مسٹر کرک پیٹر نے شام کو پارٹی دی۔ مجھ سمیت کئی معزز افراد شریک ہوئے۔

۳۰، اپریل: شام کو مرزا محمد حسین کی شادی مرزا علی یار کی صاحبزادی سے ہنجو میں ہوئی۔
بجے مرزا اشرف بیگ نے نکاح پڑھایا۔ میں وکیل بنا جبکہ مرزا حسین قلی بیگ اور
احمد حسین گواہ بنے۔ رات کو بارہ بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ مجھے یہ بیٹا
پیدا ہوا۔ دائی پھلو اور اس کی بیٹی موجود تھیں۔ بچے کا نام اس بیگ رکھا گیا۔

۳۰، جون: رمضان المبارک کی عید آج پیر والے دن ہوئی۔ نماز اور خطبہ مرزا علی اشرف
نے پڑھایا۔ شکر کہ وقت خیریت سے گزرا۔

۶، ستمبر: آج عید الضحیٰ تھی۔ سدنی بیگ صبح سکھر سے پہنچے۔ اختر بیگ کراچی سے
آئے۔ عید کی نماز گاؤں والی مسجد میں ادا کی۔ مرزا علی اشرف بیگ نے نماز
اور خطبہ پڑھایا۔ بکرے کاٹ کر قربانی کی۔ شام کو آغا لطف علی شاہ اور مرزا
دوست محمد خیر پوری وغیرہ عید ملنے بیٹھک پہنچے۔

۱۱، ستمبر: شام کو میں منوچہر بیگ (مرزا صاحب کے بھتیجے) کے کہنے پر ان کے ساتھ
کھنڈرا گیا۔ پانچ دن وہاں رہنے کے بعد سترہ تاریخ کی دوپہر لوٹ کر
حیدرآباد آیا۔ وہاں صبح و شام گھومنے پھرنے کے لیے جاتے تھے۔ منوچہر
بیگ نے مجھے بہت آرام و آسائش سے رکھا اور بہت خدمت کی۔

۲۰، ستمبر: رات کو میل سے خیر پور گئے جہاں بھائی محمد یوسف کی چھوٹی بیٹی کی شادی میر
مقبول خان سے ہوئی تھی۔ ۲۴ تاریخ تک خیر پور میں ٹھہرے۔ شادی بڑی
دھوم دھام سے ہوئی۔ سندھ اور دیگر علاقوں کے معزز افسران شادی میں
شریک تھے۔ سب سے ملاقات رہی۔ گویے پیارے خان نے راگ سنایا۔
بہت اچھا وقت گزرا۔ چوبیس تاریخ کو بذریعہ کار سکھر گیا۔ دن سدنی بیگ کے
پاس گزرا شام کو واپس خیر پور آ گیا جہاں سے بذریعہ ٹرین حیدرآباد آئے اور
۲۶ تاریخ کو گھر پہنچے۔ مسٹر اور مسز حامد علی، صاحبزادہ محمد خان، سید محمود شاہ اور
دیگر بہت سے افراد ملنے آئے۔ ستمبر کی ۲۶ تاریخ کو محرم کی پہلی تاریخ ہوئی۔

۴، اکتوبر: آپس میں صلاح مشورہ سے ہم نے طے کیا کہ مل کر ایک ''کوآپریٹو سوسائٹی'' بنائی جائے لہٰذا میں نے خط لکھ کر مسٹر عظیم خان کو بلایا۔ انھوں نے قانون کی روشنی میں مشورے دیے اور کام شروع ہوگیا۔ مسٹر عظیم خان کے لیے دوپہر کے کھانے کا اہتمام بیٹھک میں کیا گیا تھا۔ مرزا علی بیگ مدد کے ساتھ بھی ان کے ممبر بننے کے بارے میں نشست آج ہی تھی۔

۶، اکتوبر: آج یوم عاشورہ تھا۔ اختر بیگ یہیں تھے۔ سڈنی بیگ اس لیے نہ آسکے کہ عموماً وہ عاشورہ حیدرآباد میں گزارتے ہیں۔ نذر نیاز کے بعد، فرخ بیگ والوں کی بیٹھک میں ساتھ کھانا کھایا۔ اس سال اتفاق سے محرم اکتوبر میں آیا۔ اصل عاشورہ کا دن بھی دس اکتوبر ۶۸۱ء بمطابق محرم ۶۱ھ تھا۔ میری پیدائش بھی ۴ محرم اور ۱۴ اکتوبر ۱۸۵۳ء کو ہوئی تھی۔

۱۳، اکتوبر: آج میں کلکٹر حیدرآباد سے ملنے گیا۔ سڈنی بیگ بھی دیوالی کی چھٹی پر یہاں آئے ہوئے تھے۔ شام کو مسٹر اور مسز حامد علی خان ہمارے پاس آئے۔ کھانا ہم نے ساتھ کھایا۔ منوچہر بیگ، فرخ بیگ، سکندر بیگ اور سڈنی بیگ بھی کھانے میں شریک تھے۔ کھانا بہت لذیذ تیار ہوا تھا۔ خیریت سے وقت گزرا۔

۲۵، اکتوبر: انجینئر صاحب کی دعوت پر شام کو نو بجے گیا۔ فرخ بیگ بھی ہمراہ تھے۔ مسٹر اور مسز حامد علی بھی وہاں بطور مہمان شریک تھے۔ اچھا وقت گزرا۔

۲۱، نومبر: سہون کے ڈپٹی صاحبزادہ محمد خان، چھٹیوں میں اپنے علاقے کو جا رہے تھے راستے میں ان کی ملاقات مرزا منوچہر بیگ سے ہوئی جو انھیں دعوت دے کر اپنے ساتھ لے آئے۔ پہلے دونوں میرے پاس پہنچے پھر ہم فرخ بیگ کی بیٹھک میں گئے اور وہیں کھانا کھایا۔ اس کے بعد ایک دوسرے کو خدا حافظ کیا۔ علم موسیقی کے بارے میں لکھی گئی تین کتابیں صاحبزادہ محمد خان پڑھنے کے لیے مجھ سے لے گئے۔

۲۲، دسمبر: بھائی محمد ابراہیم کا پیغام ملا۔ مسٹر محمد حسین علی بھی آئے اس لیے خیرپور روانہ ہوگیا کیونکہ وہاں "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" میں شریک ہونا تھا۔ فرخ بیگ، سکندر بیگ اور سڈنی بیگ بھی وہاں موجود تھے۔ ۳۰ تاریخ کو میں، سڈنی بیگ اور فرخ بیگ سکھر گئے اور سڈنی بیگ کے گھر رکے۔ وہاں قنبر علیؒ سے بھی ملاقات ہوئی۔ ۳۱، دسمبر کی شام میں، قنبر علی، ناصر علی اور سکندر علی کے ساتھ حیدرآباد پہنچا۔

۱۹۲۰ء

۶، جنوری: سکھر سے پیغام پہنچا کہ سڈنی بیگ کے ہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی ہے جس کا نام جمشید رکھا ہے۔ یہ ۱۴، ربیع الآخر ۱۳۳۷ھ ہے۔

۱، مارچ: ٹنڈو میں کوآپریٹو اسٹورز سوسائٹی بنائی گئی۔ ایک سو روپے کے شیئر اور ایک سو روپیہ بطور امانت رکھوایا۔

۵، مارچ: بمطابق ۱۴، جمادی الآخر ۱۳۳۷ھ، نادر بیگ کو بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ذاکر بیگ رکھا گیا۔

۳، مارچ: میں صاحبزادہ محمد خان کے اصرار پر سیہون گیا اور ۵، اپریل کو وہاں سے لوٹا۔ تخی شہباز قلندر اور سید ثابت علی شاہ کے مزاروں پر حاضری دی۔ ۲، اپریل کو فرخ بیگ بھی پہنچے۔ ۴، اپریل کو بوبک گئے جہاں منچھر جھیل کی سیر کی۔ فرخ بیگ نے وہاں شکار بھی کیا۔ مسٹر گوبندرام، حیدر ولی محمد شاہ اور دیگر معزز افراد شامل ہوئے۔ صاحبزادہ محمد خان نے نہایت عمدہ بندوبست کیا ہوا تھا۔ وقت بہت اچھا گزارا۔

۲۴، اپریل: صبح مسٹر حامد علی آئے اور دوپہر کو میں کمشنر صاحب سے ملنے گیا۔

۲۸، اپریل: مسٹر آخوند، مسٹر قاضی اور مسٹر بھر گڑی شام کو ملاقات کے لیے آئے۔ ان کے ہمراہ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ اچھی ملاقات رہی۔

۲۴، مئی: شام کو برسات آئی۔ ساتھ اولے بھی گرے جس سے دروازوں پہ لگے شیشے ٹوٹ گئے۔

۱۹، جون: بروز ہفتہ، عید الفطر آئی۔ سب نے مل کر گاؤں والی مسجد میں عید نماز ادا کی۔ آخوند میاں احمد نے عید کا خطبہ دیا۔ منو چہر بیگ اور فرخ بیگ والے بھی ہمراہ تھے۔ میرے چھوٹے بچے وہیں تھے مگر بڑے بچے موجود نہ تھے۔ چھوٹوں میں سے بھی اسد بیگ کو دو تین دن سے بخار آ رہا تھا مگر اس کے باوجود بھی وہ مسجد میں آیا۔ منو چہر بیگ عید کی مبارک باد دینے ہمارے گھر آئے۔ شام کو میں بھی ان سب سے عید ملنے چلا گیا۔ دو دن سے عبداللطیف (ٹھٹھہ کے استاد) ہمارے پاس مہمان ہیں۔

۲۶، جون: صبح والی ٹرین میں مرزا نادر بیگ کے پاس کراچی گیا۔

۱، جولائی: میرے بیوی بچے حیدرآباد سے کراچی مرزا نادر بیگ کے پاس پہنچے۔

۳، جولائی: نیا گھر (جو مسٹر غلام علی چھاگلا کی معرفت خریدا تھا) میں رہائش اختیار کی۔

۵، جولائی: مسٹر غلام علی چھاگلا شام کو آئے اور اپنی گاڑی میں مجھے گھمانے کلفٹن لے گئے۔ وہاں کھانا کھایا۔ کچھ بنگالی صاحبان کا گانا وغیرہ سنا۔ آدھی رات کے وقت مسٹر چھاگلا مجھے گھر چھوڑ گئے۔

۶، جولائی: مسٹر سورابجی آج بنگلے پر آ کر ملے۔

۷، جولائی: دلشاد اور شہزاد کو مس روز سٹر کے انگلش میڈیم اسکول میں داخل کروایا جبکہ اسد بیگ اور افضل بیگ کو سولجر بازار والے اُردو میڈیم اسکول میں داخل کیا۔

۱۰، جولائی: رات کو، کراچی والے بنگلے میں برآمدے والی کھڑکی سے کوئی شخص اندر کودا اور میری لوہے کی صندوق اور سلائی مشین چرا کر لے گیا۔ پیٹی میں نہ صرف میرے سب کپڑے بلکہ پانچ سو روپے بھی تھے۔ اس کے علاوہ میری دو عدد گھڑیاں بھی اسی میں تھی۔ مجموعی طور پر سارا سامان کوئی سات، آٹھ سو روپے مالیت کا تھا۔ صبح کو نادر بیگ پہنچے اور پولیس میں رپورٹ درج کروائی۔ پیروں کے نشانات واضح تھے۔ پولیس انکوائری جاری ہے۔

۲۱، جولائی: گھوڑے سمیت ایک وکٹوریہ گاڑی چھ سو روپے میں خریدی، دو چار دن قبل ایک سلائی مشین بھی ۱۲۵ روپے میں خریدی تھی۔

۲۹، جولائی: شام کو ٹرین میں حیدرآباد گیا۔ مرزا منوچہر بیگ اور ناصر علی حیدرآباد کے اسٹیشن پر آئے۔ رات اپنی بیٹھک میں گزاری۔ ۳۰ تاریخ کی صبح ناشتے سے فارغ ہو کر شہر گیا۔ پہلے بھائی محمد ابراہیم سے ملا۔ پھر بمبئی بینک میں کچھ کام نمٹا کر، گاؤں چلا گیا۔ سب عزیزوں سے ملنے ان کے گھر گیا۔ مرزا منوچہر بیگ نے بے حد خیال رکھا۔ دوسرے دن مرزا علی اکبر بیگ کی طرف سے کھانا آیا۔ مرزا علی اشرف بیگ اور دیگر افراد بھی مجھ سے ملنے وقتاً فوقتاً آتے رہے۔ اختر بیگ بھی صبح میرے پاس آئے تھے۔ دوپہر کو کراچی کے لیے روانہ ہوا۔ اختر بیگ کوٹری تک میرے ساتھ چلے اور پھر سیہون چلے گئے۔ بہت اچھا ٹائم گزرا۔

۲۴، اگست: میں، سڈنی اور بال بچے مسٹر غلام علی چھاگلا کی موٹر کار میں منگھوپیر گئے۔ دو گھنٹے کے بعد واپسی ہوئی۔

۲۶، اگست: آج عیدالضحیٰ ہے۔ میں کراچی میں ہوں۔ سڈنی، نادر اور امداد حسین بھی میرے پاس ہیں۔ ہم چاروں مسٹر غلام علی چھاگلا کی مسجد میں نادر بیگ کی

گاڑی میں نماز پڑھنے گئے۔ شام کو ہم سب نے نادر خان کے بنگلے میں چائے پی۔ خیر سے اچھا وقت گزرا۔

۲۷، اگست: آج شام کو سندھ کالج کے شاگردوں کی دعوت پر گیا۔ مسٹر شاہانی (پرنسپل) بھی ہمراہ تھے وہاں تقریر کی اور کچھ اشعار بھی پڑھے۔

۱، ستمبر: شوجی ایجنٹ کی معرفت ایک پلاٹ ۱۲۸۲ یارڈ، فی یارڈ سوا آٹھ روپے کے حساب سے میں نے غلام مصطفیٰ محمد علی سے خریدا۔ ایک ہزار روپیہ بیانہ دیا اور باقی رقم تین ماہ کے اندر دینے کا وعدہ کیا۔

۱۶، ستمبر: سردار محمد خان یہاں آئے، چائے پی۔ پھر میں ان کے ساتھ اسٹیشن گیا۔ شام کو میر ایوب خان آئے۔ ملاقات ہوئی۔

۲۶، ستمبر: بروز اتوار، کراچی سے حیدرآباد پھر وہاں سے اپنے گاؤں ٹنڈو ٹھوڑو بیوی بچوں سمیت آ گیا۔ الھ وسایا بھی ساتھ تھا۔ اختر بیگ، مرزا منوچہر بیگ اور مرزا علی حسین حیدرآباد کے ٹرین اسٹیشن پر آئے۔ گاڑی اور دو عدد گھوڑے بھی ہم اپنے ساتھ لائے تھے۔

۱۶، دسمبر: میں عبداللہ (ملازم) کے ساتھ کراچی گیا۔ کالج میں چار عدد لیکچر دینے تھے۔ جن میں سے ایک لیکچر ہندو لڑکیوں کے ہائی اسکول میں دیا اور دوسرا غلام علی چھاگلا کی لائبریری میں۔ میں کافی تھک گیا۔ ۲۱ تاریخ کو واپس حیدرآباد آ گیا۔

۱۹۳۱ء

۱۲، فروری: بچیلی وھو گجی کی زمین ساڑھے تیرہ سو روپے میں بھائی چندی رام کو بیچ دی کیونکہ اسے آباد کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اچھے کسان بھی نہیں مل رہے تھے۔

۲، فروری: آج صبح سردار محمد خان آئے۔ وہ چھٹیوں میں اپنے علاقے کی طرف جا رہے تھے۔ دوپہر دو بجے تک میرے ساتھ رہے۔ ہم نے ساتھ کھانا کھایا۔ بہترین وقت گزرا۔

۲۵، مارچ: ''صوفی سماگم'' میں شریک ہوا۔ صوفیوں کے بارے میں ایک تقریر کی۔ اس سے قبل ۱۳، مارچ پر عید نوروز کے موقع پر کچھ شاعری بھی پڑھی تھی۔ مولوی علی صابری (لاہور) کے علاوہ کچھ اور حضرات بھی شریک ہوئے تھے۔

۲۷، مارچ: شام کو مسٹر غلام علی چھاگلا آئے۔ رات یہیں رہے۔ دوسرے دن دوپہر کو کراچی کے لیے روانہ ہوئے۔ رات کو مرزا منوچہر بیگ، مرزا فرخ بیگ اور سکندر بیگ بھی کھانے میں شریک ہوئے۔ دن کو اپنے باغات میں گھومتے پھرتے گئے۔

۶، اپریل: آج نواب شاہ گیا۔ شام کو مسٹر حامد علی کے ساتھ کھانا کھایا۔ نئے سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر پینٹ بھی ساتھ تھے۔ دوسرے دن اپنی زمین (نصرت دیہہ) پر گیا۔ دو دن وہاں رہ کر ۹ تاریخ کو واپس نواب شاہ آیا۔ مسٹر حامد علی اور میر مقبول خان سے پھر ملاقات ہوئی۔ شام کو حیدرآباد واپس ہوئی۔

۱۰، اپریل: شام کو مسٹر بھرگڑی کی پارٹی میں گیا جہاں مسٹر اور مسز ووڈ سے ملاقات ہوئی۔ مسٹر جمشید اور دیگر معززین بھی وہاں موجود تھے۔

۱۸، اپریل: اچانک ہمایوں گم ہو گیا۔ پتہ چلا کہ کل اسے اس کے ماموں نے مارا تھا۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ سکھر چلا گیا ہے۔ شہر میں اسے بہت کھوجا مگر کہیں نہ ملا۔ سکھر تار بھیجا گیا۔

۲۱، اپریل: بمطابق ۱۲، رجب ۱۳۳۹ھ بروز جمعرات پونے چھ بجے شام مجھے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ دائی موجود تھی۔ لیڈی ڈاکٹر کو بھی بلایا گیا تھا۔ بچے کا نام اجمل بیگ رکھا گیا۔

۲۶، اپریل: آج اجمل بیگ کی چھٹی کی۔ شام کو کمیٹی کے سلسلے میں جج کے پاس گیا۔ وہاں سے واپسی ہوئی۔ گھر میں بہت سی خواتین، مرد اور دیگر عزیز خویش آئے۔ دن کو بتاشے اور مٹھائی کی نیاز دی گئی۔ رات کو کھانا، پان سپاری اور عطر بانٹا گیا۔ تقریباً دس بجے کے قریب تمام لوگ واپس چلے گئے۔ بچے کا صدقہ بھی دیا گیا۔

۸، جون: آج عید الفطر ہے۔ بدھ کا دن ہے۔ الحمد للہ پورا مہینہ روزے رکھے گو دن بہت گرم تھے۔ بھائی محمد ابراہیم، محمد داؤد، محمد یوسف قریشی اور ان کے بال بچے بھی آئے۔ آخوند احمد کو نماز اور خطبے کے لیے کہا گیا۔ سڈنی بیگ بھی موجود تھے۔ سب نے مل کر گاؤں والی مسجد میں نماز پڑھی۔ دوپہر کا کھانا سب نے بیٹھک میں کھایا۔ مرزا فرخ بیگ، سکندر بیگ اور مرزا اکبر بھی شامل ہوئے۔ دو بجے کے قریب سب لوگ لوٹ گئے۔ شام کو بہن کے گھر بھی گیا۔

۹، جون: مرزا منوچہر بیگ کے گھر پر کھانا کھایا اور زمین کے بٹوارے کے متعلق آپس میں گفت وشنید کی۔

۱۱، جون: سڈنی، منوچہر، آصف علی اور میرے بچوں نے، مرزا منوچہر بیگ کے گھر میں ''شیخ چلی'' کا ڈرامہ کیا۔ ہم سب مرد و خواتین مرزا منوچہر بیگ کے گھر کے آنگن میں ڈرامہ دیکھنے کے لیے جمع ہوئے۔

۱۸، جون: صبح کو ٹرین میں کراچی گیا۔ عبداللہ (ملازم) کو ایک دن قبل ہی بھیج دیا تھا۔ نادر بیگ اسٹیشن پر لینے آئے اور اپنے گھر لے گئے۔ رات کو اسلام کلب میں بڑی دعوت تھی۔ کراچی کے تمام معززین شریک ہوئے جن سے بہت اچھی ملاقات رہی۔ آدھی رات کے وقت دعوت سے واپس گھر لوٹے۔ دوسرے

دن مسٹر غلام علی چھاگلا اپنے بیٹے کے ہمراہ میرے پاس آئے۔ شام کو میں بذریعہ ٹرین کراچی سے روانہ ہو کر گھر پہنچا۔

۳۱، جولائی: ہمایوں نے قرآن کریم حفظ کرلیا۔ اس کے حفظ قران کی خوشی میں اس کے ماموں نے ایک بڑی محفل کا اہتمام کیا۔ تمام عزیزوں کو دعوت دی اور بڑے پیمانے پر کھانا بنوایا۔

۱۵، اگست: آج عیدالضحیٰ ہے۔ سڈنی، منوچہر بیگ، اختر بیگ، فرخ بیگ اور سکندر بیگ کے ہمراہ پہنچے۔ بھائی محمد ابراہیم اور محمد داؤد بھی آئے۔ ہم سب نے ایک ساتھ نماز ادا کی۔ آخوند احمد نے خطبہ دیا اور نماز بھی پڑھائی۔ شام کو پھلیلی کے کنارے والے باغ میں فرخ بیگ والوں نے کچھ افراد کو بلایا تھا۔ وہاں چائے کے ساتھ کباب کھائے۔ دوسرے دن ہم نے قربانی کی۔

۱۳، ستمبر: آج عشرہ محرم ۱۳۷۰ھ، بروز بدھ، محرم کی چھ تاریخ، مرزا فرخ بیگ کی بیٹھک میں مجلس اور نیاز کا کھانا تھا۔ آج ہی مرزا علی اکبر نے بھی مجلس کی دعوت بھجوائی۔ دستور کے مطابق تمام امام بارگاہوں پر نیاز کے لیے رقم بھجوا دی تھی۔ آج کے دن حسب دستور، نذر نیاز گھر میں کی۔ خیر سے وقت گزرا۔

۵، اکتوبر: مسٹر اور مسز حامد علی۔ دو سال کی چھٹیوں پر جا رہے تھے لہٰذا ہم نے انھیں دعوت پر بلایا۔ شام کو وہ لوگ آئے۔ بیٹھک میں فرخ بیگ اور سکندر بیگ، زنان خانے کے اندر مسز فرخ بیگ اور مسز منوچہر بیگ وغیرہ نے کھانا کھایا۔ اتفاقاً پان میں زیادہ چونا لگ جانے کے باعث میرے اور بچوں کے منہ میں چھالے نکل آئے۔

۱۴، اکتوبر: نادر بیگ اور اشا قلی آئے۔ ایک کیس کے سلسلے میں نادر بیگ اپنے بال بچوں کے ساتھ کوٹری آئے اور بھائی محمد ابراہیم کے گھر

رہے کیونکہ وہاں ایک پروگرام ہونا تھا۔ چائے سے فارغ ہوکر نادر اور اسا قلی چلے گئے۔ شام کو مسٹر جان محمد بھرگڑی نے مسٹر غلام حسین کی دعوت کی تھی، جس میں مجھے بھی شرکت کے لیے کہا گیا تھا۔ میرے ساتھ فرخ بیگ اور سکندر بیگ بھی تھے۔ دوسری صبح میں مسٹر غلام حسین سے ملنے گیا۔ اور شام کو وہ خود مجھ سے ملنے میری بیٹھک پہ آئے۔

۱۵، دسمبر: کمپلسری ایجوکیشن کمیٹی کے سامنے گواہی تھی لہٰذا کراچی گیا۔ دو دن وہاں رہا اور ۱۸، دسمبر کو لوٹ آیا۔

۲۳، دسمبر: بھائی محمد داؤد کا انتقال ہوا۔ میں قبرستان تک ساتھ گیا۔

۲۴، دسمبر: سندھ کے شاعروں کی پہلی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے، آج دن والی ٹرین میں، میں لاڑکانہ گیا۔ مجھے وہاں صدارت کرنی تھی۔ اسٹیشن پر مرزا منو چہر بیگ اور دوسرے بہت سے لوگ، گلاب کے ہار لیے منتظر تھے۔ جلوس کی صورت میں مجھے وہاں سے گھر تک لے جایا گیا۔ شام کو سب معزز افراد ملاقات کے لیے آئے۔

۲۵، دسمبر: کانفرنس شروع ہوئی۔ رپورٹیں پڑھی گئیں۔ تقاریر ہوئیں۔ میرے جوابات مختصر تھے۔ شام کو سبجیکٹ کمیٹی کی میٹنگ میں نہ جاسکا مگر اس میں ہونے والی ساری کارگزاری کا احوال مجھے دیا گیا۔

۲۶، دسمبر: ابتداء میں میری تقریر تھی۔ جس کا موضوع تھا ''شاعری کی شان وشوکت'' اس کے بعد مصرع طرح پر مشاعرہ رکھا گیا تھا۔ دن کا کھانا سب نے مدرسے میں کھایا شام کو سب کا گروپ فوٹو بنا۔ رات کو سرائی غلام محمد اسران کے پاس دعوت پر گیا۔

۲۷، دسمبر: صبح کو مرزا منو چہر بیگ حیدر آباد کے لیے روانہ ہوئے اور میں شکار پور کے لیے۔ مسٹر پوکر داس ٹرک اسٹیشن پر آئے تھے۔ کار اور گھوڑا گاڑی کے ذریعے شکار پور گھومے۔ سرکاری باغ بھی دیکھا۔ بہت سے لوگوں سے ملے۔ تین بجے سکھر روانہ ہوئے۔ کئی افراد اسٹیشن پر ہمیں رخصت کرنے کے لیے آئے۔

۲۸، دسمبر: سکھر میں رہے۔ اور دوسرے دن میں اور سڈنی بیگ خیر پور پہنچے۔ وزیر شیخ محمد قادر صاحب نے خط اور گاڑی بھجوائی۔ شام کو ڈپٹی کلکٹر گور داس سنگھ کی پارٹی میں بھی گئے۔

۲۹، دسمبر: سکھر سے روانہ ہوئے حیدر آباد پہنچے۔

۱۹۲۲ء

۹، فروری: شام کو ہم نے ڈاکٹر عبدالمجید کی دعوت کی۔ قاضی غلام نبی کے علاوہ مرزا منو چہر بیگ اور سکندر بیگ بھی شریک ہوئے۔ اچھا وقت گزرا۔

۱۵، فروری: اگلے دن کلکٹر صاحب نے تار بھجوایا تھا کہ بھائی محمد ابراہیم عارضۂ دل کے باعث انتقال کر گئے۔ لہٰذا آج میں اور میری بیگم ان کے گھر تعزیت کے لیے گئے۔

۱۶، فروری: شام کو کمشنر صاحب کا دربار تھا مجھے بھی دعوت ملی تھی لہٰذا میں، سکندر بیگ اور علی اکبر دعوت میں گئے۔ مرزا فرخ بیگ نہ چلے۔ مجھے کمشنر صاحب کی طرف سے سونے کی گھڑی اور تعریفی سند دی گئی۔

۱۷، فروری: شام کو کلکٹر صاحب کے "ایٹ ہوم" گئے۔

۱۳، مارچ: آج لبو (ملازم) کے ساتھ کراچی پہنچا کیونکہ ۱۷، مارچ کو پرنس آف ویلز کی

آمد تھی۔ ۱۷ تاریخ کو باغ والی پارٹی میں شریک ہوا۔ وہاں سندھ کے بہت سے زمینداروں، جاگیرداروں اور دیگر معززین سے ملاقات رہی۔ میر علی نواز خان، صاحبزادہ محمد خان اور دیگر سے بھی ملاقات رہی۔ مسٹر برنس، ''دہلی گزیٹ'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر سے بھی ملاقات ہوئی۔ دوسرے دن ۱۸ تاریخ کو گونگے، بہرے بچوں کے اسکول کا سنگ بنیاد رکھا جانا تھا۔

۱۹، مارچ: آج مسٹر ملک کی پارٹی میں شرکت کے بعد، شام کو حیدرآباد واپس آ گیا۔

۲، اپریل: کچھ یوروپی افسران کا سندھی میں امتحان لینے کی غرض سے کراچی آنا پڑا۔ کمشنر صاحب نے یہ کام ذمے لگایا تھا۔ تین دن مسلسل، اس کام کے سلسلے میں فریئر ہال جانا پڑا۔ مسٹر ھی بھی موجود تھے۔ ۲۶ تاریخ کو میں حیدرآباد واپس آیا۔ کراچی میں طاعون کے کیس سامنے آتے رہے۔

۲۹، مئی: آج عیدالفطر ہے۔ الحمدللہ رمضان کے پورے روزے رکھے گو کہ آخری روزے بڑے سخت تھے۔ آخوند احمد نے نماز اور خطبہ پڑھایا۔ خیر سے وقت اچھا گزرا۔

۸، جون: آج بروز جمعرات شوال کی گیارہ تاریخ، شام کو اکمل بیگ کا ختنہ کروایا گیا۔ عثمان حجام نے ختنہ کیا۔ گھر کے ایوان میں یہ سارا بندوبست کیا گیا تھا۔

۵، اگست: بروز ہفتہ عیدالضحیٰ ہے۔ سڈنی بیگ بال بچوں کے ہمراہ آئے ہوئے ہیں۔ منوچہر بیگ، فرخ بیگ، سکندر بیگ، اختر اور اسٹائلی بھی یہیں تھے۔ ہمیشہ کی طرح احمد آخوند کو نماز اور خطبے کے لیے بلایا گیا۔ ہم نے دوسرے دن قربانی کی۔

۶، اگست: شام کو مسٹر بولچند گرچند، نوودیالیہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب اپنے ساتھ سینما کی مشین، فلم اور کچھ ماہرین لے آئے اور ہمیں رات ۸ سے ۱۰

بجے تک فلم دکھائی۔ فلم دکھانے کا بندوبست مرزا منوچہر بیگ کے گھر کیا گیا تھا۔ آس پاس کے گھروں کی خواتین بھی فلم کا سن کر دیکھنے آئیں۔ درمیان میں پردہ کھینچ کر زنان خانہ علیحدہ کیا گیا۔ ہم نے خرچہ وغیرہ کی مد میں ۲۵ روپے انھیں بھجوائے اگرچہ انھوں نے لینے سے انکار کیا مگر ہمارے اصرار انھیں یہ پیسے رکھنے پڑے۔

۳، ستمبر: اتوار کا دن۔ عاشورہ ہے۔ سڈنی بیگ کے بال بچے یہیں ہیں مگر وہ خود نہیں ہے۔ میں آج کہیں باہر نہیں گیا۔

۲۲، اکتوبر: ہوم سٹیڈ ہال میں جلسہ تھا جہاں مجھے صدارت کرنی تھی۔ بہت سے افراد جلسہ دیکھنے آئے۔ فرخ بیگ اور سکندر بیگ بھی میرے ہمراہ گئے تھے۔

۲۵، اکتوبر: کچھ یوروپین افسران کا سندھی زبان کا امتحان لینے، کمشنر صاحب کی ہدایت پر کراچی پہنچا۔ ۲۶ تاریخ سے لے کر ۳۰ تاریخ تک اسی کام میں مصروف رہا، نادر بیگ نے پچھلا بنگلہ چھوڑ دیا تھا اب نئے میں رہائش اختیار کی تھی کیونکہ یہ کراچی کلب اور پوسٹ آفس کے قریب ہے۔ تین بار مسٹر غلام علی چھاگلا ملنے آئے اور ایک بار ہم دونوں ایک نمائش دیکھنے بھی گئے۔

۲۴، نومبر: بمطابق ۲۴، ربیع الاول ۱۳۴۳ھ مرزا علی اشرف بیگ ۸ بجے شب زکام اور سانس کی تکلیف کے باعث انتقال کر گئے۔ انھیں آج دوپہر کو گاؤں کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ آخری وقت تک اپنے ہوش و حواس میں تھے اور بات چیت کر رہے تھے۔

۳، دسمبر: آج بمبئی کے گورنر صاحب کی تشریف آوری ہوئی۔ میری ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ شام کو مسٹر غلام حسین کی باغ میں دی گئی ضیافت میں بھی گورنر صاحب سے ملاقات کی۔

۱۹۲۳ء

۱۸، جنوری: ۱۹ تاریخ کو ٹیکسٹ بک کمیٹی کی میٹنگ کے سلسلے میں کراچی جانا پڑا۔ مسٹر پربھداس کو تار بھجوادیا اور خود ڈپٹی انسپکٹر کی آفس میں ٹھہرا۔ دوسرے دن میٹنگ تھی۔ اسماعیل خان، نادر بیگ، گریسی، آخوند، نظر محمد اور مسٹر سوراجی مجھ سے ملنے آئے۔ ۲۱، جنوری بروز اتوار واپس خیر سے حیدرآباد پہنچ گیا۔

۱۳، فروری: آج دوبجے دوپہر، بسنت ہال میں کوآپریٹو انسٹیٹیوٹ کی کانفرنس تھی جس کی صدارت میرے ذمے تھی۔ رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹی اور پولیس کلکٹر بھی موجود تھے۔ مرزا فرخ بیگ اور سکندر بیگ کے ساتھ شام کو چھ بجے تک میں وہیں تھا۔ پھر چائے وغیرہ پی کر لوٹ آئے۔

۱۵، فروری: میں کراچی گیا اور وہاں ڈپٹی انسپکٹر کی آفس میں ملازم عبداللہ کے ساتھ رکا۔ دوسرے دن مسٹر غلام علی چھاگلا کی معرفت بارہ ہزار روپے میں بنگلہ فروخت کیا اور کاغذات وغیرہ تیار کیے۔ دوسرے دن اپنا نیا پلاٹ جو پچھلے دنوں خریدا تھا، دیکھا اور ۱۸ تاریخ کو لوٹ کر حیدرآباد واپس آ گئے۔

۲۴، فروری: مسٹر غلام علی نانا کی خواہش پر ٹریننگ کالج میں لیکچر دیا۔ عنوان تھا۔ ''دل اور دماغ کا جسم پر اثر'' بہت سے استاد و شاگرد لیکچر سننے کے لیے موجود تھے۔

۲۷، مارچ: ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ چائے پی اور بہت سی باتیں کیں۔ ان کی شخصیت خاصی پُر اثر تھی۔

۱۲، اپریل: امام علی شاہ (ملازم) کو ساتھ لے کر کراچی گیا۔ کیونکہ یوروپی افسران کا امتحان لینا تھا۔ کمشنر صاحب نے بلایا تھا۔ اس بار نادر بیگ کے پاس ٹھہرا۔ ۱۶ تاریخ کو دن والی ٹرین پر حیدرآباد لوٹ آیا۔ کراچی میں کافی دوستوں سے ملاقات رہی اور اچھا وقت گزرا۔

۱۸، مئی: جمعہ والے دن عید الفطر ہے۔ سب عزیز، سوائے نادر بیگ کے موجود ہیں۔ اس بار پھر احمد آخوند کو نماز و خطبہ کی ادائیگی کے لیے زحمت دی گئی۔ شام کو اچھی خبر یہ ملی کہ فرہاد اور قنبر علی میٹرک کے امتحان میں پاس ہو گئے ہیں۔

۱، جون: گھر کے کنویں پر پمپ اور نل لگوایا گیا۔ جس مستری سے سڈنی بیگ نے نل لگوایا تھا اسی مستری یعنی محمد قاسم شکار پوری سے ہم نے بھی پمپ لگوایا۔ کل خرچہ ڈیڑھ سو روپے آیا۔

۲۱، جولائی: بمطابق ۵، ذوالحج ۱۳۷۱ھ بروز جمعہ، شام سات بج کر پانچ منٹ پر اللہ نے مجھے فرزند عنایت کیا۔ ڈاکٹر مس الفریڈ موجود تھیں جو اپنے ساتھ ایک عدد دائی بھی لائی تھیں۔ بچے کا نام اُدھم بیگ عرف حاجی بابا رکھا گیا۔ فرہاد، فیروز اور سٹینلی، کراچی سے عید کی تعطیلات پر آئے تھے۔

۲۵، جولائی: ذوالحج کی دس تاریخ، بروز بدھ عید منائی گئی۔ عبداللطیف ششوی دو دن سے مہمان ہیں۔ گاؤں والی مسجد میں سب نے حسب دستور نماز ادا کی۔ قربانی کے ساتھ ساتھ بچے کا عقیقہ بھی کیا گیا۔

۱۲، اگست: صاحبزادہ محمد خان جن کی پوسٹنگ بحیثیت ڈپٹی "نارو" میں ہے، تین دن آ کر ٹھہرے۔ ان کے دو ملازم بھی ان کے ہمراہ تھے۔ بہت اچھی گپ شپ رہی۔ سڈنی بیگ اور فرخ بیگ میں شریک گفتگو رہے۔

۲۹، اگست: بک کمیٹی کی وجہ سے سید امام علی شاہ (ملازم) کے ہمراہ کراچی گیا۔ خیر پور کے رزیر شیخ محمد قادر نے اپنے ہاں ٹھہرنے پر اصرار کیا تھا اور اس سلسلے میں خط بھی لکھا تھا۔ اسٹیشن پر ان کی گاڑی مجھے لینے آ گئی لہٰذا میں ان کے پاس جا کر رہا۔ ۱۳ تاریخ کو واپس حیدر آباد آیا۔ بہت شاندار وقت گزرا۔

۲۶، ستمبر: میں زنانہ ٹریننگ کالج اور کنڈمل گرلس اسکول گیا۔ وہاں میں نے ایک تقریر

کی۔ وہاں کے لوگوں نے بڑی آؤ بھگت کی۔ میری بڑی تعریف کی اور ہار وغیرہ پہنائے۔

۱۳، دسمبر: ''صوفی سماگم'' کے سلسلے میں پھر کراچی جانا ہوا۔ پروگرام کی صدارت کی۔ تین دن مسلسل، شام کو تقاریر ہوئیں۔ نادر بیگ کے بنگلے میں ٹھہرا تھا۔ سترہ تاریخ کو کراچی واپسی ہوئی۔

۲۱، دسمبر: نیشنل کالج والوں کی فرمائش پر ''سندھی زبان اور لٹریچر'' کے موضوع پر لیکچر دیا۔ اس کے بعد پارٹی ہوئی جس میں ریفریشمنٹ کا اچھا بندوبست تھا۔

۱۹۴۴ء

۲، جنوری: نئے سال کے آغاز میں، مجھے ''شمس العلماء'' کا لقب دیا گیا۔ وائسرائے ہند کے سیکریٹری اور گورنر بمبئی کے سیکریٹری کے علاوہ کمشنروں، کلکٹروں، یوروپین، مسلمان، ہندو اور فارسی افسران و دوستوں نے مبارک باد کے خطوط اور تار ارسال کیے۔

۲۶، جنوری: بک کمیٹی کے سلسلے میں کراچی جانا ہوا۔ سندھ مدرسہ بورڈ کے حوالے سے فرخ بیگ بھی میرے ساتھ چلے۔ مسٹر غلام علی چھاگلا، پروفیسر گربخشانی، مسٹر پنجابی اور دیگر ملاقاتی آئے۔ ۲۹ تاریخ کو واپسی ہوئی۔

۴، مارچ: میں اور سڈنی بیگ ٹنڈو محمد خان گئے۔ جج عبداللہ ہارون کے پاس رہے۔ شام کو میر مرتضٰی کے مقبرے کی زیارت کی۔ اس کے علاوہ پیر سرہندی سے بھی ملاقات کرنے گئے مگر وہ کراچی گئے ہوئے تھے۔ دوسرے دن واپس لوٹ آئے۔

۱۹، اپریل: مسٹر اور مسز حامد علی میرپورخاص آئے۔ کھانا کھانے کے بعد روانہ ہوئے۔

۲۰، اپریل: میں اور سڈنی بیگ رات کے کھانے پر مسٹر موتی رام کے ہاں گئے۔ مسٹر اور مسز حامد ان کے پاس مہمان تھے۔

۱۴، جولائی: آج عید الضحیٰ تھی۔ سب عزیز خویش موجود تھے۔ اچھا وقت گزرا۔

۲۴، جولائی: بک کمیٹی کی میٹنگ کے سلسلے میں مجھے کراچی جانا پڑا۔ وہاں سڈنی بیگ کے پاس رہا۔ ۲۷، جولائی کو واپسی ہوئی۔

۱۲، اگست: محرم کا عاشورہ تھا۔ سب رشتے دار موجود تھے۔ اگلے دن منو چہر بیگ بھی آ گئے۔ مرزا علی اکبر کے مقبرے پر مجلس تھی۔ شام کو سب نے مل کر وہیں نیاز کیا۔

۲، ستمبر: دو دن دو رات مسلسل برسات کے باعث آس پاس کے علاقوں بلکہ پورے شہر میں بہت نقصان ہوا۔

۱۳، ستمبر: اسلامی کتابوں کے متعلق ایجوکیشنل انسپکٹر کے ساتھ میٹنگ کی وجہ سے کراچی جانا۔ ۱۶ تاریخ وہاں سے لوٹا۔

۱۵، ستمبر: حیدرآباد میں بمبئی کے گورنر صاحب کا دربار تھا۔ مجھے شمس العلماء کا خطاب سند، جبہ، تمغہ اور دستار عطا کی گئی۔

۱۶، ستمبر: سر رحمت اللہ کی صدارت میں مسلمانوں کی کانفرنس ہوم سٹیڈ ہال میں شروع ہوئی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد نے اُردو ترقی کانفرنس کی صدارت کی جبکہ میر ایوب خان سندھی اُردو مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے۔ کانفرنس دو دن جاری رہی۔ رات کے وقت مشاعرہ ہوا۔ اُردو اور سندھی کے بہت سے شاعر شریک ہوئے۔ منو چہر بیگ کے گھر رہا۔ دوسرے دن ٹیکسٹ بک کمیٹی کی میٹنگ تھی، ۳۱ تاریخ کو وہاں سے لوٹا۔ خیر سے وقت گزرا۔

۱۹۲۵ء

۱۹، مارچ: گذشتہ رات ہمارے گھر سے چوری ہوگئی۔ دو چور گھر کی دیوار پھلانگ کر، گلی میں آئے اور درمیان والی کھڑکی سے گھر میں داخل ہوکر گودام کا تالا توڑ کر دو بستر، آٹھ دیگچے، قالین، ڈولی پوش اور بیٹھک کی بڑی میز کا پوش چوری کر گئے۔ پولیس آئی۔ بڑی پریشانی دکھائی مگر چوری کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ کچھ سامان باہر کے حصے سے ملا جو کہ چور باہر چھوڑ گئے تھے۔ مرزا فرخ بیگ، سکندر بیگ، حیدر بیگ، سٹینلیا ور دوسروں نے بھی بڑی کوشش کی مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔

۱۲، اپریل: مسٹر شیرازی بیوی بچوں سمیت محمد یوسف عباسی کے پاس کراچی سے ملنے آئے۔ دوپہر کو پھلیلی میں نہانے گئے اور ڈوب گئے۔ شام کو یہ خبر ملی۔ دوسرے دن اس کے والد کراچی سے آئے اور اپنے بیٹے کی لاش کو پھلیلی والے قبرستان بلند شاہ میں دفن کروایا۔

۲۵، اپریل: ہفتہ کا دن، رمضان کی عید ہے۔ الحمدللہ پورے تیس روزے رکھے۔ سوائے نادر بیگ اور اختر بیگ کے تمام عزیز موجود تھے۔ عید کا خطبہ میں نے پڑھا جو سب کو بہت پسند آیا۔ خطبہ پڑھنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔

۲۶، اپریل: شام کو بچوں کے ساتھ، منوچہر بیگ کے گھر میں کروایا جانے والا ڈرامہ دیکھنے گئے۔ سب خوش ہوکر لوٹے۔

۲۷، اپریل: کل میونسپلٹی کے الیکشن تھے۔ میں سکندر بیگ کے لیے ووٹ ڈال کر آیا ہوں۔

۳۰، اپریل: مرزا منوچہر بیگ کی خواہش پر، میں نے اپنے باغ میں ''شمس العلماء'' والی خلعت پہن کر تصویر بنوائی۔

۱، جولائی: آج بدھ کے دن اور ذی الحج کی نو تاریخ ۱۳۴۴ھ، صبح ساڑھے سات بجے مجھے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام ارشد بیگ عرف جانی بابا یا جان بابا رکھا گیا۔ جس طرح ادھم بیگ کا نام "حاجی بابا" رکھا گیا تھا۔

۲، جولائی: آج جمعرات کے دن عید الضحیٰ ہے۔ پچھلے عید کی طرح، اس بار بھی عید کا خطبہ میں نے دیا۔ سڈنی بیگ اور منوچہر موجود نہ تھے۔ وقت خوبی سے کٹ گیا۔

۶، جولائی: جانی بابا کی چھٹی تھی۔ ایک بکری کاٹ کر اس کا عقیقہ کیا گیا۔ پلاؤ بنا کر بانٹا گیا۔ شام کو گھر میں عزیز خویش اور خواتین آئیں۔

۱۵، جولائی: میں ٹیکسٹ بک کمیٹی کی میٹنگ کے لیے کراچی گیا اور سڈنی بیگ کے گھر رکا۔ ۱۸ تاریخ کو واپسی ہوئی۔ اسی رات منوچہر بیگ اور سکندر بیگ کے بال بچے محرم گزارنے آ گئے۔

۱، اگست: یوم عاشورہ ہمیشہ کی طرح عافیت سے گزرا۔

۲۷، ستمبر: میں کراچی جا کر سڈنی بیگ والوں کے گھر پر ٹھہرا۔ دوسرے دن شام کو مدرسے میں لیکچر دیا۔ مسٹر فیض طیب جی صدر تھے۔ دوسرے دن تھیوسوفیکل ہال میں لیکچر دیا اور ۳۰ تاریخ کو واپس لوٹ آیا۔

۱۹۲۶ء

۲۹، جنوری: بیس سال کے بعد مسٹر دہلوی، گورنر بمبئی کے وزیر بن کر سندھ آئے۔ انھوں نے سندھ آنے کے بارے میں مجھے بمبئی سے ہی لکھ دیا تھا۔ ان سے بسنت ہال میں ملاقات ہوئی۔ تیس تاریخ کو مسٹر نور محمد وکیل کی دعوت پر گئے اور اکتیس تاریخ کو ان سے کانفرنس میں ملاقات ہوئی۔ شام کو پھر

۱۹۲۵ء

۱۹، مارچ: گذشتہ رات ہمارے گھر سے چوری ہوگئی۔ دو چور گھر کی دیوار پھلانگ کر گلی میں آئے اور درمیان والی کھڑکی سے گھر میں داخل ہوکر گودام کا تالا توڑ کر دو بستر، آٹھ دیگچے، قالین، ڈولی پوش اور بیٹھک کی بڑی میز کا پوش چوری کر گئے۔ پولیس آئی۔ بڑی پریشانی دکھائی مگر چوری کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ کچھ سامان باہر کے حصے سے ملا جو کہ چور باہر چھوڑ گئے تھے۔ مرزا فرخ بیگ، سکندر بیگ، حیدر بیگ، سٹینلیا ور دوسروں نے بھی بڑی کوشش کی مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔

۱۲، اپریل: مسٹر شیرازی بیوی بچوں سمیت محمد یوسف عباسی کے پاس کراچی سے ملنے آئے۔ دوپہر کو پھلیلی میں نہانے گئے اور ڈوب گئے۔ شام کو یہ خبر ملی۔ دوسرے دن اس کے والد کراچی سے آئے اور اپنے بیٹے کی لاش کو پھلیلی والے قبرستان بلند شاہ میں دفن کروایا۔

۲۵، اپریل: ہفتہ کا دن، رمضان کی عید ہے۔ الحمدللہ پورے تیس روزے رکھے۔ سوائے نادر بیگ اور اختر بیگ کے تمام عزیز موجود تھے۔ عید کا خطبہ میں نے پڑھا جو سب کو بہت پسند آیا۔ خطبہ پڑھنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔

۲۶، اپریل: شام کو بچوں کے ساتھ، منوچہر بیگ کے گھر میں کروایا جانے والا ڈرامہ دیکھنے گئے۔ سب خوش ہوکر لوٹے۔

۲۷، اپریل: کل میونسپلٹی کے الیکشن تھے۔ میں سکندر بیگ کے لیے ووٹ ڈال کر آیا ہوں۔

۳۰، اپریل: مرزا منوچہر بیگ کی خواہش پر، میں نے اپنے باغ میں ''شمس العلماء'' والی خلعت پہن کر تصویر بنوائی۔

۱، جولائی: آج بدھ کے دن اور ذی الحج کی نو تاریخ ۱۳۴۴ھ، صبح ساڑھے سات بجے مجھے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام ارشد بیگ عرف جانی بابا یا جان بابا رکھا گیا۔ جس طرح ادھم بیگ کا نام "حاجی بابا" رکھا گیا تھا۔

۲، جولائی: آج جمعرات کے دن عیدالضحیٰ ہے۔ پچھلے عید کی طرح، اس بار بھی عید کا خطبہ میں نے دیا۔ سڈنی بیگ اور منوچہر موجود نہ تھے۔ وقت خوبی سے کٹ گیا۔

۶، جولائی: جانی بابا کی چھٹی تھی۔ ایک بکری کاٹ کر اس کا عقیقہ کیا گیا۔ پلاؤ بنا کر بانٹا گیا۔ شام کو گھر میں عزیز خویش اور خواتین آئیں۔

۱۵، جولائی: میں ٹیکسٹ بک کمیٹی کی میٹنگ کے لیے کراچی گیا اور سڈنی بیگ کے گھر رکا۔ ۱۸ تاریخ کو واپسی ہوئی۔ اسی رات منوچہر بیگ اور سکندر بیگ کے بال بچے محرم گزارنے آگئے۔

۱، اگست: یوم عاشورہ ہمیشہ کی طرح عافیت سے گزرا۔

۲۷، ستمبر: میں کراچی جا کر سڈنی بیگ والوں کے گھر پر ٹھہرا۔ دوسرے دن شام کو مدرسے میں لیکچر دیا۔ مسٹر فیض طیب جی صدر تھے۔ دوسرے دن تھیوسوفیکل ہال میں لیکچر دیا اور ۳۰ تاریخ کو واپس لوٹ آیا۔

۱۹۲۶ء

۲۹، جنوری: بیس سال کے بعد مسٹر دہلوی، گورنر بمبئی کے وزیر بن کر سندھ آئے۔ انھوں نے سندھ آنے کے بارے میں مجھے بمبئی سے ہی لکھ دیا تھا۔ ان سے بسنت ہال میں ملاقات ہوئی۔ تیس تاریخ کو مسٹر نور محمد وکیل کی دعوت پر گئے اور اکتیس تاریخ کو ان سے کانفرنس میں ملاقات ہوئی۔ شام کو پھر

عظیم خان کے ساتھ میری بیٹھک میں آئے، چائے وغیرہ پی۔ دوسرے دن نواب شاہ روانہ ہوئے۔

۱۳، اپریل: بدھ کا دن ہے۔ آج عید الفطر بھی ہے۔ خیر سے روزے بھی مکمل رکھے۔ دوسرے عزیز خویش، بال بچے سب ساتھ تھے۔ عید کی نماز اور خطبہ دونوں میں نے پڑھائے۔

۲۳، اپریل: آج دوپہر دو بجے کے قریب لاڑکانہ پہنچا۔ دادو سے منوچہر بیگ کو بھی ساتھ لیا۔ لاڑکانہ اسٹیشن پر حامد علی کے علاوہ کئی دیگر افراد بھی پہنچے۔ مجھے ہار پہنا کر خوش آمدید کلمات کہے گئے۔ مسٹر حامد علی نے اپنی کار میں ہمیں بنگلے پر پہنچایا۔ شام کو "انجمن حسینیہ" کی مجلس ہوئی۔ پہلے خطاب ہوا۔ جس میں میری بہت تعریف کی گئی۔ میں نے اس خطاب کے جواب میں کچھ بیان کیا۔ اس کے بعد منقبت پڑھی۔ رات کو حاجی امیر علی کے ہاں کھانے کی دعوت تھی۔ مسٹر اور مسز حامد علی خان اور دیگر کئی معززین وہاں موجود تھے۔ دوسرے دن قبرستان جا کر اپنے بچے کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ شام کو "پوئٹری سوسائٹی" کے تحت مشاعرہ تھا۔ مسٹر حامد علی نے میری بہت تعریف کی۔ مجھے بھی تقریر کرنا پڑی۔ اس کے بعد میرا لیکچر تھا۔ میں نے کچھ اپنی شاعری بھی سنائی اور دوسروں کی شاعری سنی۔ رات کو مسٹر حامد علی کے گھر دعوت تھی۔ ۲۵ تاریخ کو بھی ملاقات رہی پھر مسٹر حامد علی مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے آئے۔ نو بجے میں شکار پور پہنچ گیا۔ مسٹر پوکرداس کے بیٹے کے علاوہ بہت سے سیٹھ وہاں ملے۔ انھی کے ساتھ پھر میں بنگلے پر گیا۔ اگلے روز یعنی ۲۶ تاریخ کو شہر گھومنے گیا، کئی دوستوں سے ملا۔ شام کو پوکرداس کی دعوت میں شریک ہوا۔ جس میں شہر کے بہت سے ہندو و مسلمان افراد نے شرکت کی۔ اگلے روز یعنی ۲۷ تاریخ علی الصبح وہاں سے روانہ ہوا۔ سکھر اسٹیشن پر ناصر علی سے ملاقات ہوئی۔ دوپہر کے وقت خیریت سے اپنے گھر پہنچا۔

۵، جون: آج بادشاہ کا یوم پیدائش ہے۔ منوچہر بیگ، مشہد مقدس کی زیارت سے خیر و سلامتی سے لوٹے۔

۲۰، جون: آج حج ہے۔ اتوار کا دن ہے۔ بچے صبح گاڑی میں شاہ مکائی کے میلے پر گئے۔ جانی بابا کی سالگرہ کے سلسلے میں گھر پر پارٹی کی گئی۔ جس میں عزیز، رشتے دار اور دیگر خواتین و بچے آئے۔ خوب گانے وغیرہ گائے گئے۔ بسکٹ، کیک، لیمونیڈ، سوڈا وغیرہ سے خاطر تواضع ہوئی۔ دس بجے پارٹی ختم ہوئی۔ میٹھی ڈش بنا کر گھروں میں بانٹی گئی۔ وقت اچھا گزرا۔

۲۱، جون: آج عید کا دن ہے۔ میں نے نماز و خطبہ پڑھائے۔ دوسرے روز قربانی کی۔ سڈنی بیگ خود تو بمبئی میں ہیں مگر ان کے گھر والے موجود تھے۔

۲۸، ستمبر: صبح والی ٹرین میں کراچی گیا۔ مسٹر کابل (کمشنر صاحب) ریٹائرمنٹ کے بعد بیرونِ ملک جا رہے تھے لہٰذا ان کی دعوت میں شریک ہوا۔ مرزا منوچہر بیگ، فرخ بیگ اور سکندر بیگ بھی پارٹی میں پہنچے۔ بہت سے اعلیٰ افسران اور معزز مہمانوں سے ملاقات رہی۔ ۲۹ تاریخ کو کالج میں لیکچر دیا اور ۳۰، ستمبر کو تھیاسوفیکل ہال میں۔ پانچ تاریخ کو پھر مدرسے میں لیکچر دیا۔ اس بار زیادہ وقت کراچی میں گزارنا پڑا۔ چھ تاریخ کو ٹیکسٹ بک کمیٹی کی میٹنگ تھی جو کینسل ہوگئی۔ میرے کراچی والے پلاٹ میں کچھ مسئلہ تھا اس سلسلے میں ڈپٹی کمشنر صاحب سے ملا اور ضروری کام کیے۔ مسٹر طیب جی اور سردار محمد خان کی دعوت پر گیا۔ مسٹر غلام علی چھاگلا اور بہت سے دوسرے دوست ملنے کے لیے آ گئے۔ مطلب یہ کہ کراچی میں بہت مصروف اور اچھا وقت گزارا۔ کپڑے [illegible] کے علاوہ [illegible] خریدا [illegible] اللہ [illegible] روز [illegible] پھر وہیں [illegible] آخر [illegible] بھی وہاں آ گئے [illegible] اس [illegible] سے حیدرآباد آ گیا۔

۱۸، دسمبر: آج مسٹر کیولرام دیارام کے ساتھ پروفیسر کاروی (بمبئی والے) اور مسٹر پھیروانی (شکارپور) ملاقات کے لیے آئے۔

۱۹، دسمبر: مسز حامد علی ملاقات کے لیے آئیں وہ دراصل ''بڑودہ'' جارہی تھیں وہاں انھیں لیڈیز کانفرنس میں شریک ہونا تھا۔

۱۹۲۷ء

۲، جنوری: مرزا منوچہر بیگ، سکندر بیگ، سڈنی بیگ اور میں بال بچوں سمیت گاڑیوں میں سوار ہو کر باغ گھومنے گئے اور دو بجے لوٹ آئے۔ وہاں شکار کیا، زمینیں دیکھیں، مطلب یہ کہ خوب مزہ لیا۔

۱۱، جنوری: ہیڈ ماسٹر مسٹر لیلارام کی درخواست پر ''حیدرآباد ہائی اسکول'' میں ''شاعری کا اثر'' کے موضوع پر سندھی میں تقریر کی۔

۱۶، جنوری: مسٹر آدم جی منچھر جی (ایجنٹ) اور مسٹر سورابجی آج شام کو چار بجے مجھ سے ملنے آئے۔ بہت مدت کے بعد ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے چائے بسکٹ سے ان کی تواضع کی۔ ان سے مل کر بے حد خوشی محسوس کر رہا ہوں کالج کے زمانے کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔

۲، مارچ: آج کراچی میں ''ٹیکسٹ بک کمیٹی'' کی میٹنگ میں شرکت کے لیے پہنچا۔ دو دن وہاں رہ کر پانچ تاریخ کو واپس حیدرآباد پہنچ گیا۔

۴، اپریل: رمضان کی عید خیر خیریت کے ساتھ گزری۔ سڈنی بیگ والے بمبئی گئے ہوئے ہیں۔

۴، مئی: ہمایوں نے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا۔

۱۰، جون: جمعہ کے دن حج اکبری ہوا۔

۱۱، جون: آج عیدالضحیٰ کا دن ہے۔ حسب دستور گاؤں والی مسجد میں نماز ادا کی۔ خطبہ میں نے پڑھا۔

۱۲، جون: اجمل بیگ کا ختنہ کروایا۔

۱۳، جون: ٹیکسٹ بک کمیٹی کی میٹنگ کے لیے کراچی گیا اور پندرہ تاریخ کو واپس لوٹا۔

۳۰، جون: کل خبر ملی کہ میر نور محمد خان، جو کربلا کی زیارت کے لیے گئے ہوئے تھے، وہاں وفات پا گئے ہیں۔ آج میں اور فرخ بیگ ان کی فاتحہ اور تعزیت کے لیے ان کے نواسے کے پاس گئے۔

۲، جولائی: کوآپریٹو سوسائٹی کا سالانہ جلسہ ہوا جس کی صدارت میں نے کی۔ جلسہ ہوم سٹیڈ ہال میں ہوا جس میں بہت سے افراد نے شرکت کی۔

۱۶، جولائی: ۱۶ محرم بروز ہفتہ شب ڈھائی بجے، مجھے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام اصغر بیگ رکھا گیا اور چونکہ محرم کے مہینے میں پیدا ہوا لہٰذا عرفیت "علی بابا" رکھی گئی۔ میری پیدائش بھی چار محرم ہے۔

۲۱، جولائی: گذشتہ رات علی بابا کی چھٹی کی اور عقیقے کا نیاز بانٹا گیا۔ سر کے پہلے بال بھی اتارے گئے اور ڈاکٹر محمد خان نے بچے کا ختنہ کیا۔

۲۷، جولائی: مرزا علی حسین شاہ کے ساتھ بمبئی گیا۔ ہمارے ساتھ مسٹر شاہانی (پرنسپل) بھی تھے۔ زوردار برسات ہو رہی تھی۔

۲۹، جولائی: شام کو نو بجے احمد آباد پہنچے۔ آگے راستہ بند تھا۔ یونیورسٹی رجسٹرار کو تار بھیجا۔ مرزا علی حسین گئے اور سندنی بیگ کو ڈھونڈ کر لے آئے جس کے ساتھ جا کر ہم ڈاکٹر منصور احمد کے بنگلے پر ٹھہرے۔ مسٹر شاہانی واپس حیدرآباد چلے گئے۔

۶، اگست: بمبئی جانے والا راستہ بند ہونے کی وجہ سے، احمد آباد میں گھومتے پھرتے رہے۔

۹، اگست: احمد آباد سے روانہ ہوئے اور اگلے روز بمبئی پہنچے۔ اتوار کو باندرہ گئے اور مسٹر گدوبل اور مسٹر مرچنٹ سے ملاقات کی۔ ۸، اگست کو مسٹر دستور سے پچاس سال کے بعد ملاقات ہوئی۔

۱۰، اگست: بمبئی سے سڈنی بیگ کے ساتھ روانہ ہوا۔ ہم ۱۱ تاریخ کو احمد آباد پہنچے۔ مسٹر کنٹریکٹر سے ملے اور شاہ عالم کا روضہ بھی دیکھا۔

۲۴، اگست: مرزا علی حسن کو ساتھ لے کر بمبئی گیا کیونکہ وہاں یونیورسٹی کی میٹنگ تھی۔ مسٹر شاہانی بھی ساتھ چلے۔ احمد آباد میں سڈنی بیگ ملے۔ ۲۶ تاریخ کو بمبئی میں مسٹر دستور سے ملاقات ہوئی۔ اور دوسرے دن ۲۷ تاریخ کو یونیورسٹی کی میٹنگ ہوئی۔ ۲۹ تاریخ کو پونا گیا۔ ڈائریکٹر مسٹر جیکسو اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر مسٹر لر سے ملاقات کی۔ مسٹر غلام حسین اور مسٹر دہلوی سے بھی ملا اور شام کو لوٹ آیا۔ سڈنی بیگ بھی آئے۔ ۳۰ تاریخ بروز منگل شام کو روانہ ہوئے۔ سڈنی بیگ اور ان کے بچے بھی دوپہر کو حیدر آباد پہنچے۔ وہاں سے سڈنی بیگ اور ان کی فیملی کراچی چلی گئی۔ پتھورو اسٹیشن پر مرزا منوچہر بیگ سے بھی ملاقات ہوئی۔

۲۲، ستمبر: میں عبداللہ (ملازم) کو ساتھ لے کر یونیورسٹی کی میٹنگ میں گیا اور ۲۶ تاریخ کو وہاں سے واپسی ہوئی۔

۸، دسمبر: مسٹر دیارام گدوبل، میرے پرانے اور گہرے دوست جو باندرہ (بمبئی) میں رہتے تھے، ان کی وفات کی خبر ملی۔ بہت دکھ کا سامنا ہے۔

۸، جنوری: آج کراچی پہنچا ہوں کیونکہ ۹ تاریخ کو ٹیکسٹ بک کمیٹی کی میٹنگ ہونی تھی۔ مرزا منوچہر بیگ مرزا حیدر بیگ اور قمبر علی بھی کراچی آئے۔ علاقے کے بندے بھی موجود تھے۔ منوچہر بیگ کی آفس میں رہے۔ نادر بیگ اور ہمایوں بھی وہاں آتے جاتے رہے۔ ۱۱ تاریخ کو وہاں سے لوٹے۔

۱۴، جنوری: کتب فروش مسٹر پوکرداس آئے۔ سارا دن ساتھ گزارا۔ اسلامی کتابوں کے بارے میں آپس میں کچھ طے کرنے کے بعد باقاعدہ دستاویزی شکل میں معاہدہ کیا۔ طے یہ کیا کہ کتاب وہ اپنے خرچے پر چھپوا کر ۳۳ فیصد کمیشن اپنے پاس رکھے گا۔

۲۵، جنوری: میں مرزا حیدر بیگ کے ساتھ بمبئی گیا کیونکہ ۲۷ تاریخ کو وہاں یونیورسٹی کی میٹنگ طے تھی۔ ۱، فروری کو وہاں سے لوٹ آئے۔ اچھا وقت گزرا۔ بمبئی روانگی کے لیے مسٹر شاہانی رفیق سفر تھے اور واپسی میں مسٹر غلام قادر شیخان۔

۱۵، فروری: میں اور مرزا علی حسین بمبئی جانے کے لیے تیار ہوئے کیونکہ ۱۷ تاریخ کو یونیورسٹی کی میٹنگ میں شرکت کرنا تھی۔ مگر گذشتہ شب قلندر شہباز کے نام پر کھانا بانٹنے کے بعد گھر والوں کو سردی سے بخار چڑھا۔ پوری رات بخار نہ اُترا لہٰذا جانے کا پروگرام ملتوی کردیا۔ دوسرے دن ڈاکٹر کو بلایا جس نے بتایا کہ انفلوئنزا کا اثر ہے۔

۲۳، مارچ: رمضان کی عید تھی۔ سب عزیز و اقارب موجود تھے۔ خیر سے عید کی نماز پڑھی۔ میں نے تیس روزے پورے رکھے تھے۔ رمضان کی دو تاریخ کو ٹیکسٹ بک کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت لے کراچی گیا اور اسی دن لوٹ آیا۔ مجھے زکام، بخار، کھانسی و نزلہ ہوگیا ہے۔

۲۶، مارچ: سڈنی بیگ بمبئی سے سیدھے کراچی چلے گئے۔ بیوی بچے انھیں اسٹیشن پر ملنے گئے۔

۳، اپریل: میں کراچی گیا جہاں مسٹر پرسیول کے پاس ''ایٹ ہوم'' منعقد ہوا۔ مجھے مسٹر ریورنڈ تھامسپن نے شرکت کے لیے اصرار کیا تھا۔ سڈنی بیگ کے نئے گھر میں جا کر رہا۔ رات کو دس بجے میں اور سڈنی بیگ ''ایٹ ہوم'' گئے۔ بہت سے یوروپین مرد و خواتین وہاں شریک تھیں۔ میر ایوب خان بھی وہاں موجود تھے۔ بائبل کے متعلق مجھے ایک مضمون وہاں پڑھنا تھا وہ پڑھا اور پانچ تاریخ کو سڈنی بیگ کے ساتھ حیدرآباد پہنچا۔ ایسٹر کی چھٹیاں تھیں۔

۲۹، مئی: آج حج ادا کیا گیا۔ ۳۰، مئی بروز بدھ عبدالضحیٰ منائی گئی۔ ہمیشہ کی طرح گاؤں والی مسجد میں نماز پڑھی۔ خیر و خوبی سے دن گزرا۔

۲۹، جون: ۱۰ محرم جمعہ کا دن، عاشورہ کا دن ہے۔ ہمیشہ کی طرح دن کے آغاز میں ہی شہداء کے نام پر علیحدہ علیحدہ نذر بھیجی گئی۔ ۶ محرم کو سکندر بیگ والوں کے پاس مجلس تھی جس میں شرکت کی۔ عاشورہ کے دن نذر نیاز بانٹی گئی۔ ہمیشہ کی طرح آسودہ وقت گزرا۔ سڈنی بیگ کے گھر رہا۔ منوچہر بیگ بھی وہیں تھے۔

۱۶، جولائی: اصغر بیگ عرف علی بابا کی پہلی سالگرہ ہے۔ خیرات بانٹی گئی۔ سڈنی بیگ اور منوچہر بیگ کے بال بچے واپس کراچی چلے گئے۔

۳۱، جولائی: پہلی اور دوسری جولائی کو شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کی یاد میں ہونے والے جلسے کے سلسلے میں کراچی گیا۔ کالج کے سرسوتی گروپ والوں نے مجھے اس جلسے کی صدارت سونپی تھی۔ پورا دن میں نے سڈنی بیگ والوں کے پاس گزارا۔ منوچہر بیگ بھی وہاں تھے۔ وقت خیر و خوبی سے گزرا۔

۱۹، اگست: بروز اتوار مرزا علی حسین کے ساتھ بمبئی روانہ ہوا۔ اسٹیشن پر مسٹر شاہانی، مسٹر ولی محمد اور مسٹر سوتانی ملے۔ رات کو مجھے پیٹ میں درد محسوس ہوا اس لیے ٹھیک طرح سے کھانا نہ کھا سکا۔ دادر اسٹیشن پر شیخ محمد قادر کا حوالدار موجود تھا میں اور مسٹر ولی محمد تھانے گئے۔ شیخ صاحب سے ملے۔ کوئی گیارہ بجے مرزا علی حسین بمبئی پہنچے۔ بارہ بجے میں یونیورسٹی کی کمیٹی میں شرکت کے گیا اور مرزا علی حسن کو سامان خریدنے کے لیے شہر بھیجا۔ دوران میٹنگ پیٹ میں درد شدید ہونے لگا اور سخت بے آرامی محسوس ہوئی۔ بہرحال دو گھنٹے میں کمیٹی کا کام مکمل کر کے میں مسٹر شاہانی کے ساتھ تاج محل ہوٹل آیا اور آ کر بغیر کچھ کھائے پئے سو گیا۔ شام کو شیخ قادر اور مسٹر ولی محمد آئے۔ ڈاکٹر کو بلوایا جس نے دیکھنے کے بعد بتایا کہ یہ گردے کی تکلیف ہے فی الحال گرم پانی کی بوتل سے ٹکور کریں۔ اس سے قدرے آرام محسوس ہوا۔ رات کو پھر بخار رہا۔ اگلے روز سارا دن گھر میں ہی رہا۔ گیارہ بجے شیخ صاحب کے ساتھ مرحوم محمد ابراہیم کی قبر پر فاتحہ خوانی کی اور نیاز کی۔ واپسی کے وقت مجھے پھر سخت درد ہونے لگا۔ ڈاکٹر آیا اور دوا دی۔ شام تک تکلیف رہی کچھ کھا پی نہ سکا، چھ سات بجے علی حسین بیگ آئے اور ہم دادر گئے جہاں میں اسٹیشن پر سو گیا۔ آخر کار بمبئی سے ٹرین پہنچی۔ سب دوست آئے۔ شیخ قادر بھی پہنچا اور ہم سب ٹرین میں سوار ہوئے۔ خدا کی مہربانی سے راستے میں کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ چوبیس تاریخ بروز جمعہ ایک بجے حیدرآباد پہنچے۔ حیدر بیگ اور بچے اسٹیشن پر آئے تھے۔ گھر تو خیریت سے پہنچے مگر اچانک مجھے بخار آ گیا اور دن رات بخار میں پھنکتا رہا۔

۱۶، اکتوبر: چار پانچ دن تک بخار رہا۔ آج قدرے بہتر ہوا ہوں۔ شام کو سردار محمد خان روہڑی سے آئے۔ وہ کراچی جا رہے تھے۔

۲۴، نومبر: آج بمبئی جانا تھا مگر نہ جاسکا۔

۱۰، دسمبر: آج پہلی بار ہمارے گھر میں بجلی کے بلب جلے۔ کوئی ایک ہفتے سے بجلی والے گھر میں تاریں وغیرہ بچھا رہے تھے۔ آج خیر سے کام مکمل ہوا۔ خیرات کا کھانا کھلایا۔ بجلی لگوانے پر ۲۶۰ روپے کا خرچہ آیا۔

۲۶، دسمبر: میں، مرزا فرخ بیگ، سکندر بیگ، قنبر علی، امداد حسین اور شوکت بذریعہ کوئٹہ میل سکھر گئے۔ رات کو نو بجے ٹرین نے ہمیں سکھر پہنچایا۔ آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے پریزیڈنٹ نواب میر فضل علی بھی اس ٹرین میں تھے۔ سکھر کے دفتر دار کے بنگلے پہ پہنچے۔ دوسرے دن کانفرنس شروع ہوئی۔ میر نواز علی خان اور نواب میکنا پلی بھی ہمراہ تھے۔ ہندوستان کے اہم لوگ جمع ہوئے۔ تقریباً دو ڈھائی ہزار افراد تو ہوں گے۔ کاروائی شروع ہوئی۔ استقبالیہ کمیٹی کا صدر میں تھا۔ میں نے اپنا خطبہ ختم کیا تو نواب صاحب نے اپنا خطبہ پڑھنا شروع کیا۔ اس کے بعد نواب صاحب اور میر صاحب اپنی کرسی پر مجھے بٹھا کر چلے گئے۔ تین دن مسلسل مصروفیت رہی۔ رات کو سخت سردی کے باعث میں سبجیکٹ کمیٹی کی میٹنگ میں نہ جاسکا۔ مرزا فرخ بیگ اور سکندر بیگ رات کو دیر تک کام کرتے رہے۔ تیس تاریخ کو سکندر بیگ کو وہیں چھوڑ کر ہم واپس آگئے کیونکہ میر صاحب کی دعوت میں شرکت کے لیے خیر پور جانا تھا۔ مگر کچھ مجبوریوں کے باعث دعوت میں نہ پہنچ سکے۔

۱۹۲۹ء

۷، جنوری: شام کو نادر بیگ آئے اور تقریباً نو بجے واپس گئے۔ سیٹھ وشنداس (ماجھو والے) کا انتقال ہوگیا۔

۱۱، جنوری: کراچی جا کر مسٹر آدم جی سے ملا۔ شام کو وہ خود میرے پاس آئے۔ ڈاکٹر بھٹ کے پاس آنکھوں کے معائنے کے لیے گیا۔ اس نے بتایا کہ دائیں آنکھ میں موتیا اتر آیا ہے۔ بڑھ جانے کے خطرے کے پیش نظر آپریشن کا مشورہ دیا۔ دوسری عینک خرید کی اور ۱۴ تاریخ کو واپس حیدرآباد آ گیا۔

۲۲، جنوری: آج میرپور ماتھیلی کے مولوی بہاء الدین ایک طویل عرصے بعد بیٹھک میں آئے۔ تین دن رکے۔ شعر خوانی کی اچھی محفل رہی۔ ان کی عمر اس وقت ۸۸ سال ہے۔

۳۱، جنوری: آج خبر ملی کہ مرزا علی احمد کا جیکب آباد میں انتقال ہو گیا ہے اور ان کی تدفین بھی وہیں کی گئی ہے۔ ان کے بال بچے حیدرآباد آئے۔ ہم تعزیت کے لیے گئے۔ گذشتہ رات بہت زیادہ سردی تھی۔ یوں تو دو تین دنوں سے پانی جم رہا تھا مگر گذشتہ رات تو ہر جگہ مکمل طور پر جم گیا تھا۔

۱۳، مارچ: بروز بدھ عید الفطر تھی۔ سڈنی بیگ، نادر بیگ اور اختر بیگ سب کے بال بچے یہیں تھے۔ ہمایوں بھی آئے۔ مرزا علی نواز، مرزا علی عباس، مرزا غلام مہدی اور ان کے چھوٹے بچے بھی عید کی نماز میں شریک ہوئے۔ ہمیشہ کی طرح میں نے خطبہ پڑھا۔

۱۴، مارچ: شام کو سکندر بیگ کے اعزاز میں پارٹی کی۔ شہر کے سب معززین شریک ہوئے۔ مرزا علی نواز اور مرزا علی اکبر بھی تھے بہت اچھی محفل رہی۔

۲۲، مارچ: میں کراچی پہنچا۔ آریہ سماج کے ہال میں مذہبی کانفرنس شام کو منعقد ہوئی تھی۔ جس کا موضوع تھا ''اسلام نے دنیا میں کیا ترقی کی ہے'' مسٹر ملک صدر تھے۔ مرزا سڈنی بیگ اور مسٹر غلام علی چھاگلا کے علاوہ دیگر معززین بھی تھے۔ میں نے اس موضوع پر لیکچر دیا۔

۲۴، مارچ: آج دن کو ٹیکسٹ بک کمیٹی کی میٹنگ ہوئی اور شام کو میں نے تھیوسافیکل ہال میں ''مشرقی اور مغربی اقوام کے خواب اور ان کی تعبیر'' کے موضوع پر لیکچر دیا۔ مسٹر غلام علی چھاگلا اور دیگر افراد موجود تھے۔

۲۵، مارچ: میں اور سڈنی بیگ صبح والی ریل سے حیدرآباد روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر گربخشانی بھی ہمارے ہمراہ تھے۔

۱، اپریل: ہالا کے پیر غلام حیدر صاحب نے ایک خط دے کر دو افراد کو بھیجا۔ مجھے ہالا لے جانے کے لیے کار بھی بھجوائی۔ میں صبح کو ہالا کے لیے عبداللہ (ملازم) کے ساتھ نکلا۔ ہم دس بجے وہاں پہنچے۔ سید غلام مرتضیٰ شاہ (المعروف جی۔ایم۔سید) بھی وہاں موجود تھے۔ کانفرنس کے متعلق ایک دوسرے سے صلاح ومشورے کیے۔ پھر میں بھٹ شاہ اور مخدوم نوح کے مقبرے پہ گیا اور فاتحہ پڑھی۔ پھر کھانا کھا کر آرام کیا۔ چار بجے پیر صاحب واپس آئے ہم نے ساتھ چائے پی۔ خدا حافظ کہہ کر واپس ہوا۔ رات کے آٹھ بجے گھر پہنچا۔

۴، اپریل: مجھے دل اور معدے میں تکلیف محسوس ہورہی ہے۔ ڈاکٹر میہراج، ڈاکٹر بولچند، ڈاکٹر محمد خان، ڈاکٹر نور محمد شیخ اور سول سرجن کو بلایا گیا۔ جسم کے اندرونی غدوددوں پر سوجن ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر نور محمد شیخ روزانہ آنے لگے۔ مرزا منوچہر بیگ اور مرزا سڈنی بیگ بیوی بچوں سمیت کراچی سے پہنچے۔ دوسرے دن سڈنی چلے گئے۔ میری حالت سخت خراب تھی۔ لوگ عیادت کے لیے آجارہے تھے۔ خدا کی مہربانی سے آہستہ آہستہ افاقہ ہونے لگا۔

۴، مئی: آج پیر کا دن اور عیدالضحیٰ ہے۔ آج پہلی بار بیماری کے بعد، خود سے چل کر باہر آیا گلی میں آرام کرسی منگوائی۔ مجھے اس پر بٹھا کر مسجد تک لے کر گئے

جہاں نماز پڑھی۔ خطبہ ہمیشہ کی طرح میں نے ہی دیا۔ مرزا سکندر بیگ، سڈنی بیگ، اختر بیگ، مرزا علی نواز بیگ اور ان کا بیٹا اور دیگر عزیز و خویش ملنے آئے۔ میں ان سے مل کر بے حد خوش ہوا اور وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئے۔

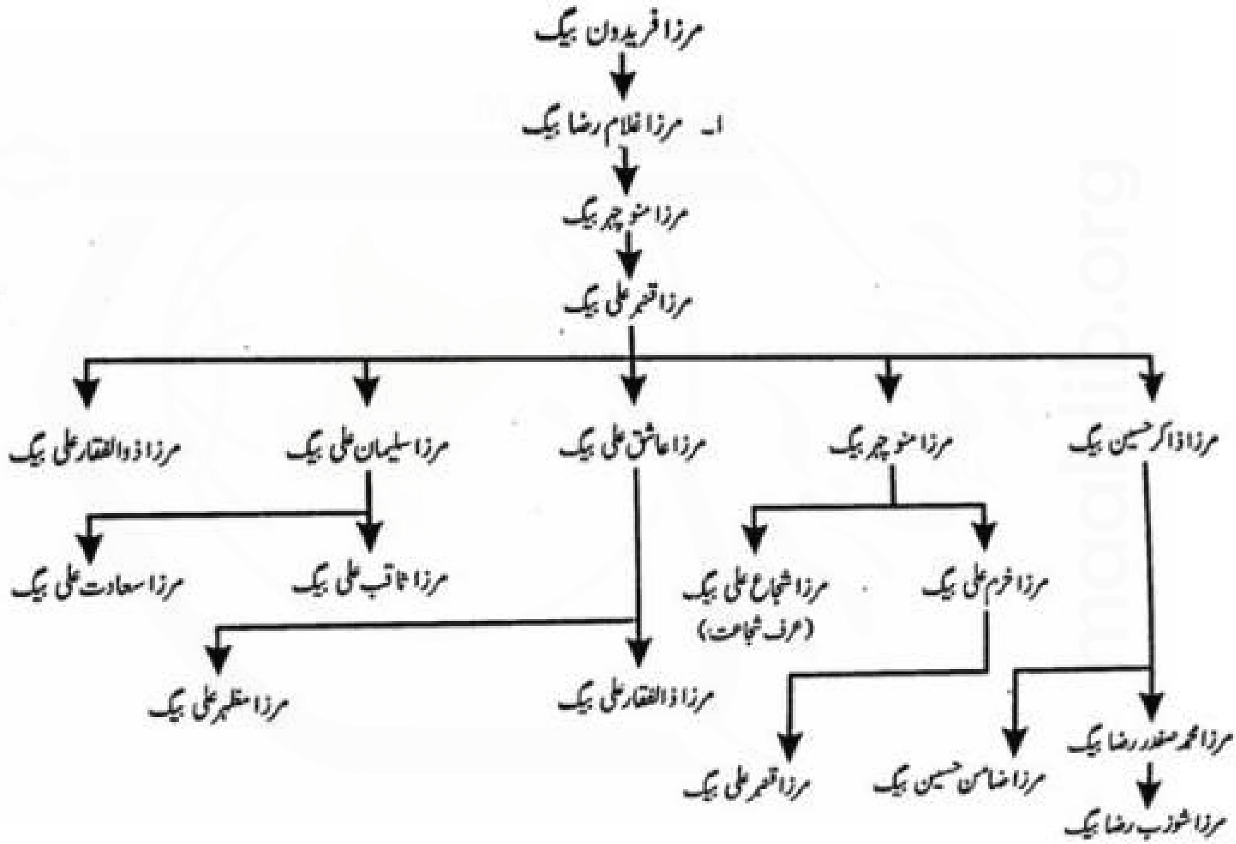
۳۰، مئی: مرزا منوچہر بیگ اور دیگر احباب کربلا کی زیارت سے لوٹ آئے۔ دوپہر کو سب ایک دوسرے سے مل کر بے حد خوش ہوئے۔

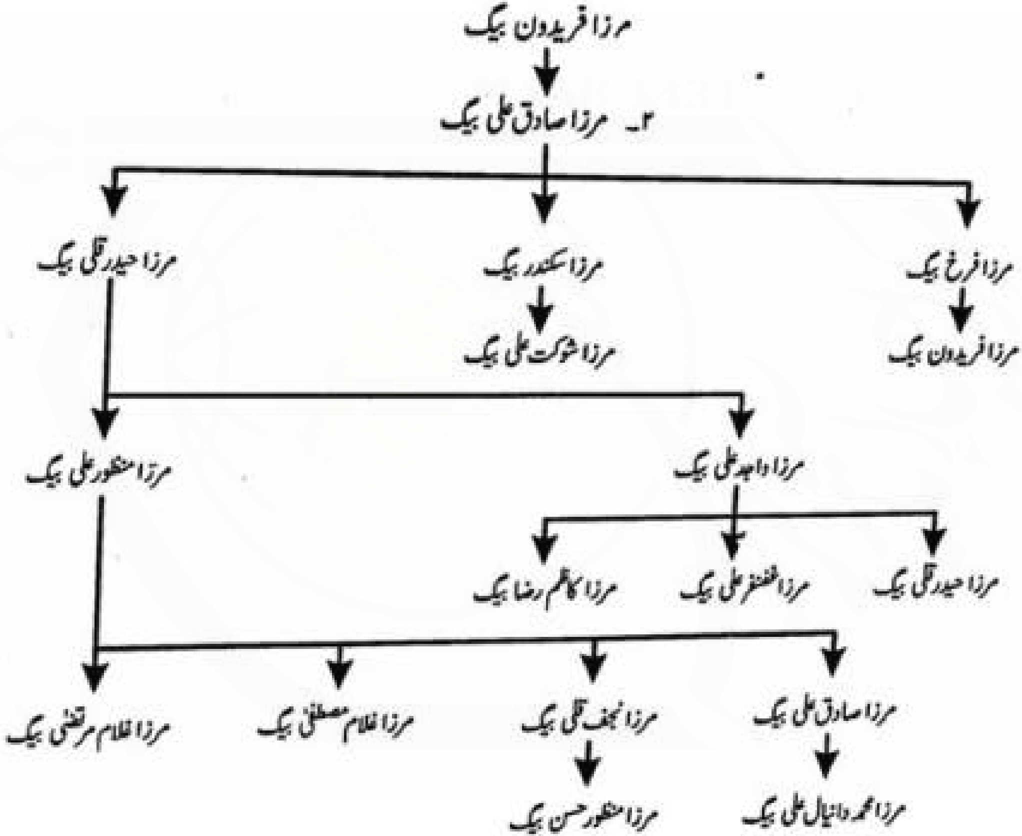
۱۰، جون: ۲ محرم ۱۳۴۸ھ، بروز پیر دوپہر ڈھائی بجے روز مجھے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام اطہر بیگ رکھا گیا اور عرفیت "بابا طاہر"۔

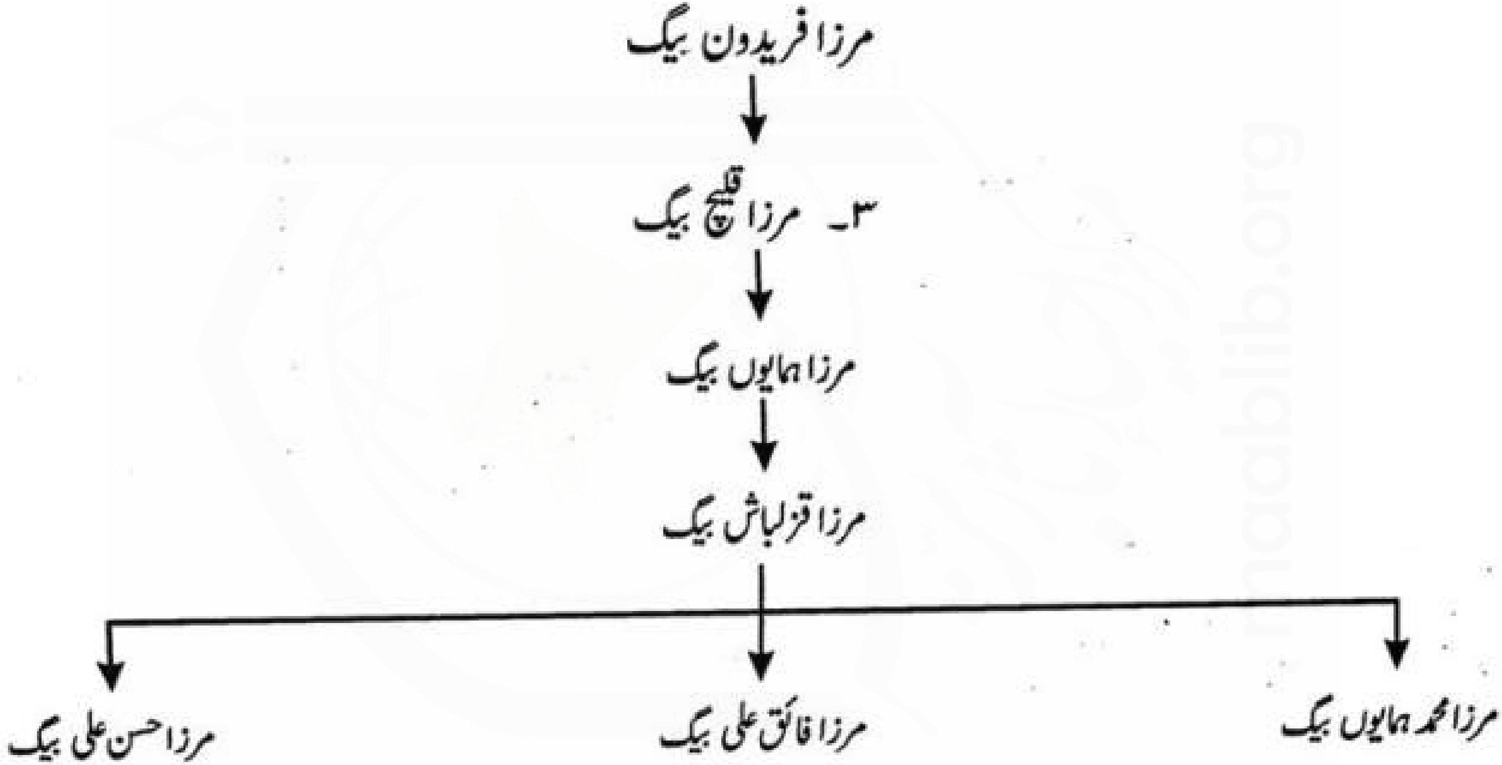
نوٹ: مرزا صاحب مرحوم کی خود نوشتہ ڈائری یا روزنامچہ میں، ۱۰، جون ۱۹۲۹ء کو مندرجہ بالا اندراج کے بعد کچھ نہیں لکھا۔ واضح رہے کہ ۳، جولائی ۱۹۲۹ء کی رات گیارہ بجے مرزا صاحب نے وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کے جسدِ خاکی کی تدفین ان کے اپنے گاؤں کے قبرستان "بلند شاہ" میں اس قبر میں ہوئی جو انھوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنے لیے بنوائی تھی۔ مرزا مرحوم کے سرہانے ایستادہ کتبے پر جو قطعہ کندہ ہے وہ بھی مرزا صاحب کا ہی تحریر کردہ ہے۔ جس کے آخری مصرعے میں، ابجد کے حساب سے، ان کی وفات کا سال یعنی ۱۳۴۸ھ نکلتا ہے۔

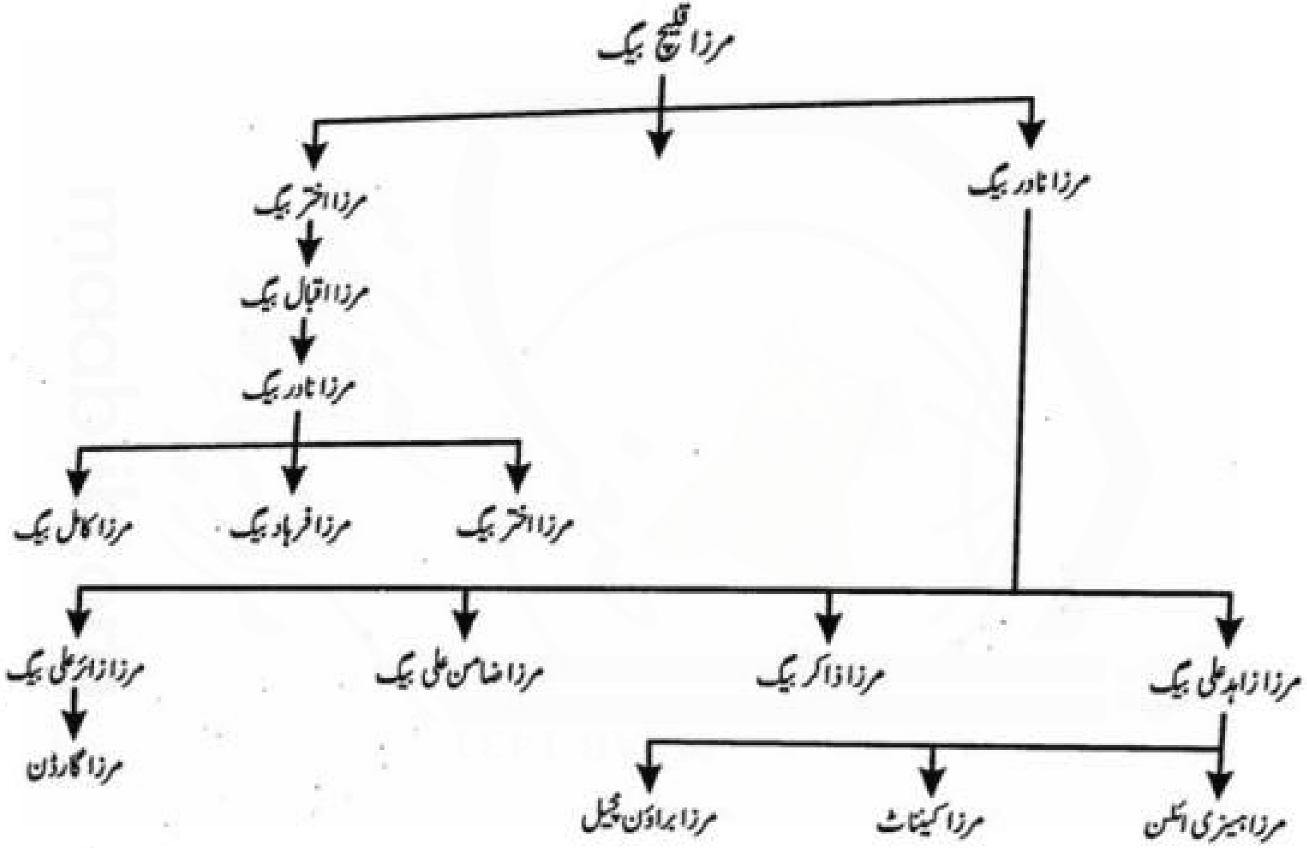
عمر میں بہ ہمیں سال چو ہفتاد شدہ ہفت،
آمد ملک الموت، ز درگاہ حق آخر،
گفتا کہ بس زیستی در منزل دنیا،
شو عازم عقبیٰ، کہ بہ بینی رخ داور،
از فرطِ مسرت زدم آہے و بمردم،
در عالمِ ارواح رسیدم دمِ دیگر،
تاریخ و فاتم چو دلم خواستہ از غیب،
ہاتف زکرم کرد ندا: "بجنت موقر"۔

۱۳۴۸ھ

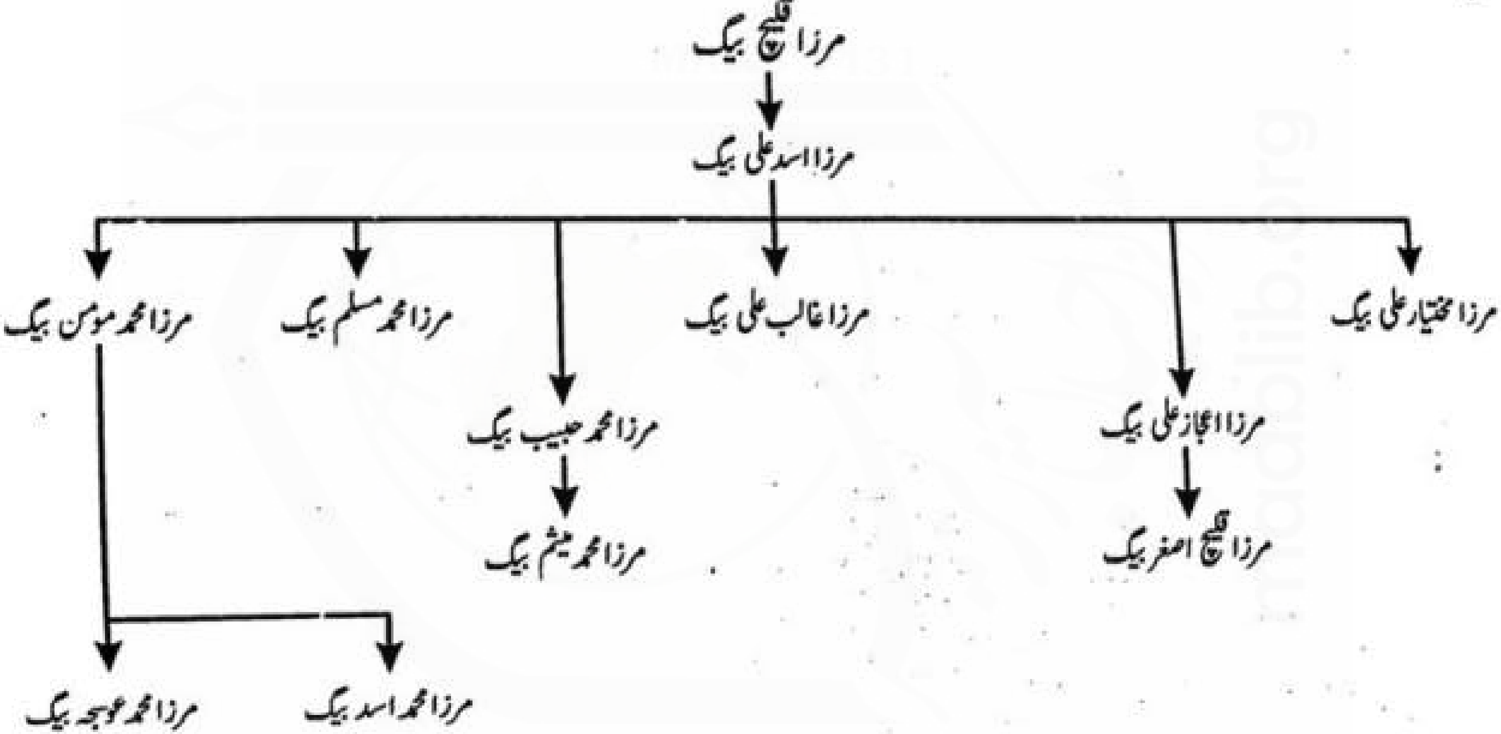

مرزا فریدون بیگ
ا۔ مرزا غلام رضا بیگ
مرزا منوچہر بیگ
مرزا قمر علی بیگ
مرزا ذاکر حسین بیگ
مرزا منوچہر بیگ
مرزا عاشق علی بیگ
مرزا سلیمان علی بیگ
مرزا ذوالفقار علی بیگ
مرزا خرم علی بیگ
مرزا شجاع علی بیگ
(عرف شجاعت)
مرزا ثاقب علی بیگ
مرزا سعادت علی بیگ
مرزا ذوالفقار علی بیگ
مرزا مظہر علی بیگ
مرزا محمد صفدر رضا بیگ
مرزا ضامن حسین بیگ
مرزا قمر علی بیگ
مرزا شوزب رضا بیگ

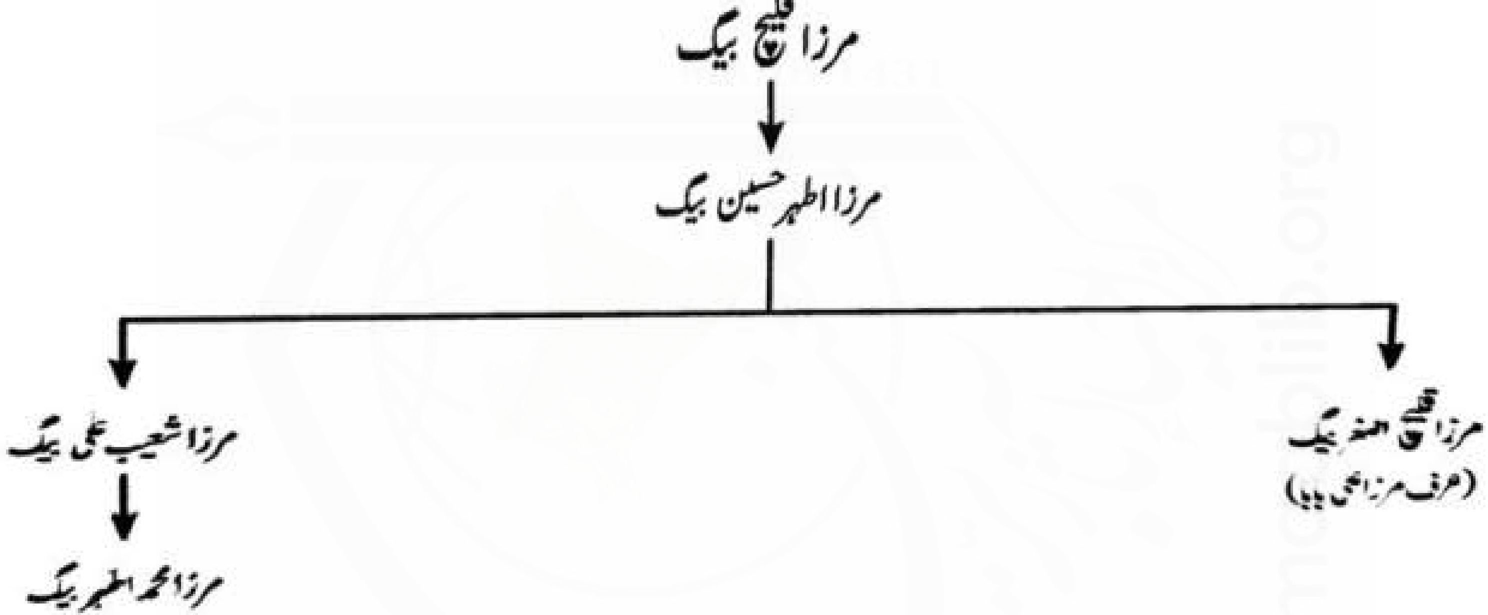

مرزا فریدون بیگ
۲ـ مرزا صادق علی بیگ
مرزا فرخ بیگ
مرزا فریدون بیگ
مرزا سکندر بیگ
مرزا شوکت علی بیگ
مرزا حیدر قلی بیگ
مرزا واجد علی بیگ
مرزا حیدر قلی بیگ
مرزا غضنفر علی بیگ
مرزا کاظم رضا بیگ
مرزا منظور علی بیگ
مرزا صادق علی بیگ
مرزا محمد دانیال علی بیگ
مرزا نجف قلی بیگ
مرزا منظور حسن بیگ
مرزا غلام مصطفیٰ بیگ
مرزا غلام مرتضیٰ بیگ

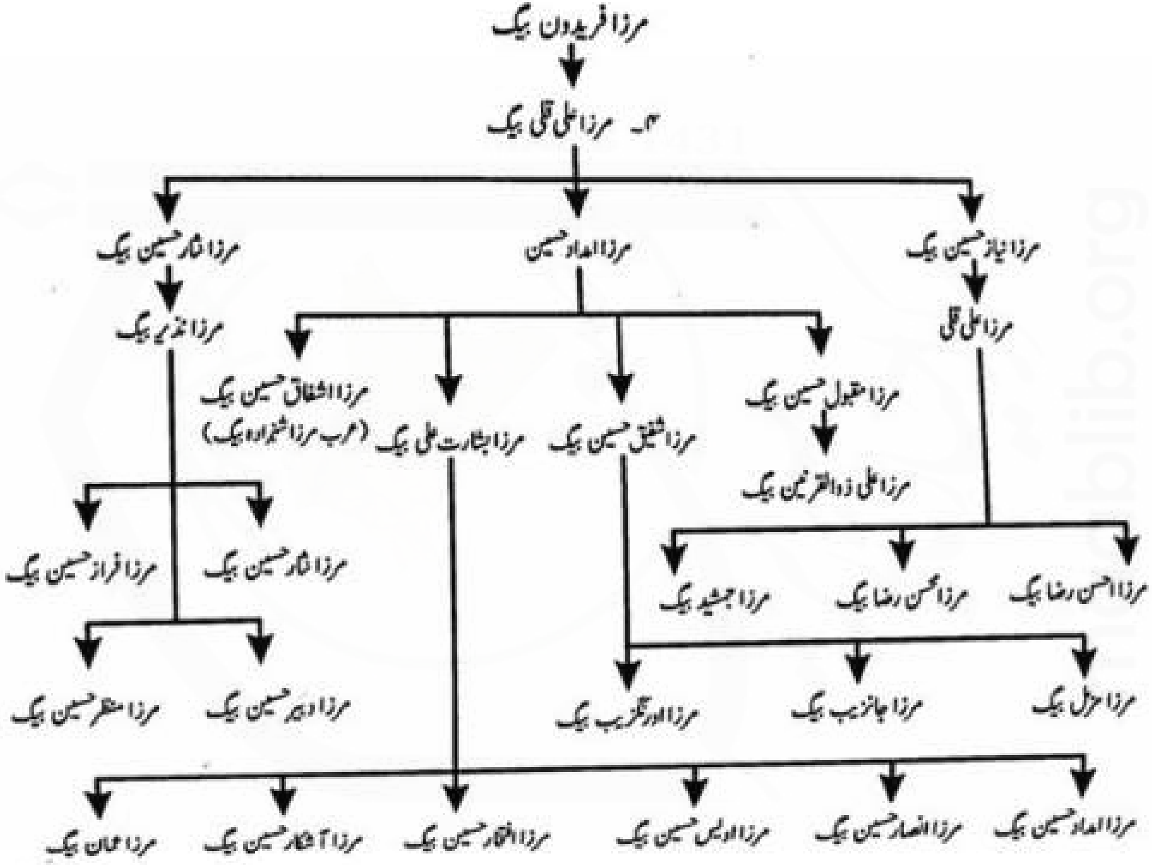

مرزا فریدون بیگ
۳۔ مرزا قلیچ بیگ
مرزا ہمایوں بیگ
مرزا قزلباش بیگ
مرزا محمد ہمایوں بیگ
مرزا فائق علی بیگ
مرزا حسن علی بیگ

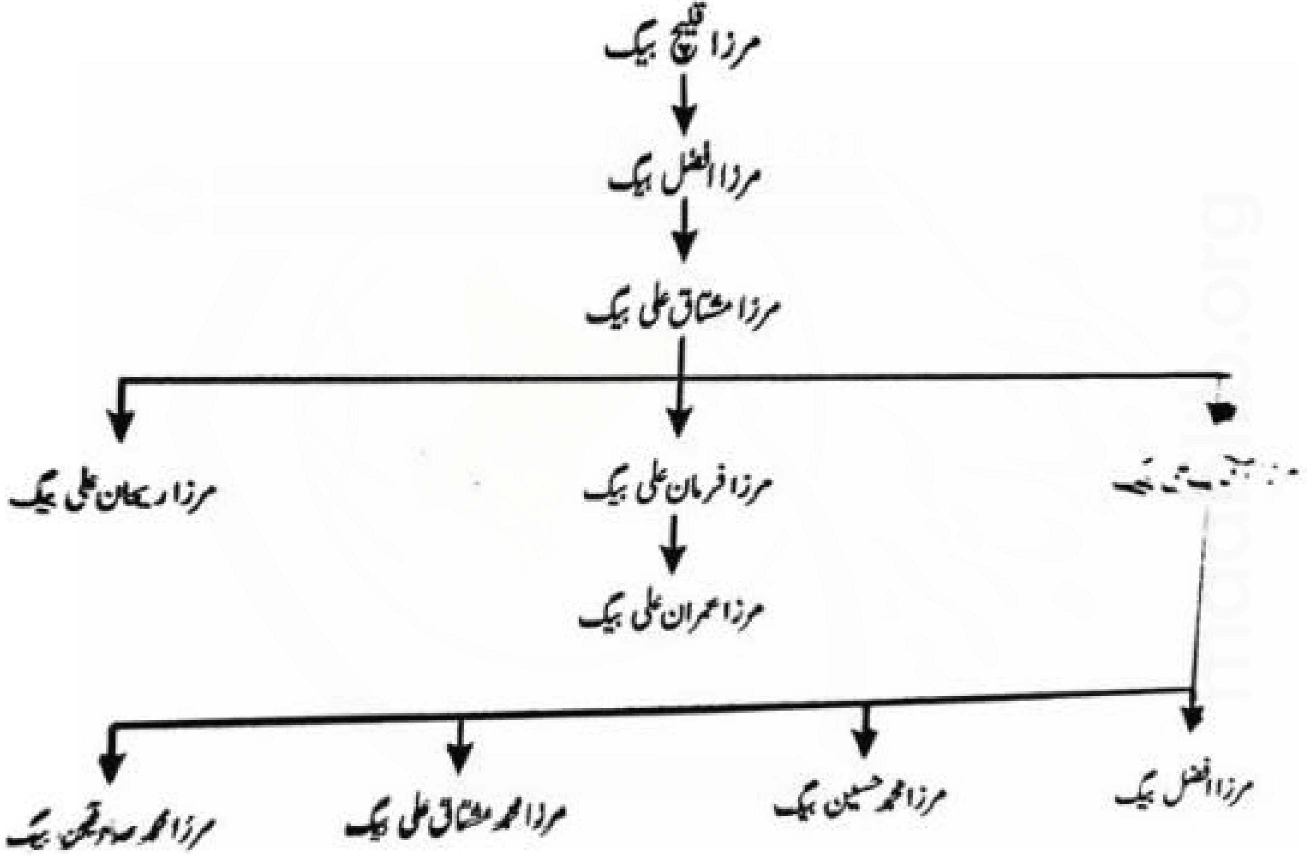


مرزا قلیچ بیگ
مرزا اختر بیگ
مرزا نادر بیگ
مرزا اقبال بیگ
مرزا نادر بیگ
مرزا اختر بیگ
مرزا فرہاد بیگ
مرزا کامل بیگ
مرزا زاہد علی بیگ
مرزا ذاکر بیگ
مرزا ضامن علی بیگ
مرزا ازہر علی بیگ
مرزا گارڈن
مرزا ہیری اکس
مرزا کیناٹ
مرزا براون جمیل

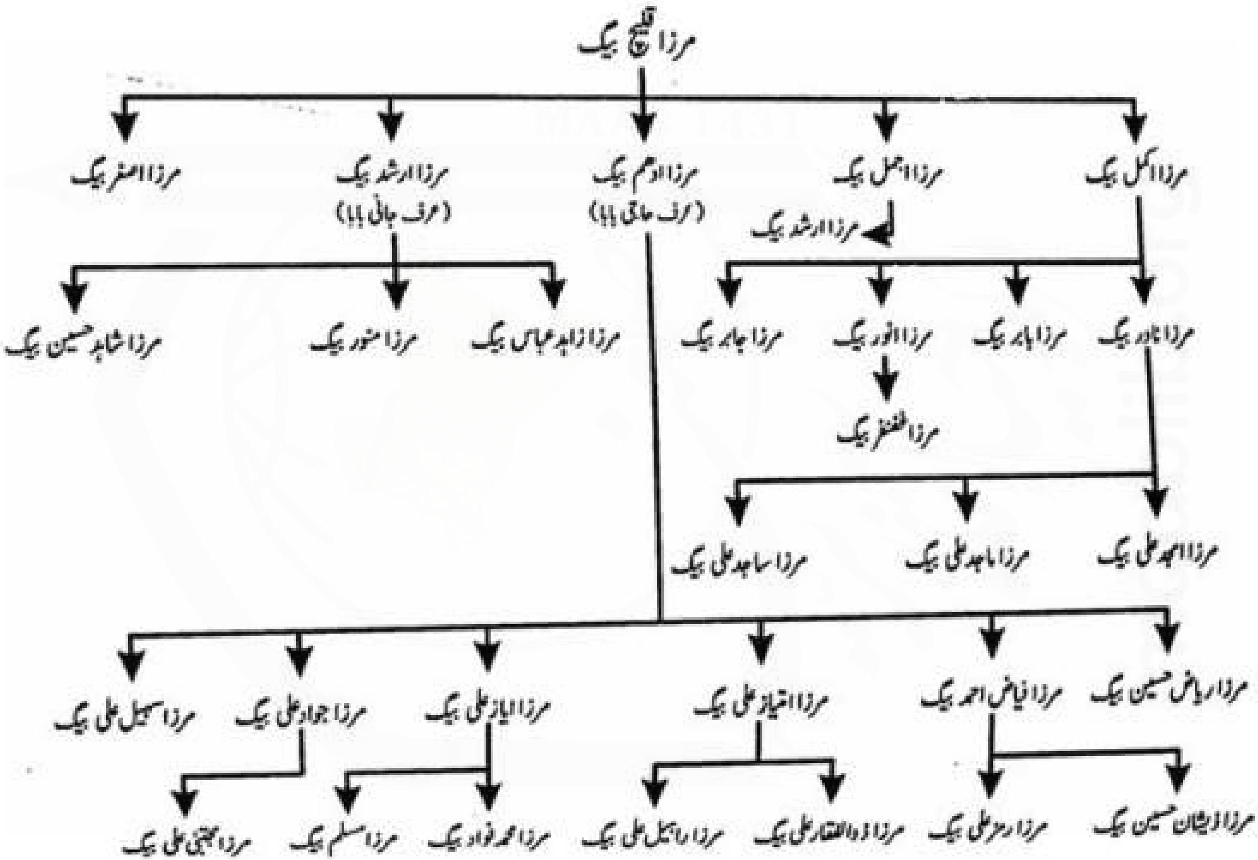

مرزا قلیچ بیگ
مرزا اسد علی بیگ
مرزا مختیار علی بیگ
مرزا اعجاز علی بیگ
مرزا قلیچ اصغر بیگ
مرزا غالب علی بیگ
مرزا محمد حبیب بیگ
مرزا محمد میثم بیگ
مرزا محمد مسلم بیگ
مرزا محمد مومن بیگ
مرزا محمد اسد بیگ
مرزا محمد عوبجہ بیگ

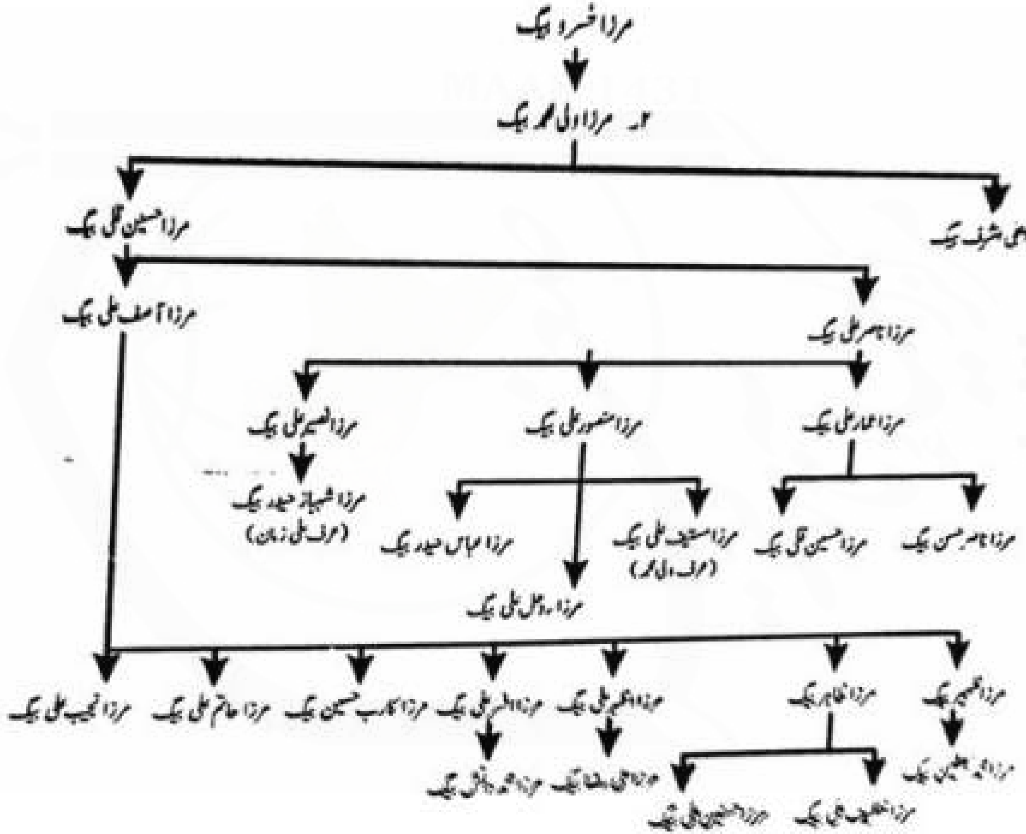

مرزا قلیچ بیگ
مرزا اطہر حسین بیگ
مرزا شعیب علی بیگ
مرزا محمد اطہر بیگ


مرزا فریدون بیگ
۳۔ مرزا علی قلی بیگ
مرزا نیاز حسین بیگ
مرزا امداد حسین
مرزا نثار حسین بیگ
مرزا علی قلی
مرزا نذیر بیگ
مرزا مقبول حسین بیگ
مرزا شفیق حسین بیگ
مرزا بشارت علی بیگ
مرزا اشفاق حسین بیگ (عرف مرزا شہزادہ بیگ)
مرزا علی ذوالقرنین بیگ
مرزا احسن رضا بیگ
مرزا محسن رضا بیگ
مرزا جمشید بیگ
مرزا نثار حسین بیگ
مرزا فراز حسین بیگ
مرزا جزل بیگ
مرزا جہانزیب بیگ
مرزا اورنگزیب بیگ
مرزا دبیر حسین بیگ
مرزا منظر حسین بیگ
مرزا امداد حسین بیگ
مرزا انصار حسین بیگ
مرزا اویس حسین بیگ
مرزا افتخار حسین بیگ
مرزا آشکار حسین بیگ
مرزا عثمان بیگ

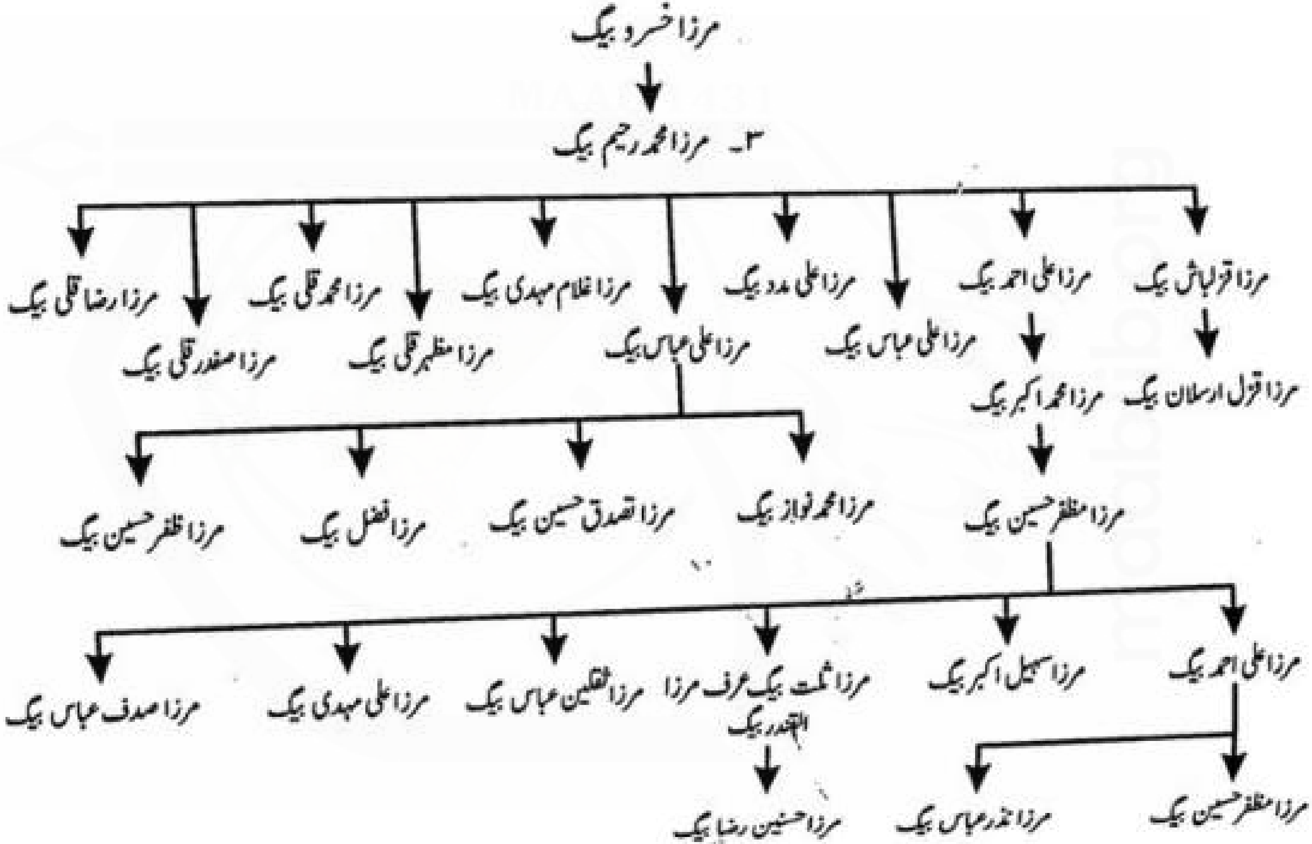


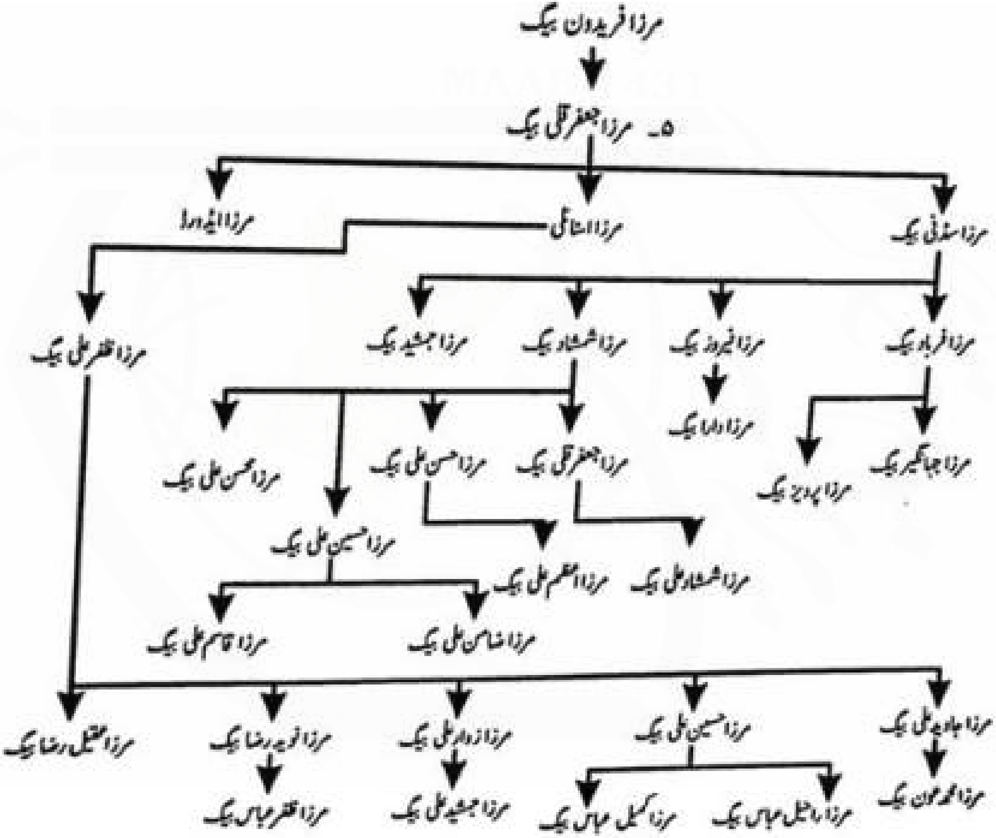
مرزا قلیچ بیگ
مرزا افضل بیگ
مرزا مشتاق علی بیگ
مرزا ریحان علی بیگ
مرزا فرمان علی بیگ
مرزا عمران علی بیگ
مرزا افضل بیگ
مرزا محمد حسین بیگ
مرزا محمد مشتاق علی بیگ

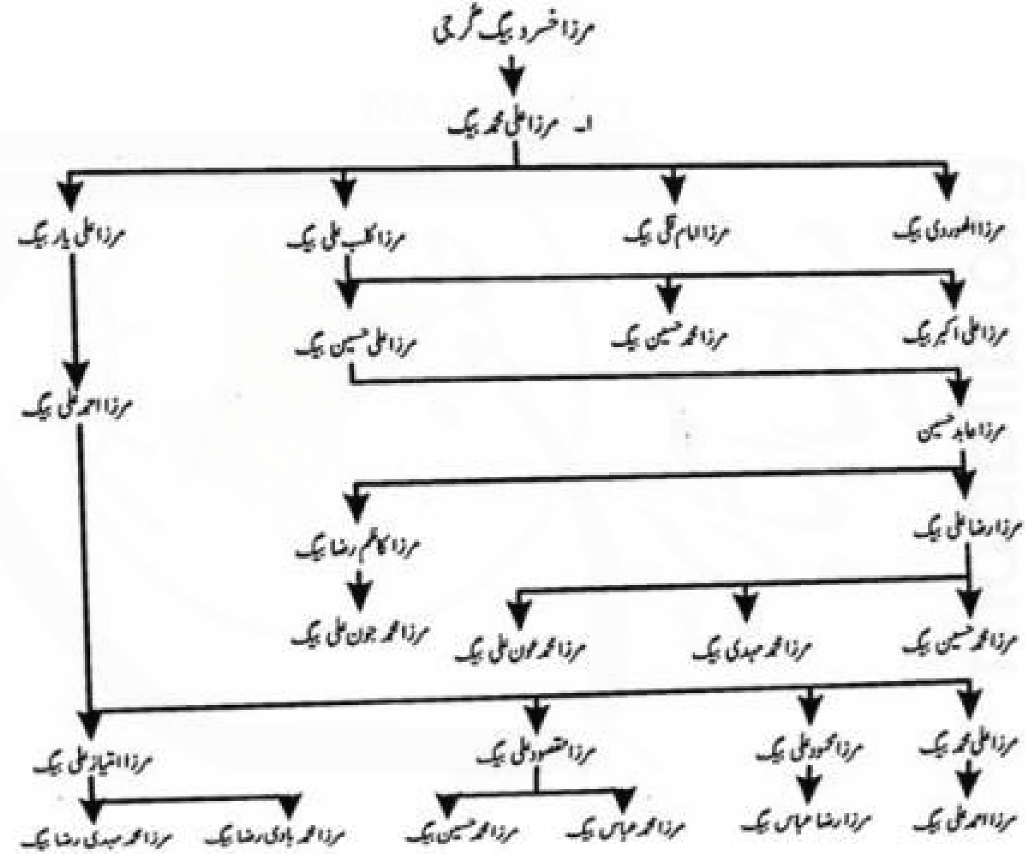

مرزا قلیچ بیگ
مرزا اکمل بیگ
مرزا اجمل بیگ
مرزا ادہم بیگ
(عرف حاجی بابا)
مرزا ارشد بیگ
(عرف جانی بابا)
مرزا اصغر بیگ
مرزا ارشد بیگ
مرزا انور بیگ
مرزا جابر بیگ
مرزا غضنفر بیگ
مرزا زاہد عباس بیگ
مرزا منور بیگ
مرزا شاہد حسین بیگ
مرزا امجد علی بیگ
مرزا ماجد علی بیگ
مرزا ساجد علی بیگ
مرزا ریاض حسین بیگ
مرزا فیاض احمد بیگ
مرزا امتیاز علی بیگ
مرزا ایاز علی بیگ
مرزا جواد علی بیگ
مرزا سہیل علی بیگ
مرزا ذیشان حسین بیگ
مرزا معز علی بیگ
مرزا ذوالفقار علی بیگ
مرزا راحیل علی بیگ
مرزا محمد فواد بیگ
مرزا اسلم بیگ
مرزا مجتبیٰ علی بیگ

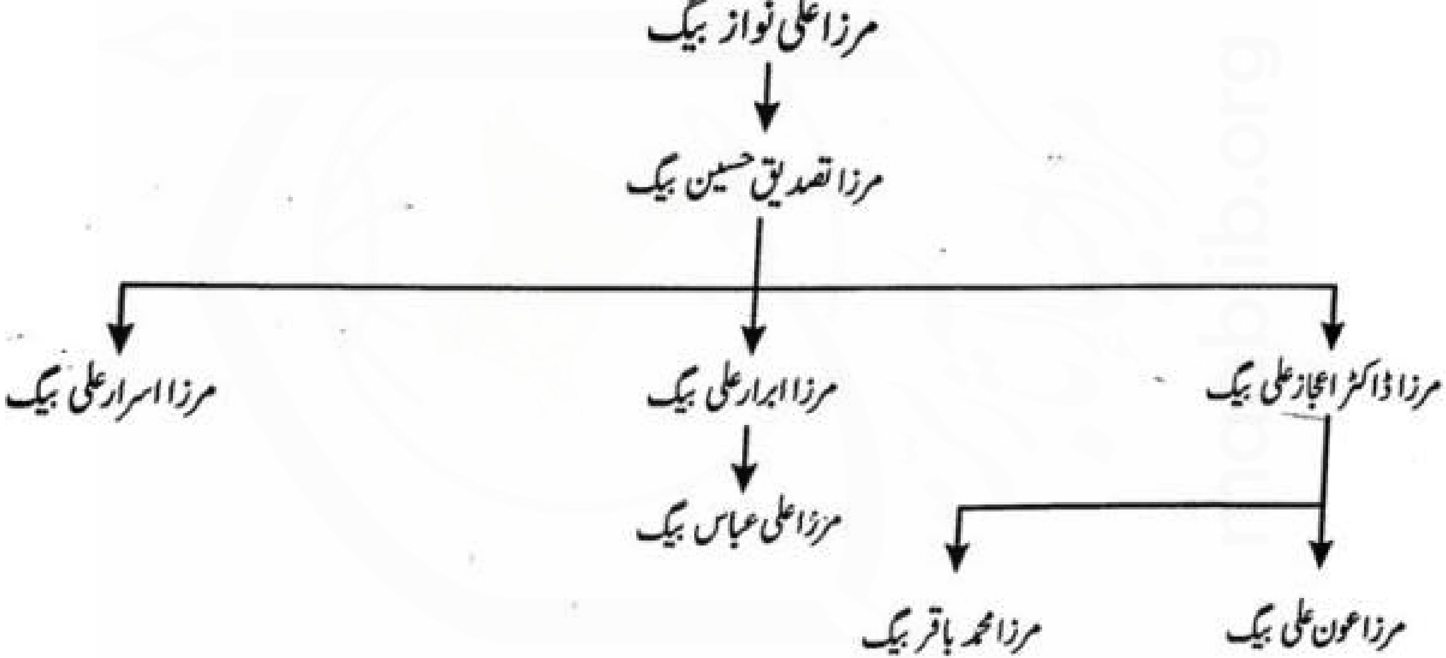


مرزا خسرو بیگ
مرزا ولی محمد بیگ
مرزا حسین قلی بیگ
مرزا آصف علی بیگ
مرزا ناصر علی بیگ
مرزا نصیر علی بیگ
مرزا منصور علی بیگ
مرزا عمار علی بیگ
مرزا عباس حیدر بیگ
مرزا حسین قلی بیگ
مرزا نجیب علی بیگ
مرزا حاتم علی بیگ

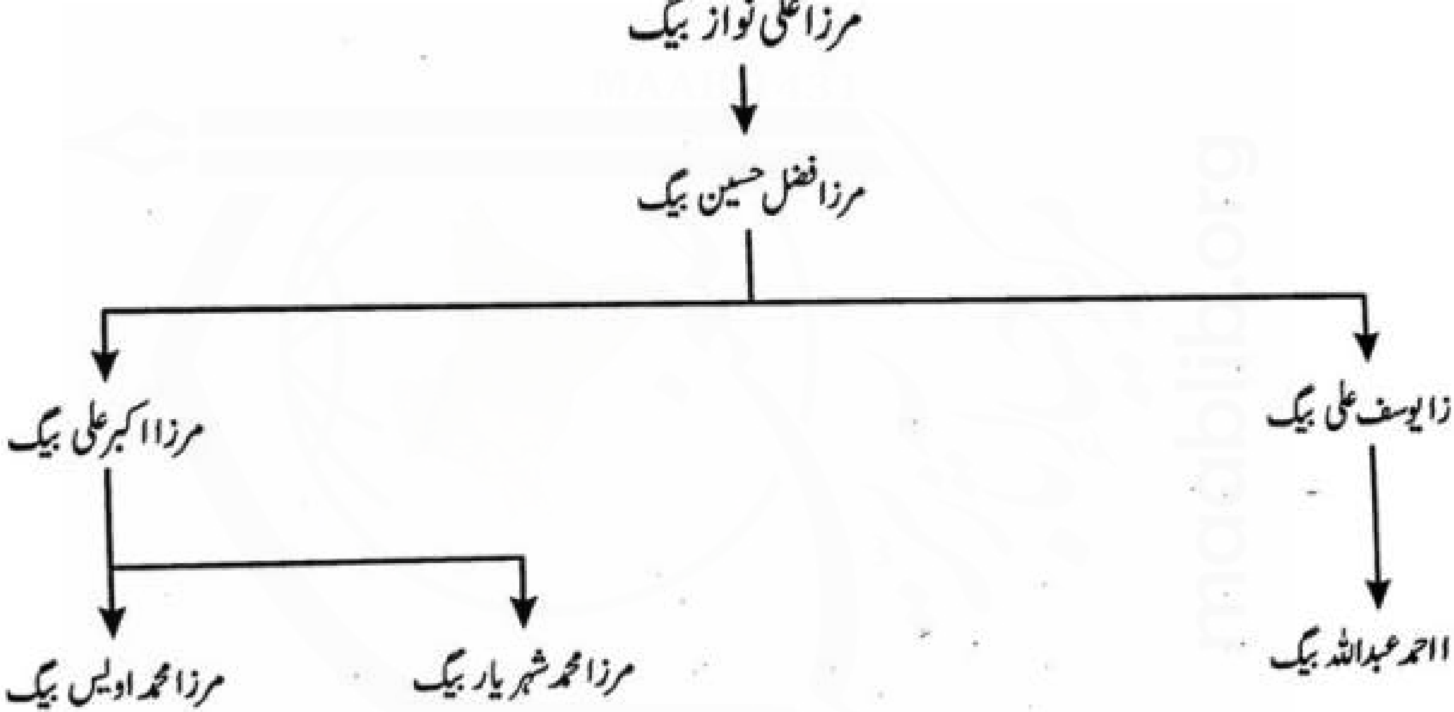

مرزا خسرو بیگ
۳۔ مرزا محمد رحیم بیگ
مرزا قزلباش بیگ
مرزا علی احمد بیگ
مرزا علی عباس بیگ
مرزا علی مدد بیگ
مرزا علی عباس بیگ
مرزا غلام مہدی بیگ
مرزا مظہر قلی بیگ
مرزا محمد قلی بیگ
مرزا صفدر قلی بیگ
مرزا رضا قلی بیگ
مرزا قزل ارسلان بیگ
مرزا محمد اکبر بیگ
مرزا مظفر حسین بیگ
مرزا محمد نواز بیگ
مرزا تصدق حسین بیگ
مرزا فضل بیگ
مرزا ظفر حسین بیگ
مرزا علی احمد بیگ
مرزا سہیل اکبر بیگ
مرزا ثمت بیگ عرف مرزا
مرزا ثقلین عباس بیگ
مرزا علی مہدی بیگ
مرزا صدف عباس بیگ
مرزا مظفر حسین بیگ
مرزا حسنین رضا بیگ


مرزا فریدون بیگ
۵۔ مرزا جعفر قلی بیگ
مرزا جمشید بیگ
مرزا شمشاد بیگ
مرزا فیروز بیگ
مرزا فرہاد بیگ
مرزا مظفر علی بیگ
مرزا دارا بیگ
مرزا جہانگیر بیگ
مرزا پرویز بیگ
مرزا محسن علی بیگ
مرزا احسن علی بیگ
مرزا جعفر قلی بیگ
مرزا حسین علی بیگ
مرزا اعظم علی بیگ
مرزا شمشاد علی بیگ
مرزا قاسم علی بیگ
مرزا عقیل رضا بیگ
مرزا نوید رضا بیگ
مرزا زوار علی بیگ
مرزا حسین علی بیگ
مرزا جاوید علی بیگ
مرزا مظفر عباس بیگ
مرزا جمشید علی بیگ
مرزا کمیل عباس بیگ
مرزا راحیل عباس بیگ
مرزا محمد عون بیگ

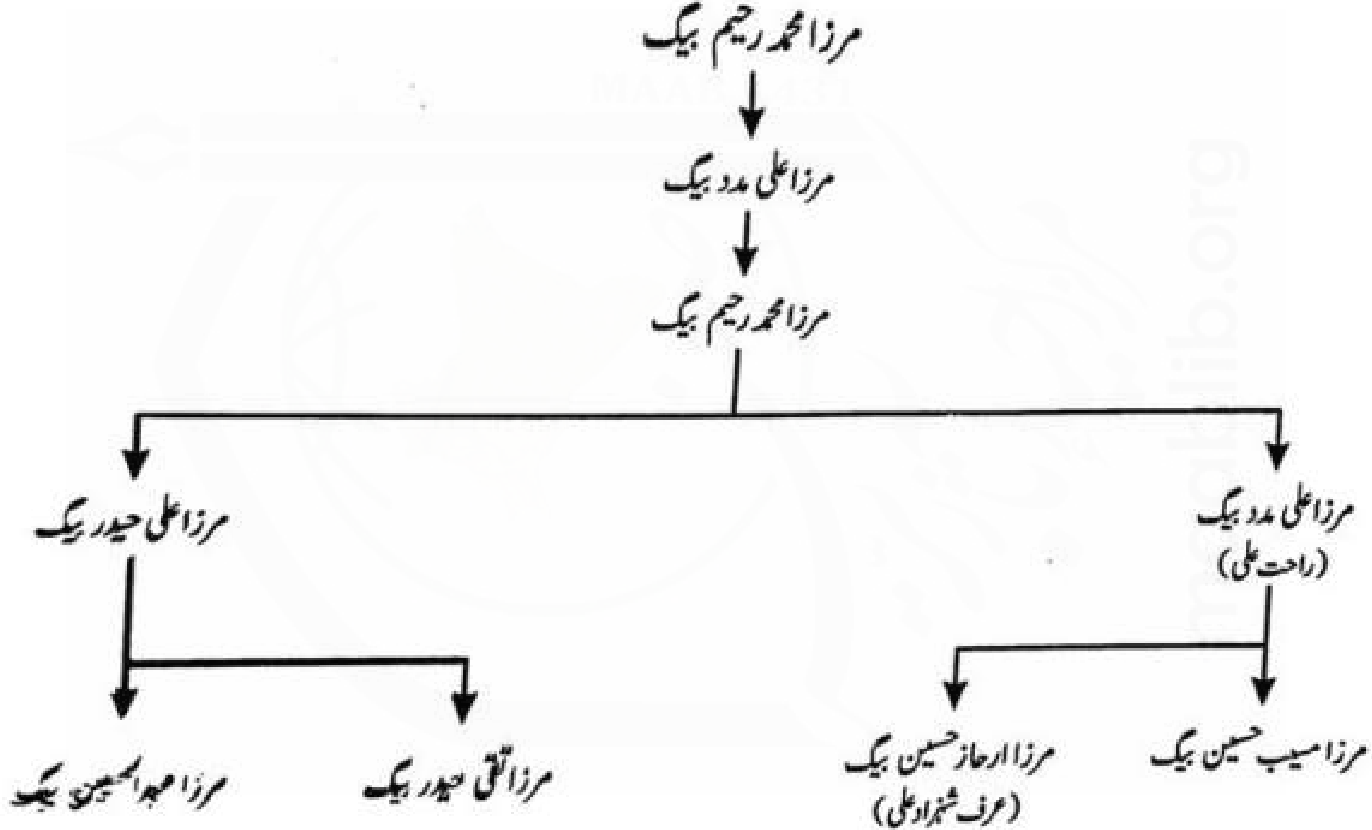

مرزا خسرو بیگ گرجی
ا۔ مرزا علی محمد بیگ
مرزا الہوردی بیگ
مرزا امام قلی بیگ
مرزا کلب علی بیگ
مرزا علی یار بیگ
مرزا علی اکبر بیگ
مرزا محمد حسین بیگ
مرزا علی حسین بیگ
مرزا احمد علی بیگ
مرزا عابد حسین
مرزا رضا علی بیگ
مرزا کاظم رضا بیگ
مرزا محمد حسین بیگ
مرزا محمد مہدی بیگ
مرزا محمد عون علی بیگ
مرزا محمد جون علی بیگ
مرزا علی محمد بیگ
مرزا محمود علی بیگ
مرزا مقصود علی بیگ
مرزا امتیاز علی بیگ
مرزا احمد علی بیگ
مرزا رضا عباس بیگ
مرزا محمد عباس بیگ
مرزا محمد حسین بیگ
مرزا محمد ہادی رضا بیگ
مرزا محمد مہدی رضا بیگ

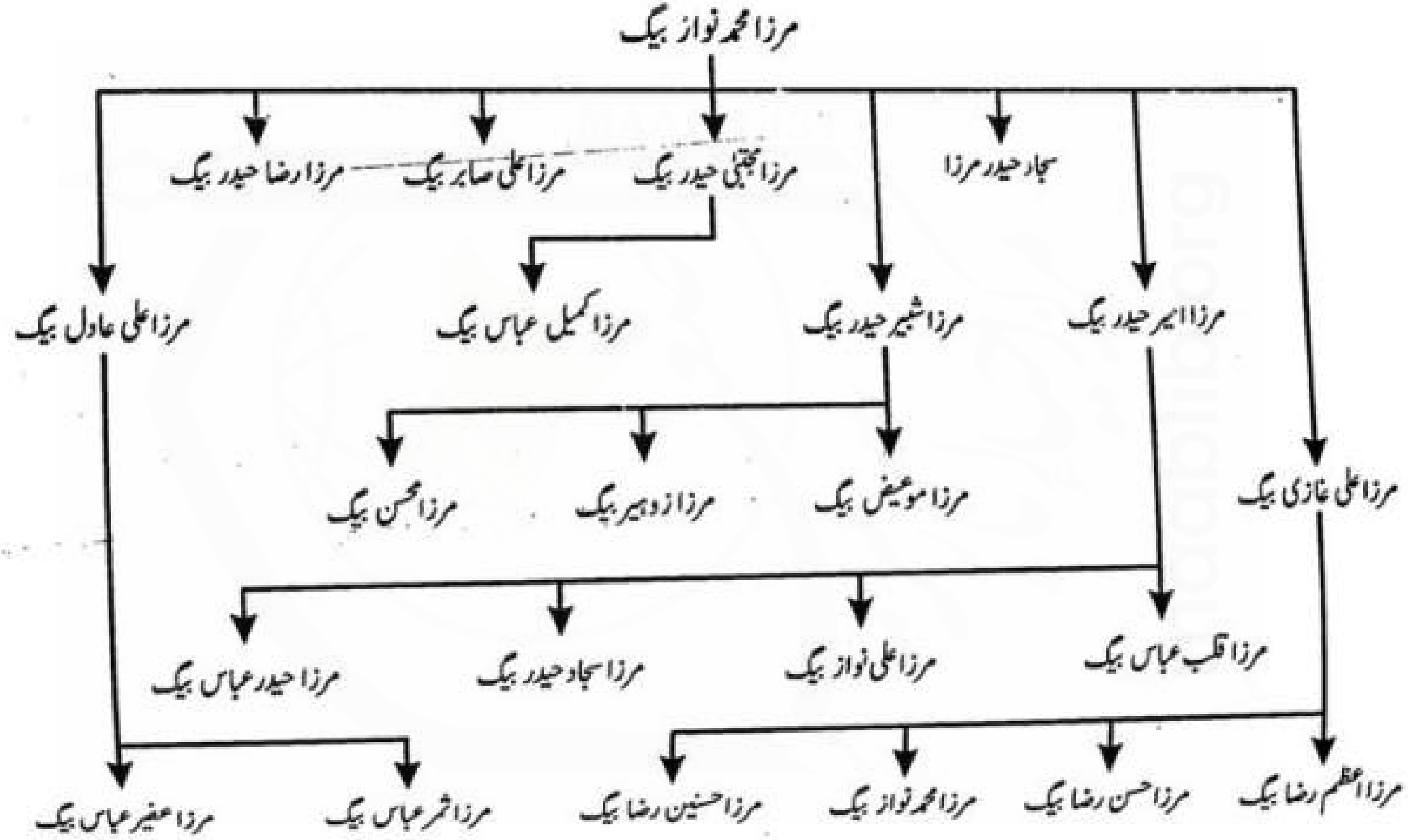


مرزا علی نواز بیگ
مرزا تصدیق حسین بیگ
مرزا ڈاکٹر اعجاز علی بیگ
مرزا ابرار علی بیگ
مرزا اسرار علی بیگ
مرزا علی عباس بیگ
مرزا عون علی بیگ
مرزا محمد باقر بیگ

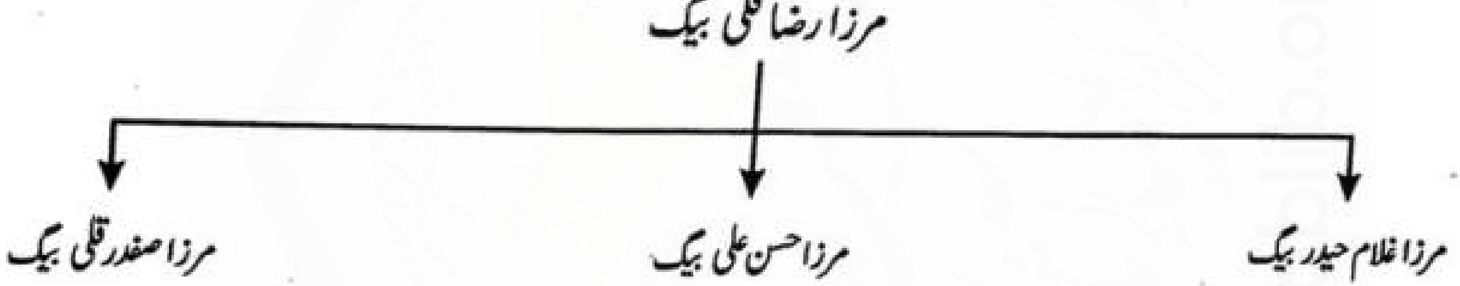


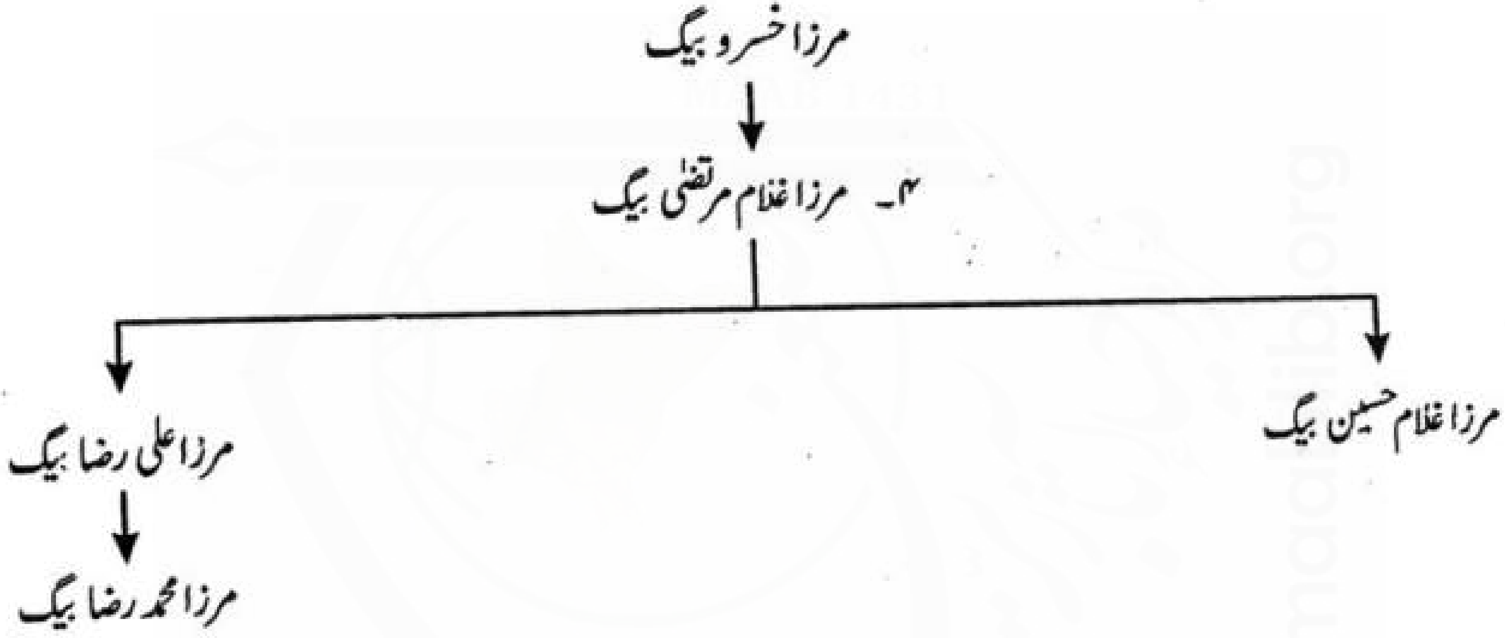
مرزا علی نواز بیگ
مرزا فضل حسین بیگ
زا یوسف علی بیگ
مرزا اکبر علی بیگ
احمد عبداللہ بیگ
مرزا محمد شہریار بیگ
مرزا محمد اویس بیگ


مرزا محمد رحیم بیگ
مرزا علی مدد بیگ
مرزا محمد رحیم بیگ
مرزا علی مدد بیگ
(راحت علی)
مرزا علی حیدر بیگ
مرزا سیب حسین بیگ
مرزا اعجاز حسین بیگ
(عرف شہزاد علی)
مرزا تقی حیدر بیگ
مرزا عبدالحسین بیگ

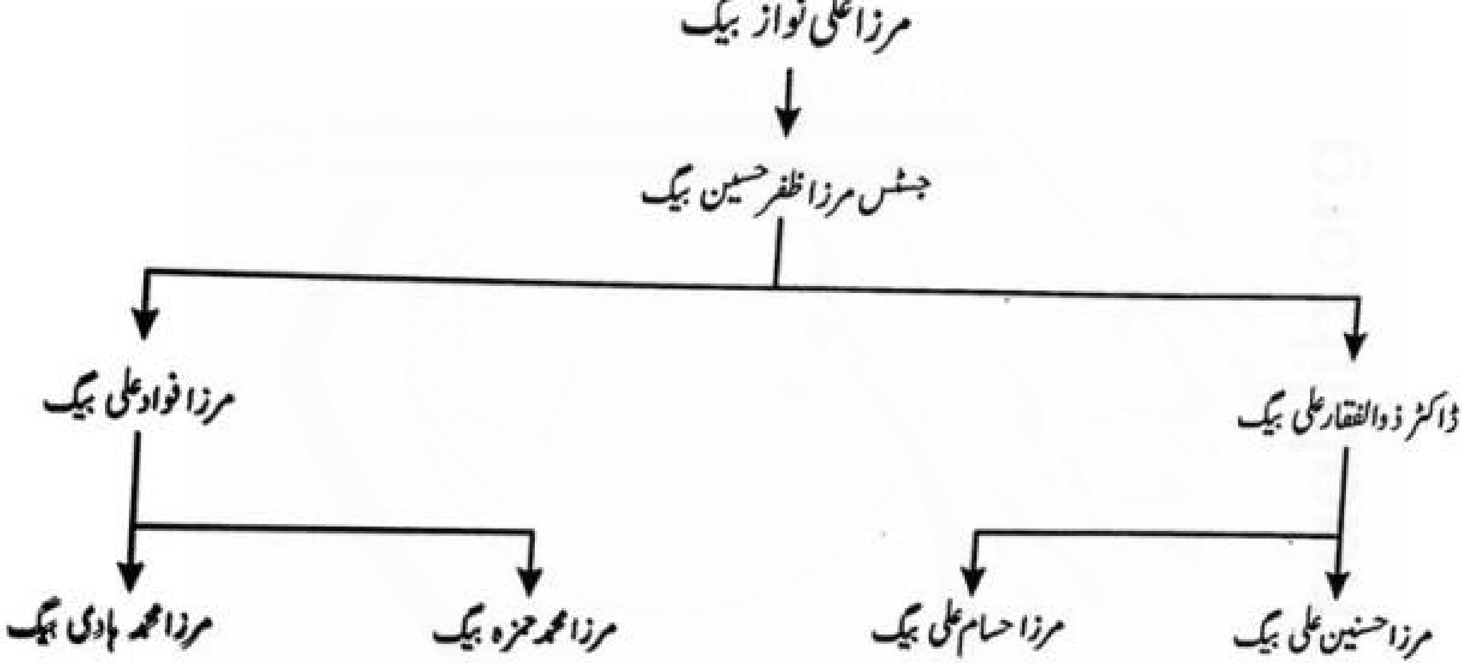


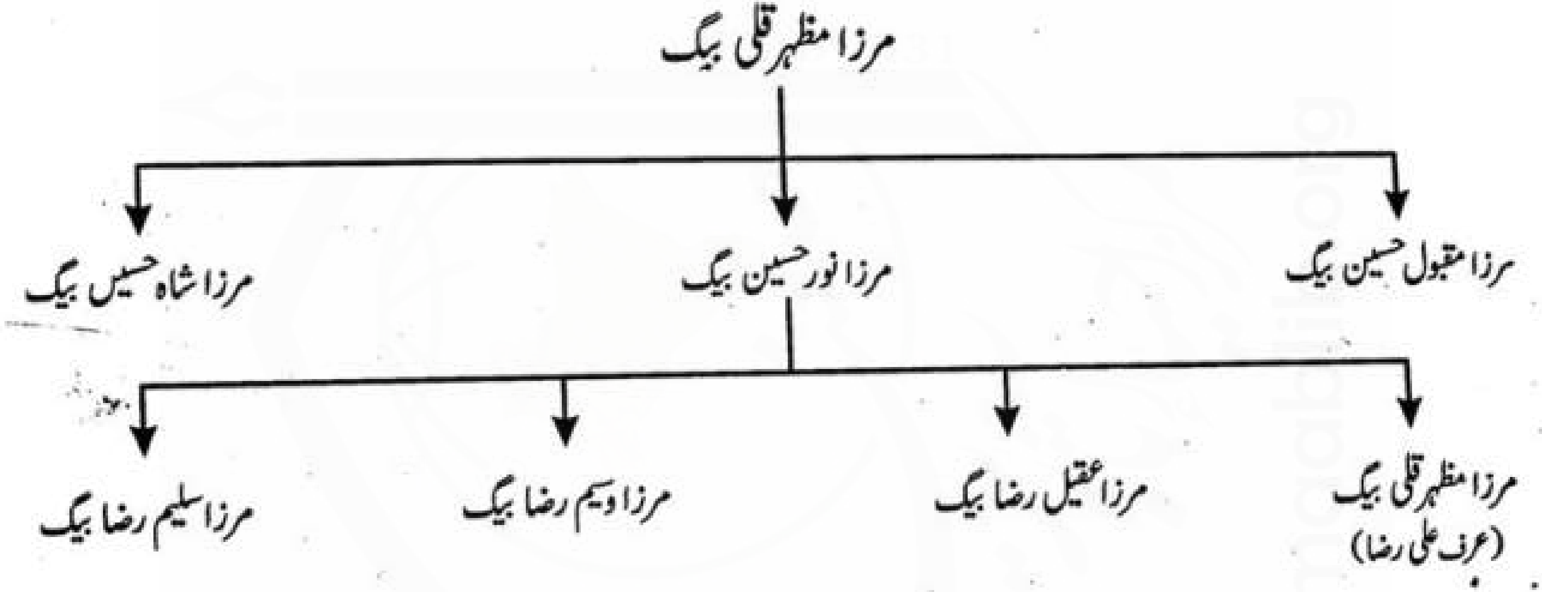
مرزا محمد نواز بیگ
مرزا رضا حیدر بیگ
مرزا علی صابر بیگ
مرزا مجتبیٰ حیدر بیگ
سجاد حیدر مرزا
مرزا علی عادل بیگ
مرزا کمیل عباس بیگ
مرزا شبیر حیدر بیگ
مرزا امیر حیدر بیگ
مرزا محسن بیگ
مرزا زوہیر بیگ
مرزا موعیض بیگ
مرزا علی غازی بیگ
مرزا حیدر عباس بیگ
مرزا سجاد حیدر بیگ
مرزا علی نواز بیگ
مرزا قلب عباس بیگ
مرزا عقیر عباس بیگ
مرزا اشعر عباس بیگ
مرزا حسنین رضا بیگ
مرزا محمد نواز بیگ
مرزا حسن رضا بیگ
مرزا اعظم رضا بیگ


مرزا رضا قلی بیگ
مرزا غلام حیدر بیگ
مرزا حسن علی بیگ
مرزا صفدر قلی بیگ



مرتب: نصیر مرزا


مرزا علی نواز بیگ
جسٹس مرزا ظفر حسین بیگ
ڈاکٹر ذوالفقار علی بیگ
مرزا فواد علی بیگ
مرزا حسنین علی بیگ
مرزا حسام علی بیگ
مرزا محمد حمزہ بیگ
مرزا محمد ہادی بیگ



مرزا مظہر قلی بیگ
مرزا مقبول حسین بیگ
مرزا نور حسین بیگ
مرزا شاہ حسین بیگ
مرزا مظہر قلی بیگ
(عرف علی رضا)
مرزا عقیل رضا بیگ
مرزا وسیم رضا بیگ
مرزا سلیم رضا بیگ

مرزا قلیچ بیگ، سندھی ادب میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، جنھوں نے سندھی ادب میں افسانوی ادب، مضمون نگاری، لسانیات اور تنقید و تحقیق اور ڈرامہ کی بنیاد رکھی۔ آپ بیتی کے سلسلے میں بھی ان کا شمار بانی کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے اپنی آپ بیتی میں نہ صرف اپنی زندگی کے واقعات کو بیان کیا ہے، بلکہ انھوں نے سماج کے اہم زاویوں کی عکاسی بھی کی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب سوانح حیات کے ساتھ ساتھ اس وقت کی سماجی تاریخ بھی ہے۔ مرزا صاحب کی سوانح حیات میں موجود واقعات بڑے دلچسپ، حیرت انگیز اور سبق آموز ہیں۔

ترجمہ نگاری ایسا فن ہے جس کی وساطت سے ایک زبان کے علمی و ادبی سرمائے کو دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے۔ اگرچہ کسی خیال، تصور، جذبے یا احساس کو جوں کا توں یعنی اسی اثر انگیزی کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل کرنا دشوار ہی نہیں ناممکن بھی ہے، تاہم اگر ترجمہ نگار کو ہر دو زبان پر عبور و دسترس حاصل ہو اور متعلقہ موضوع سے ذہنی و قلبی مناسبت بھی ہو تو ترجمے میں طبع زاد کا سا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ ترجمہ نگاری نے ہر زبان و ادب کے دامن کو کشادگی اور ثروت مندی عطا کی ہے۔

محترمہ شہناز شورو صاحبہ افسانہ نگاری کے حوالے سے اردو ادبی حلقوں میں معروف ہیں۔ ان کے نثر میں بے ساختگی اور انتخابِ الفاظ میں جدت نمایاں ہے۔ ترجمہ نگاری کے میدان میں اگرچہ یہ ان کا اولین قدم ہے مگر انھوں نے تخلیقی نثر کے تجربے کو کام میں لا کر اس پہلی کاوش ہی کو یادگار بنا دیا ہے۔ یقیناً ایک صاحبِ طرز افسانہ نگار کے ساتھ ساتھ آئندہ انھیں ایک صاحبِ طرز ترجمہ نگار کے طور پر بھی یاد رکھا جائے گا۔

اس مرحلے پر ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا ذکر بھی لازم ہے کہ جنھوں نے دقتِ نظر سے مسودے کی نوک پلک سنوارنے کا کام انجام دیا۔ موصوف کا شمار اردو کے ان ترقی پسند نقادوں میں ہوتا ہے جن کے نام اور کام کا اعتراف اور احترام ہر حلقۂ ادب میں کیا جاتا ہے۔ ان کی نظرِ ثانی سے اس ترجمے کی اہمیت و افادیت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو